چوگانِ ہستی

ایک ناول

(دوسرا حصہ)

منشی پریم چند

پہلی بار ـــــ ۵۰۰ پانچسو

قیمت ساڑھے پانچ روپیہ 5/8/-

پبلشرز ـ ادبی مرکز دہلی

سول ایجنٹ ـ مکتبہ رنگین ۱۰۹۷ گنج میر خان
عقب دتی لائٹ دہلی

([illegible] پریس دہلی)

(دوسرا حصہ)

ایک ناول

پریم چند

پبلشرز :- ادبی مرکز دھلی

۵

(۲۶)

اراولی کی سرسبز جھومتی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں جسونت نگر اس طرح منہ چھپائے ہوئے ہے جیسے بچہ ماں کی گود میں۔ ماں کی چھاتی سے دودھ کی دھاریں جوشِ محبت سے بغیر ارادہ اُبلتی میٹھے سُروں میں گاتی نکلتی ہیں اور بچہ کے ننھے سے منہ میں نہ سماکر نیچے بہہ جاتی ہیں۔ صبح کی سُنہری شعاعوں میں نہا کر ماں کا چہرہ نکھر گیا ہے۔ اور بچہ کبھی آنچل سے منہ نکال نکال کر ماں کے ممتا بھرے چہرہ کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ مگر ماں بار بار اُسے آنچل سے ڈھک لیتی ہے کہ کہیں اُسے نظر نہ لگ جائے۔

دفعتاً توپ کے دغنے کی کرخت آواز سنائی دی۔ ماں کا دِل دہل گیا۔ بچہ گود سے چمٹ گیا۔ پھر وہی مہیب آواز۔ ماں کانپ اُٹھی۔ بچہ سمٹ گیا۔

پھر تو لگاتار توپیں چھوٹنے لگیں۔ ماں کے چہرہ پر خوف کے بادل چھا

گئے۔ آج ریاست کے نئے پولیٹیکل ایجنٹ یہاں آرہے ہیں۔ انہیں کے خیر مقدم میں سلامیاں اتاری جارہی ہیں۔

مسٹر کلارک اور صوفیا کو یہاں آئے ایک مہینہ گذر گیا۔ جاگیرداروں کی ملاقاتوں دعوتوں نذرانوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ آپس میں کچھ بات چیت ہو۔ صوفیا بار بار ونے سنگھ کا تذکرہ کرنا چاہتی۔ مگر نہ تو ایسے موقعے ہی ملتا اور نہ یہی سوجھتا کہ کس طرح تذکرہ کروں۔ آخر جب پورا مہینہ ختم ہو گیا تو ایک روز مس نے کلارک سے کہا۔ "ان خاطرداریوں کا سلسلہ تو جاری ہی رہے گا۔ اور برسات گذری جارہی ہے۔ اب یہاں جی نہیں لگتا۔ اب پہاڑی علاقوں کی سیر کرنی چاہیے۔ پہاڑیوں میں خوب بہار ہو گی۔" مسٹر کلارک بھی راضی ہو گئے۔ ایک ہفتہ سے دونوں ریاست کی سیر کر رہے ہیں۔ ریاست کے دیوان سردار نیلکنٹھ راؤ بھی ہمراہ ہیں۔ جہاں یہ لوگ پہنچتے ہیں۔ بڑی دھوم دھام سے ان کا خیر مقدم ہوتا ہے۔ سلامیاں دی جاتی ہیں۔ ایڈریس ملتے ہیں۔ خاص خاص مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ مدرسوں۔ شفاخانوں اور دیگر سرکاری عمارتوں کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ صوفیہ کو جیل خانوں کے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ قیدیوں کو اُن کے کھانے کے مقامات کو نیز قید خانہ کے قواعد کو نہایت توجہ سے دیکھتی ہے۔ اور قید خانوں کی حالت میں اصلاح کرنے پر ملازموں سے خاص زور دیتی ہے۔ آج تک بدنصیب قیدیوں کی طرف کسی ایجنٹ نے بھی کبھی توجہ نہ کی تھی۔ اُن کی حالت قابلِ افسوس تھی۔ انسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا کہ اُس کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر صوفیا کی متواتر مساعی سے ان کی حالت سُدھرنے لگی ہے۔ آج جسونت نگر کو مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کا موقع نصیب ہُوا ہے۔ اور سارا شہر ان کی خاطرداریوں میں مصروف ہے۔ ریاست کے ملازمین پگڑیاں باندھے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ کسی کے ہوش و حواس بجا نہیں

ہیں۔ جیسے خواب میں کسی نے بھیڑیا دیکھا ہو۔ عمال نے بازاروں کو آراستہ کرایا ہے۔ جیل کے قیدیوں اور شہر کے چوکیداروں نے قلیوں اور مزدوروں کا کام کیا ہے۔ وہاں کا کوئی بھی آدمی بلا اجازت سڑکوں پر نہیں جانے پاتا۔ شہر کا کوئی شخص اس خیر مقدم میں شریک نہیں ہوا۔ اور ریاست نے عوام کی اس بے اعتنائی کا اسی صورت میں جواب دیا ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف مسلح سپاہیوں کی قطاریں استادہ ہیں۔ کہ رعایا کی دلی بے چینی کا کوئی نشان نظر نہ آئے۔ عام جلسوں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ جلوس نکلا۔ پیدل اور سوار آگے آگے تھے۔ فوجی باجے بج رہے تھے۔ سڑکوں پر روشنی ہو رہی تھی۔ مگر مکانوں میں چھتوں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ مگر چھتوں سے نہیں بلکہ سپاہیوں کے ہاتھوں سے۔ صوفیا سب کچھ سمجھتی تھی مگر کلارک کی آنکھوں پر پردہ سا پڑا ہوا تھا۔ اقتدار کی بیحد افزونی نے ان کی عقل خبط کر دی ہے۔ سرکاری عمال سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن عقیدت عامہ پر اُن کا قابو نہیں ہوتا۔ شہر میں کہیں جوشِ مسرت کا پتہ نہیں ہے۔ مُردنی سی چھائی ہوئی ہے۔ نہ ہر قدم پر جے کے نعرے سُنائی دیتے ہیں۔ نہ کوئی دیوی آرتی اُتارنے کو آتی ہے اور نہ کہیں گانا بجانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کے سوگ میں مبتلا ماں کے سامنے جشن منایا جا رہا ہے۔

شہر کا گشت کر کے صوفیا۔ مسٹر کلارک۔ سردار نیلکنٹھ اور دو ایک اعلےٰ ملازمین سرکاری تو شاہی محل میں آکر رونق افروز ہوئے۔ بقیہ لوگ رخصت ہو گئے۔ میز پر چاء لائی گئی۔ مسٹر کلارک نے بوتل سے پیالہ میں شراب ڈالی تو سردار صاحب جنہیں شراب کی بُو سے نفرت تھی۔ کھسک کر صوفیا کے پاس جا بیٹھے اور بولے

جسونت نگر آپ کو کیسا پسند آیا؟

صوفیا۔ نہایت پُر فضا مقام ہے۔ پہاڑیوں کا منظر بہایت دلفریب ہے۔ شاید کشمیر کے سوا ایسا قدرتی نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ شہر کی صفائی

سے جی خوش ہو گیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں یہیں رہوں۔

نیلکنٹھ ڈر گئے۔ ایک دو روز تک تو پولیس اور فوج کی طاقت سے شہر کو پُرامن رکھا جا سکتا ہے۔ مگر ہفتے دو ہفتے تک کسی طرح بھی نہیں۔ بالکل ناممکن ہے۔ کہیں یہ لوگ یہاں ٹھہر گئے تو شہر کی واقعی حالت ضرور ہی روشن ہو جائے گی۔ نہ جانے اس کا کیا انجام ہو۔ بولے "یہاں کی ظاہری دلفریبی کے دھوکے میں نہ آئیے۔ آب و ہوا بہت خراب ہے۔ آگے جا کر آپ کو اس سے زیادہ بہتر مقامات دیکھنے کو ملیں گے"۔

صوفیا۔ کچھ ہی ہو۔ میں یہاں دو ہفتے ضرور ہی رہوں گی۔ کیوں ولیم۔ تمہیں یہاں سے جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

کلارک۔ تم یہاں رہو تو میں دفن ہو جانے کو تیار ہوں۔

صوفیا۔ سنیئے سردار صاحب۔ ولیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

صوفیا کو سردار صاحب کے دق کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔

نیلکنٹھ۔ پھر بھی میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جسونت نگر بہت اچھی جگہ نہیں ہے۔ آب و ہوا کی خرابی کے علاوہ یہاں کی رعایا میں بدامنی کی علامات پیدا ہو گئی ہیں۔

صوفیا۔ جب تو ہمارا یہاں ٹھہرنا اور بھی ضروری ہے۔ میں نے کسی ریاست میں یہ شکایت نہیں سُنی۔ گورنمنٹ نے ریاستوں کو اندرونی انتظامات میں خود مختار بنا رکھا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ریاستوں میں بغاوت کے جراثیم کو نشو و نما پانے کا موقع دیا جاوے۔ اس کی ذمہ داری ریاست کے حکام پر ہے۔ اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ وہ اس غفلت کے لیئے اُن سے اطمینان بخش جواب طلب کرے۔

سردار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صوفیا سے انہوں نے یہ بات بے تکلف ہو کر کہہ دی تھی۔ اس کی منکسر المزاجی سے انہوں نے سمجھ لیا تھا۔

کہ میری تندو تیز نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ کچھ بے تکلف سے ہو گئے تھے۔ یہ ڈانٹ پڑی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ التجا کے لہجہ میں بولے: ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگرچہ ریاست پر موجودہ حالات کی ذمہ داری ہے تاہم ہم لوگوں نے حتے الامکان حالات کو درست رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ بدامنی کا بیج اس مقام سے آیا جہاں سے اس کے آنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ زہر کے قطرے سنہری برتنوں میں لائے گئے۔ بنارس کے رئیس کنور بھرت سنگھ کے والنٹیروں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ڈاکوؤں سے دولت کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ مگر سادھوؤں سے نہیں۔ رضاکاروں نے خدمت کی آڑ میں یہاں کی بیوقوف رعایا پر ایسا منتر پھونکا کہ اس کے اتارنے میں ریاست کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خصوصاً کنور صاحب کا لڑکا تو نہایت شریر طبیعت کا آدمی ہے۔ اس نے اس علاقہ میں اپنے باغیانہ خیالات کی یہاں تک اشاعت کی کہ اسے باغیوں کا اکھاڑا بنا دیا۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا جادو ہوتا تھا۔ کہ رعایا پیاسوں کی طرح اس کی طرف دوڑتی تھی۔ اس کا فقیرانہ بھیس، اس کی سادہ بے لوث زندگی، اس کی سچی ہمدردی و خاکساری اور سب سے زیادہ اس کے محسنِ مردانہ کی کشش نے سب چھوٹے بڑوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ ریاست کو بڑی فکر ہوئی۔ ہم لوگوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ہر لمحہ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں صدر سے فوجی کمک روانہ کرنی پڑی۔ وسنت سنگھ تو کسی طرح گرفتار ہو گیا مگر اس کے دیگر رفقاء ابھی تک علاقہ میں چھپے ہوئے رعایا کو اکسا رہے ہیں۔ کئی بار یہاں سرکاری خزانہ لٹ چکا ہے۔ کئی بار وسنت کو جیل سے نکال لے جانے کی ناکام کوشش کی جا چکی ہے۔ اور ملازمین کو ہمیشہ اپنی جانوں کا خوف بنا رہتا ہے۔ مجھے مجبور ہو کر آپ سے یہ حال بیان کرنا پڑا۔ میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہرگز

نہ ملیں گی۔ اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ہم لوگوں نے جو کچھ کیا۔ اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے"۔

صوفیا نے بہت زیادہ متفکرانہ انداز سے کہا۔ "واقعی حالت اُس سے زیادہ تشویشناک ہے جتنا میں سمجھتی تھی۔ ایسی حالت میں ولیم کا یہاں سے چلا جانا فرض کے خلاف ہوگا۔ وہ یہاں گورنمنٹ کے قائمقام ہو کر آئے ہیں۔ صرف سیر و تفریح کے لئے نہیں۔ کیوں ولیم! تمہیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ یہاں کے حالات کی رپورٹ بھی تو بھیجنی پڑے گی۔"

مسٹر کلارک نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہاری مرضی ہو تو جہنم میں بھی بہشت کی خوشی حاصل کر سکتا ہوں۔ رہا رپورٹ کا لکھنا۔ وہ تمہارا کام ہے"۔

نیلکنٹھ۔ میری آپ سے مؤدبانہ عرض ہے کہ ریاست کو سنبھلنے کے لئے کچھ اور وقت دیجئے۔ آپ کا رپورٹ بھیجنا ہمارے لئے مُضر ہوگا۔

اِدھر تو یہ تماشہ ہو رہا تھا۔ صوفیا اقتدار کے تخت پر جلوہ افروز تھی۔ ثروت مورچھل ہلاتی تھی۔ رعب اردلی میں تھا۔ اُدھر ونے سنگھ اپنی اندھیری کال کوٹھری میں غم و غصہ میں بھرا بیٹھا ہُوا عورت کی بیدردی اور بیوفائی پر رو رہا تھا۔ اور قیدی اپنے اپنے کمرے صاف کر رہے تھے۔ انہیں کل نئے کمبل اور نئے کُرتے دے گئے تھے جو ریاست کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ تھا۔ جیل کے ملازمین قیدیوں کو پڑھا رہے تھے :- "میم صاحب پوچھیں۔ تمہیں کیا شکایت ہے تو سب لوگ یکزبان ہو کر کہنا۔ حضور کے اقبال سے ہم سب لوگ بہت آرام سے ہیں۔ اور حضور کے جان و مال کی خیر مناتے ہیں۔ پوچھیں۔ کیا چاہتے ہو تو کہنا حضور کی روز بروز ترقی ہو۔ اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔ خبردار جو کسی نے سر اوپر اٹھایا یا کوئی اور بات زبان سے نکالی۔ کھال اُدھیڑ دی جائے گی"۔ قیدی جامہ میں پھولے نہ

سمانے تھے۔ آج میم صاحبہ کی آمد کی خوشی میں مٹھائیاں ملیں گی۔ ایک دن کی چھٹی ہوگی۔ بھگوان انہیں سدا سکھی رکھیں کہ ہم ابھاگوں پر ہا تنی دیا کرتی ہیں۔

مگر ونے کے کمرہ میں ابھی تک صفائی نہیں ہوئی۔ نیا کمبل پڑا ہوا ہے چھوا تک نہیں گیا۔ نیا کرتہ جوں کا توں تہ کیا ہوا رکھا ہے۔ وہ اپنا پرانا کرتہ ہی پہنے ہوئے ہے۔ اس کے جسم کے ایک ایک جزو سے۔ دماغ کے ایک ایک ذرہ سے۔ دل کی ایک ایک حرکت سے یہی آواز آرہی ہے۔ "صوفیا! اس کے سامنے کیونکر جاؤں گا؟" اس نے سوچنا شروع کیا۔ "صوفیا یہاں کیوں آرہی ہے؟ کیا میری تحقیر کرنا چاہتی ہے۔ صوفیا! جو رحم و محبت کی مجسم دیوی تھی؟ کیا وہ مجھے کلارک کے سامنے بلاکر اپنے پیروں تلے کچلنا چاہتی ہے؟ اتنی بیدردی اور مجھ سے بدنصیب پر جو آپ ہی اپنے دنوں کی گردش کو رو رہا ہے۔ نہیں۔ وہ اتنی سنگدل نہیں ہے۔ واقعی اُس کا نازک دل اتنا سخت نہیں ہو سکتا۔ یہ سب مسٹر کلارک کی شرارت ہے۔ وہ مجھے صوفیا کے سامنے ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں انہیں یہ موقعہ نہیں دوں گا۔ میں اُن کے سامنے ہی نہ جاؤں گا۔ مجھے جبراً لے جائے جس کا جی چاہے۔ کیوں بہانہ کروں کہ میں بیمار ہوں؟ صاف کہہ دوں گا۔ میں وہاں نہیں جاتا۔ اگر جیل کا یہ قانون ہو تو ہُوا کرے۔ مجھے ایسے قانون کی پرواہ نہیں۔ جو بالکل بے معنی ہو سُننا ہوں۔ دونوں یہاں ایک ہفتہ تک ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ کیا رعایا کو پیس ہی ڈالیں گے۔ اب بھی تو مشکل سے نصف آدمی بچ رہے ہوں گے۔ سینکڑوں نکال دئے گئے۔ سینکڑوں جیل میں ٹھونس دئے گئے۔ کیا اس شہر کو بالکل تباہ کر دینا چاہتے ہیں؟

دفعتاً جیل کا داروغہ آکر تند لہجہ میں بولا۔ "تم نے کمرہ کی صفائی نہیں کی؟ ارے تم نے تو ابھی تک کرتہ بھی نہیں بدلا۔ کمبل تک نہیں بچھایا! تمہیں حکم

ملا یا نہیں؟"

ونے۔ حکم تو ملا مگر میں نے اُس کی تعمیل کرنا ضروری نہیں خیال کیا۔

داروغہ نے اور گرم ہو کر کہا: "اس کا یہی نتیجہ ہوگا۔ کہ تمہارے ساتھ بھی اور قیدیوں کا سا سلوک کیا جائیگا۔ ہم تمہارے ساتھ اب تک شرافت کا برتاؤ کرتے آئے ہیں۔ اس لئے کہ تم ایک معزز رئیس کے لڑکے ہو اور یہاں غیر جگہ آ پڑے ہو۔ مگر میں شرارت نہیں برداشت کر سکتا۔"

ونے۔ یہ بتلائیے کہ مجھے پولٹیکل ایجنٹ کے سامنے تو نہ جانا پڑیگا؟

داروغہ۔ اور یہ کمبل اور گدّا کس لئے دیا گیا ہے؟ کبھی اور بھی کسی نے یہاں نیا کمبل پایا ہے؟ تم لوگوں کے تو نصیب جاگ اُٹھے۔

ونے۔ مگر آپ میرے ساتھ اتنی رعایت کریں کہ مجھے صاحب کے سامنے جانے پر مجبور نہ کریں۔ تو میں آپ کا حکم ماننے کو تیار ہوں۔

داروغہ۔ کیسی بے سر پیر کی باتیں کرتے ہو جی؟ میرا کوئی اختیار ہے؟ نہیں جانا پڑے گا۔

ونے نے منت آمیز لہجے میں کہا: "میں آپ کا یہ احسان نہ بھولونگا۔" کسی دوسرے موقع پر داروغہ جی شاید جامہ سے باہر ہو جاتے۔ مگر آج قیدیوں کو خوش رکھنا ضروری تھا۔ بولے ---"مگر بھائی۔ یہ رعایت کرنی میرے اختیار سے باہر ہے۔ مجھ پر نہ جانے کیا آفت آ جائے۔ سردار صاحب مجھے کچا ہی کھا جائیں گے۔ میم صاحبہ کو جیل خانوں کے دیکھنے کا خبط ہے۔ بڑے صاحب تو اہلکاروں کے دشمن ہیں۔ مگر میم صاحبہ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ سچ پوچھو۔ تو جو کچھ ہیں وہ میم صاحبہ ہی ہیں۔ صاحب تو ان کے اشاروں کے غلام ہیں۔ کہیں وہ ناراض ہو گئیں تو تمہاری میعاد تو دونی ہو ہی جائے گی۔ پر ساتھ ہی ہم بھی کہیں کے نہ رہیں گے۔"

ونے۔ معلوم ہوتا ہے میم صاحب اُن پر بہت حاوی ہیں؟
داروغہ۔ حاوی! اجی یہ کہو کہ میم صاحبہ ہی پولٹیکل ایجنٹ ہیں۔ صاحب تو صرف دستخط کرنے کو ہیں۔ نذر نیاز سب میم صاحب ہی کے ہاتھوں میں جاتی ہے۔
ونے۔ آپ میرے ساتھ صرف اتنی رعایت کیجئے کہ مجھے ان کے سامنے جانے کے لئے مجبور نہ کیجئے۔ اتنے قیدیوں میں ایک قیدی کی کمی معلوم ہی نہ ہوگی۔ ہاں وہ اگر مجھے نام لے کر بلائیں گی تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔
داروغہ۔ سردار صاحب مجھے زندہ ہی نگل جائیں گے۔
ونے۔ مگر کرنا آپ کو یہی پڑے گا۔ میں اپنی خوشی سے ہرگز نہ جاؤنگا۔
داروغہ۔ میں بُرا آدمی ہوں۔ مجھے دِق مت کرو۔ میں نے اسی جیل میں بڑے بڑے سرکش قیدیوں کی گردنیں ڈھیلی کر دی ہیں۔
ونے۔ اپنے کو کوسنے کا آپ کو اختیار ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ میں جبر کے سامنے سر جھکانے والا آدمی نہیں ہوں۔
داروغہ۔ بھئی تم عجیب آدمی ہو۔ اس کے حکم سے سارا شہر خالی کرایا جا رہا ہے۔ اور تم پھر بھی اپنی ضد کیئے جاتے ہو۔ لیکن تمہیں اپنی جان بھاری ہو۔ مجھے تو اپنی جان بھاری نہیں ہے۔
ونے۔ کیا شہر خالی کرایا جا رہا ہے؟ یہ کیوں؟
داروغہ۔ میم صاحب کا حکم ہے اور کیا؟ جسونت نگر پر اُن کا قہر ہے۔ جب سے انہوں نے یہاں کی وارداتیں سُنی ہیں۔ مزاج بگڑ گیا ہے۔ اُن کا بس چلے تو سارا شہر کھدوا کر پھینک دیں۔ حکم ہُوا ہے۔ کہ ایک ہفتہ تک کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں شورش برپا نہ ہو جائے۔ صدر سے فوجی امداد طلب کی گئی ہے۔
داروغہ نے حالات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ اس سے ان کا مقصد

ونے سنگھ پر اثر ڈالنا تھا۔ اور ان کا مقصد پورا ہو گیا۔ ونے سنگھ کو فکر ہوئی۔ کہ کہیں حکم عدولی سے ناراض ہو کر حکام نے مجھ پر زیادہ سختی کرنی شروع کی۔ اور عوام کو یہ خبر ملی۔ تو وہ یقیناً فساد برپا کر دیں گے۔ اور اس حالت میں ان کی خونریزیوں کے گناہ کا عذاب میری گردن پر ہو گا۔ کون جانے۔ میرے بعد میرے ساتھیوں نے عوام کو اور بھی ابھار رکھا ہو۔ کیونکہ اُن میں شریرالمزاج نوجوانوں کی کمی نہیں ہے۔ نہیں۔ حالت نازک ہے۔ مجھے اس وقت صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ داروغہ سے پوچھا۔ "ہیم صاحب یہاں کس وقت آئیں گی؟"

داروغہ۔ ان کے آنے کا کوئی وقت تھوڑا ہی مقرر ہے۔ دھوکا دے کر کسی ایسے وقت آپہنچیں گی۔ جب ہم لوگ غافل پڑے ہوں گے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ کمرہ کی صفائی کر ڈالو۔ کپڑے بدل لو۔ کون جانے۔ آج ہی آجائیں۔

ونے۔ اچھی بات ہے۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں۔ سب کر لوں گا۔ آپ بیفکر ہو جائیں۔

داروغہ۔ سلامی کے وقت آنے سے انکار تو نہ کرو گے؟

ونے۔ جی نہیں۔ آپ مجھے سب سے پہلے صحن میں موجود پائیں گے۔

داروغہ۔ میری شکایت تو نہ کرو گے؟

ونے۔ شکایت کرنا میری عادت نہیں۔ اسے آپ خوب جانتے ہیں۔

داروغہ چلا گیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ ونے نے اپنے کمرہ میں جھاڑو لگائی۔ کپڑے بدلے۔ کمبل بچھا دیا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے کسی کی توجہ ان کی جانب مائل ہو۔ وہ اپنی بے عذری

سے حکام کے شکوک کو رفع کر دینا چاہتے تھے۔ کھانے کا وقت آ گیا۔ مگر مسٹر کلارک نہ آئے۔ بالآخر داروغہ نے نا اُمید ہو کر قید خانہ کے دروازے بند کرا دئے اور قیدیوں کو سونے کا حکم دے دیا۔ ونے لیٹے تو سوچنے لگے:۔
صوفیا میں یہ تبدیلی کیوں کر ہو گئی؟ وہی شرم و حیا کی دیوی۔ وہی خدمت و ایثار کی پتلی۔ آج اپنی مطلق العنانی کے سبب ڈائن سی بنی ہوئی ہے۔ اس کا دل کتنا نرم تھا اور رحم سے کتنا معمور۔ اس کے جذبات کتنے بلند اور خیالات کتنے پاکیزہ تھے۔ اس کے مزاج میں کتنی سادگی تھی۔ اس کی ایک نگاہ دل پر کالبد اس کی ایک ایک تشبیہ کا سا اثر پیدا کرتی تھی۔ اس کے منہ سے جو لفظ نکلتا تھا۔ وہ شمع کے نور کی طرح دل کو منور کر دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صرف پھولوں کی خوشبو سے اس کی سرشت ہوئی ہے۔ کتنا سادہ۔ کتنا متین۔ کتنا دلکش حسن تھا! وہی صوفیا اب اتنی بیدرد ہو گئی ہے!

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا گویا کوئی طوفان آ رہا ہے۔ آج جیل خانہ کے صحن میں داروغہ کے مویشی نہ بندھے تھے نہ برآمدوں میں گھاس کے ڈھیر تھے۔ آج کسی قیدی کو اہلکاران جیل کے جوٹھے برتن نہیں صاف کرنے پڑے۔ کسی کو سپاہی کی چنپی نہیں کرنی پڑی۔ جیل کے ڈاکٹر کی بڑھیا مہری آج قیدیوں کو گالیاں نہیں دے رہی تھی۔ اور دفتر میں قیدیوں سے ملاقات کرنے والے رشتہ داروں سے وصول کئے گئے نذرانہ کی تقسیم نہ ہوتی تھی۔ کمروں میں چراغ تھے۔ دروازے بھی کھلے رکھے گئے تھے۔ ونے کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ کیوں نہ بھاگ چلوں۔ ممکن ہے کہ میرے سمجھانے بجھانے سے عوام کو تسکین ہو۔ صدر سے فوج آ رہی ہے۔ ذرا سی بات میں غدر ہو سکتا ہے۔ اگر میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ میرے اس گناہ کا کفارہ ہو گا۔ انہوں نے دبی ہوئی نگاہوں سے جیل کی اونچی

دیواروں کو دیکھا۔ کمرہ سے باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑی۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟ لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں عوام کو بھڑکانے کے ارادہ سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی حیص بیص میں رات گذر گئی۔ ابھی اہلکاروں کی نیند بھی نہ کھلی تھی۔ کہ موٹر کی آواز نے آنے والوں کو خبر کر دی۔ داروغہ۔ ڈاکٹر۔ وارڈر۔ چوکیدار سب گھبرا کر جھٹ پٹ نکل پڑے۔ گھنٹی بجی۔ قیدی میدان میں نکل آئے۔ انہیں قطاروں میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور اسی وقت صوفیا۔ مسٹر کلارک اور سردار نیلکنٹھ جیل میں داخل ہوئے۔

صوفیا نے آتے ہی قیدیوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں انتظار نہ تھا۔ اشتیاق نہ تھا۔ خوف تھا۔ اضطراب تھا۔ بیچینی تھی جس آرزو نے اُسے برسوں رلایا تھا۔ جو اُسے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ جس کے لئے اُس نے اپنے پسندیدہ اصولوں کو قربان کر دیا تھا۔ اس کو سامنے دیکھ کر وہ اس وقت مضمحل ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی پردیسی بہت دنوں کے بعد اپنے گاؤں میں آکر اندر قدم رکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ کہ کہیں کسی کی صدائے ماتم کانوں میں نہ آپڑے۔ دفعتاً اُس نے ونے کو سر جھکائے ہوئے کھڑے دیکھا۔ دل میں محبت کا ایک ہیجان پیدا ہُوا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ پھر وہی تھا مگر ویران۔ جس و خاشاک سے ڈھکا ہُوا پہچاننا مشکل تھا۔ وہ شگفتہ چہرہ کہاں تھا جس پر شعر کی نزاکت نثار ہوتی تھی۔ وہ دستِ کرم کا سا فراخ سینہ کہاں تھا؟ صوفیا نے بے اختیار چاہا۔ کہ ونے کے پیروں پر گر پڑوں۔ اُسے آنسوؤں سے دھوؤں۔ اُسے گلے سے لگاؤں۔ دفعتاً ونے سنگین غش کھا کر گر پڑے۔ ایک درد بھری آواز تھی جو ایک لمحہ تک گونج کر غرطِ غم سے دب گئی۔ صوفیا فوراً ونے کے پاس جا پہنچی۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ جیل کا ڈاکٹر دوڑا۔ داروغہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ اف

نوکروں کی خیریت نہیں میم صاحب پوچھیں گی۔ اس کی حالت اتنی نازک تھی تو ہسپتال میں کیوں نہیں رکھا؟ بڑی مصیبت میں پھنسا۔ اس بھلے آدمی کو بھی اسی وقت بیہوش ہونا تھا۔ کچھ نہیں۔ یہ سب اس کی شرارت ہے۔ اس نے دم روک رکھا ہے۔ بنا ہُوا ہے۔ مجھے تباہ کرنے پر تلا ہُوا ہے۔ بچہ جانے دو میم صاحب کو تو دیکھنا تمہاری کیسی خبر لیتا ہوں۔ کہ ساری بیہوشی غائب ہو جائے۔ اور پھر کبھی بیہوش ہونے کا نام نہ لو۔ یہ آخر اسے ہو کیا گیا؟ کسی قیدی کو آج تک یوں بیہوش ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاں قصّوں میں لوگوں کا بات بات میں بے ہوش ہو جانا پڑھا ہے۔ صرع کی بیماری ہوگی اور کیا؟"

داروغہ تو اپنی جان کی خیر منا رہا تھا اور اُدھر سردار صاحب مسٹر کلارک سے کہہ رہے تھے کہ یہ وہی نوجوان ہے جس نے ریاست میں شورش برپا کر رکھی ہے۔ صوفیا نے ڈاکٹر کو جھڑک کر ہٹ جانے کو کہا اور ونے کو اٹھوا کر دفتر میں لے گئی۔ آج وہاں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ نقرئی کرسیاں تھیں۔ میز پر ناشتہ کی چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ تجویز تھی کہ معائنہ کے بعد صاحب یہاں ناشتہ کریں گے۔ صوفیا نے ونے کو قالین کے فرش پر لٹا دیا اور سب لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ہمدردی اور رحم کے لیے مشہور تھی کسی کو کچھ تعجب نہ ہُوا۔ جب کمرہ میں کوئی نہ رہا تو صوفیا نے دریچوں پر پردے ڈال دئے۔ ونے کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اپنا رومال اس پر جھلنے لگی۔

آنسوؤں کے گرم گرم قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر ونے کے چہرہ پر گرنے لگے۔ ان میں کس قدر جان فزائی تھی۔ اُن میں اُس کی ساری قلبی اور روحانی طاقت بھری ہوئی تھی۔ ایک ایک قطرہ اس کی زندگی کے چشمہ کا ایک ایک قطرہ تھا۔ ونے سنگھ کی آنکھیں کھل گئیں۔

بہشت کا ایک پھول لازوال و انتہا خوشبو میں نہایا ہُوا اور ہوا کے ہلکے جھونکوں سے ملتا ہُوا سامنے موجود تھا۔ حُسن کی سب سے زیادہ دِلکش اور سہاونی نمود وہ ہے جب وہ رشک آلود غم میں گھُلتا نظر آتا ہے۔ وہی اُس کی روحانی نمود ہوتی ہے۔ ونے چونک کر اٹھ نہیں بیٹھے۔ یہی تو ان کا بہشت ہے۔ یہی تو ان کی سنہری سلطنت ہے۔ یہی تو ان کی آرزوؤں کی انتہا ہے۔ اس روحانی لذّت سے سیری کہاں؟ اس کے دل میں ایک درد بھری حسرت پیدا ہوئی:۔ کاش اسی طرح محبت کی سیج پر لیٹے ہوئے یہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتیں۔ ساری آرزوؤں کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا۔ مرنے کے لئے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا ہے؟

دفعتاً اُسے یاد آگیا۔ کہ صوفیا کو چھُونا بھی اس کے لئے ممنوع ہے۔ اس نے فوراً اپنا سر اس کے زانو پر سے ہٹا لیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مسز کلارک۔ آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ اس کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں۔"

صوفیا نے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "احسان گالی کی شکل میں تو نہیں ظاہر کیا جاتا۔

ونے نے متحیر ہو کر کہا۔ "ایسا بڑا قصور مجھ سے کبھی نہیں ہُوا۔

صوفیا۔ خواہ مخواہ کسی شخص کے ساتھ میرا رشتہ قائم کر دینا گالی نہیں تو اور کیا ہے؟

ونے۔ مسٹر کلارک؟

صوفیا۔ کلارک کو میں تمہارے جُوتے کا تسمہ کھولنے کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔

ونے۔ لیکن اماں جی نے . . . . .

صوفیا۔ تمہاری اماں جی نے جھوٹ لکھا اور تم نے اس پر یقین

کر کے مجھ پر واقعی بڑا ظلم کیا۔ کوئل آم نہ پا کر بھی نکوڑیوں پر نہیں گرتی۔
اتنے میں مسٹر کلارک نے آکر پوچھا۔" اس قیدی کی کیا حالت ہے؟ ڈاکٹر آ رہا ہے۔ وہ اس کی دوا کرے گا۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔"
صوفیا نے سرد مہری سے جواب دیا۔" تم جاؤ۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔"
کلارک۔ کتنی دیر تک تمہاری راہ دیکھوں؟
صوفیا۔ یہ تو میں نہیں بتلا سکتی۔ میرے خیال میں ایک انسان کی خدمت کرنا سیر کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔
کلارک۔ خیر میں تھوڑی دیر اور ٹھہروں گا۔
یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔ اس وقت صوفیا نے ونے کے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔" ونے! میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے بچالو۔ میں نے رانی صاحبہ کے شکوک سے بچنے کے لئے یہ سوانگ رچا تھا۔"
ونے نے مشکوک انداز سے پوچھا۔" تم یہاں مسٹر کلارک کے ساتھ کیوں آئیں۔ اور ان کے ساتھ کیسے رہتی ہو؟"
صوفیا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ بولی۔" ونے! نہ پوچھو۔ مگر میں ایشور کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے کیا اور میں اس قید سے نکالنے کے لئے مجھے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ میں نے کلارک کو مغالطہ میں ڈال رکھا ہے۔ تمہارے ہی لئے میں نے یہ جھوٹا بھیس لے رکھا ہے۔ اگر تم اس وقت کہو کہ صوفیا تو میرے ساتھ جیل میں رہ۔ تو میں یہاں آکر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اگر تم میرا ہاتھ پکڑ کر کہو کہ صوفیا تو میرے ساتھ چل۔ تو آج ہی تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔ میں نے تمہارا دامن پکڑ لیا ہے۔ اور اب اسے کسی طرح بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ خواہ تم مجھے ٹھکرا ہی کیوں نہ دو۔ میں نے اپنی خودداری تک کو تمہارے لئے وقف کر دیا

ونے یہ ایشور کی مرضی ہے۔ یہ اسی کی تحریک ہے۔ ورنہ اس قدر ذلت و خواری برداشت کرتے ہوئے تم مجھے زندہ نہ پاتے۔
ونّے نے صوفیا کے دل کی تھاہ لینے کے لئے کہا۔ اگر ایشور کی مرضی ہے۔ تو اس نے میرے اور تمہارے درمیان میں یہ دیوار کیوں کھڑی کر دی ہے؟
صوفیا۔ یہ دیوار ایشور نے نہیں کھڑی کی بلکہ آدمیوں نے کھڑی کی ہے۔
ونے۔ کتنی مضبوط ہے۔
صوفیا۔ مگر ناقابلِ شکست نہیں۔
ونے۔ تم اسے توڑ سکوگی؟
صوفیا۔ اسی لمحہ تمہاری آنکھوں کے ایک اشارہ پر۔ ایک وقت تھا۔ جب میں اس دیوار کو ایشور کی بنائی ہوئی خیال کرتی تھی۔ اور اس کا احترام کرتی تھی۔ مگر اب اس کی اصلیت سے واقف ہوگئی ہوں۔ پریم (محبت) ان رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ جسمانی رشتہ نہیں۔ رُوحانی رشتہ ہے۔
ونے نے صوفیا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ تو آج سے تم میری ہو اور میں تمہارا ہوں۔
صوفیا کا سر ونے سنگھ کے سینہ پر جھک گیا اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ جس طرح سیاہ بادل زمین پر جھک کر ایک لمحہ میں اُسے سیراب کر دیتے ہیں۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ خاموش رہ گئی۔ غم کی انتہا خموشی ہے مگر خشک اور جلانے والی خوشی کی انتہا بھی خموشی ہے۔ مگر نم اور طراوت بخش۔ صوفیا کو اب اپنے ایک ایک عضو میں نبض کی ایک ایک حرکت میں باطنی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ کشتی نے ناخدا کا سہارا پالیا تھا۔ اب اُس کے لئے منزلِ مقصود ایک یقینی شے تھی۔ وہ اب ہوا کے جھونکوں یا لہروں کے تھپیڑوں کے ساتھ ڈانواں ڈول نہ ہوگی۔ بلکہ ٹھیک طور سے اپنے راستہ پر چلے گی۔
ونے بھی دونوں پَر کھولے ہوئے خوشی کے آسمان میں اُڑ رہا تھا۔ وہاں

کی ہوا میں خوشبو تھی۔ روشنی میں جان تھی۔ کسی ایسی شے کا وجود نہ تھا جو دیکھنے میں کریہہ۔ سننے میں کرخت۔ چھونے میں سخت اور ذائقہ میں تلخ ہو۔ وہاں کے پھولوں میں کانٹے نہ تھے۔ آفتاب میں اتنی تمازت نہ تھی۔ زمین پر آندھیاں نہ تھیں۔ پیری نہ تھی۔ مفلسی نہ تھی۔ فکر نہ تھی۔ لڑائی نہ تھی۔ ایک سلطنت تھی۔ امن و آشتی سے معمور۔ صوفیا سلطنت کی ملکہ تھی۔ اور رونے خود اس کی آغوش محبت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس خواب مسرت کے مقابلہ میں وہ ایثار و ریاضت کی زندگی کتنی بے مزہ۔ کتنی مایوس بخش تھی۔ وہ حجرۂ تاریک کس قدر خوفناک!

دفعتاً مسٹر کلارک نے پھر آکر کہا۔ ڈارلنگ (پیاری) اب دیر نہ کرو۔ دیر تو بہت ہو رہی ہے۔ سردار صاحب مصر ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اس مریض کی تیمارداری کرے گا۔

صوفیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ونے کی طرف سے منہ پھیر کر درد سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ گھبرانا نہیں۔ میں کل پھر آؤں گی۔

ونے کو ایسا معلوم ہوا گویا رگوں میں خون منجمد اور خشک ہوتا جا رہا ہے۔ وہ سُن کر پڑا رہ گیا۔ صوفیا دروازہ تک گئی۔ پھر رومال لینے کے بہانہ سے واپس آکر ونے کے کان میں کہنے لگی۔ میں کل پھر آؤں گی۔ اور جبھی ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں تمہاری جانب سے سردار نیلکنٹھ سے کہہ دوں گی کہ وہ معافی چاہتے ہیں۔

صوفیا کے چلے جانے کے بعد بھی یہ جملے ہی میں کہے گئے مگر اُمید سے بھرے اور محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کسی نغمۂ شیریں کی آخری گونج کی طرح ونے کے کانوں میں گونجتے رہے۔ مگر وہ جلد ہی ٹھوس دُنیا میں آنے کے لئے مجبور ہوا۔ جیل کے ڈاکٹر نے آکر اس کو دفتر ہی میں ایک پلنگ پر لٹا دیا اور مقوی دوائیں دیں۔ پلنگ پر نرم بستر تھا۔ تکیے لگے تھے۔ پنکھا جھلا جا رہا تھا۔ داروغہ ایک منٹ بعد مریض کی مزاج پُرسی کے لئے آتا تھا۔ اور ڈاکٹر تو وہاں

سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ ونے نے ان تیمارداریوں سے تنگ آکر ڈاکٹر سے کہا۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ اب آپ جائیں۔ شام کو آ جائیے گا۔

ڈاکٹر صاحب ڈرتے ڈرتے بولے۔ آپ کو ذرا نیند آ جائے۔ تو میں چلا جاؤں۔

ونے نے انہیں یقین دلایا کہ آپ کے رخصت ہوتے ہی مجھے نیند آ جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی مفروضہ خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے چلے گئے۔ اسی حیلہ سے ونے نے داروغہ کو بھی ہٹایا جو آج اخلاق و رحم کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ میم صاحب کے چلے جانے پر اس کی خوب خبر لوں گا۔ مگر وہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ سوار صاحب نے جاتے وقت تاکید کر دی تھی کہ ان کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرنا ورنہ میم صاحب جہنم رسید کریں گی۔

کسی بات کو اطمینان سے سوچنے کے لیئے تنہائی کا ہونا اُسی قدر ضروری ہے۔ جتنا کہ مراقبہ کے لیئے۔ ہوا کی جنبش ترازو کے پلڑوں کو برابر نہیں ہونے دیتی۔ ونے کو اب خیال آیا:۔ اماں کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ اپنے دل میں کیا کہیں گی میرے ساتھ ان کی کتنی دلی تمنائیں وابستہ ہیں۔ صوفیا کے دام محبت سے بچانے کے لیئے انہوں نے مجھے جلاوطن کیا۔ اور اس لیئے انہوں نے صوفیا کو بدنام کیا۔ ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ رنج تو پتا جی کو بھی ہوگا۔ مگر وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ اس لیئے کہ انہیں انسانی کمزوریوں سے ہمدردی ہے۔ اماں جی میں دماغ ہی دماغ ہے۔ پتا جی میں دل و دماغ دونوں ہیں۔ لیکن میں اسے کمزوری کیوں کہوں میں کوئی ایسا کام نہیں کر رہا ہوں جسے دنیا میں کسی نے کیا نہ ہو۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جنہوں نے اپنے کو قوم پر قربان کر دیا ہو؟ واقعی خیال کے ساتھ ہی قوم کا خیال رکھنے والے آدمیوں نے اب تک جو کچھ کیا

ہے وہ کیا ہے۔ خانی القوم ہو جانے والے لوگوں کا شمار تو انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ پھر جس قوم کے حکام میں عقل و انصاف نہیں۔ رعایا میں احساس و جوش نہیں۔ اس کے لئے قربان ہو جانا فضول ہے۔ اندھوں کے آگے رو کر اپنے دیدے کھونے کے سوا اور کیا ہاتھ آتا ہے؟

رفتہ رفتہ تخیلات نے زندگی کی آسائش کے سامان جمع کرنا شروع کئے۔

دیہات میں رہوں گا۔ وہیں ایک چھوٹا سا مکان بنواؤں گا۔ صاف کشادہ اور ہوادار۔ زیادہ تکلف یا تصنع کی ضرورت نہیں۔ وہیں ہم دونوں سب سے الگ رہ کر یگانیت زندگی بسر کریں گے۔ بیجا نمود سے کیا فائدہ؟ میں باغیچہ میں کام کروں گا۔ کیاریاں بناؤں گا۔ قلمیں لگاؤں گا اور صوفیا کو اپنی کارگذاری سے حیرت میں ڈالوں گا۔ گلدستے بنا کر اس کے سامنے پیش کروں گا اور دست بستہ کہوں گا کہ سرکار۔ کچھ انعام ملے۔ پھلوں کی ڈالیاں لگاؤں گا اور کہوں گا کہ رانی جی کچھ نگاہ ہو جائے۔ کبھی کبھی صوفیا بھی پودوں کو سینچے گی۔ میں تالاب سے پانی بھر بھر دوں گا۔ وہ لا کر کیاریوں میں ڈالے گی۔ اس کا نازک جسم پسینہ سے اور خوشنما لباس پانی سے تر ہو جائے گا۔ اس وقت کسی پیڑ کے نیچے اسے بٹھلا کر میں پنکھا جھلوں گا۔ کبھی کبھی کشتی میں سیر کریں گے۔ دیہاتی کشتی ہوگی۔ ڈانڈ سے چلنے والی۔ موٹر بوٹ میں وہ لطف کہاں۔ وہ سکون کہاں؟ اس کی تیزی سے سر چکرا جاتا ہے۔ اس کے شور سے کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ میں کشتی میں بیٹھ کر ڈانڈ چلاؤں گا۔ صوفیا کنول کے پھول توڑے گی۔ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوں گے۔ کبھی کبھی پربھو سیوک بھی آئیں گے۔ آہ کتنی خوش کن زندگی ہوگی۔ کل ہم دونوں عازم وطن ہوں گے جہاں خوشیاں آغوش کھولے ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

صوفیا اور کلارک کی آج شام کو ایک جاگیردار کے یہاں دعوت تھی۔ جب میزیں آراستہ ہو گئیں اور ایک حیدرآبادی مداری نے اپنے

کرتب دکھانے شروع کئے تو صوفیانے موقعہ پاکر سردار نیلکنٹھ سے کہا۔
"اس قیدی کی حالت مجھے خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دل کی حرکت بہت سُست پڑ گئی ہے۔ کیوں ولیم۔ تم نے دیکھا اس کا چہرہ کتنا زرد پڑ گیا تھا؟"

کلارک نے آج پہلی مرتبہ خلاف اُمید جواب دیا۔ "غشی کی حالت میں اکثر چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔"

صوفیا۔ وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ کہ اس کی حالت اچھی نہیں۔ ورنہ غشی کیوں ہوتی۔ بہتر ہو کہ آپ اسے کسی ہوشیار معالج کے سپرد کر دیں۔ میری رائے میں اب وہ اپنے قصور کی کافی سزا پا چکا ہے۔ اُسے رہا کر دینا ہی مناسب ہوگا۔

نیلکنٹھ۔ میم صاحب۔ اس کی صورت پر نہ جائیے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ یہاں عوام پر اس کا کتنا اثر ہے۔ وہ ریاست میں اتنی زبردست بدامنی پیدا کر دے گا۔ کہ اس کا دبانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ بلا کا ضدی ہے۔ ریاست سے باہر جانے پر راضی نہیں ہوتا۔

کلارک۔ اس سرکش کو قید رکھنا ہی اچھا ہے۔

صوفیا نے بگڑ کر کہا۔ "میں اسے سراسر ناانصافی سمجھتی ہوں اور مجھے آج پہلی بار یہ معلوم ہُوا کہ تم اتنے بیدرد ہو۔"

کلارک۔ مجھے تمہارے جیسا دردمند دِل رکھنے کا دعوٰے نہیں ہے۔

صوفیا نے کلارک کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ خودسری۔ یہ تمکنت کہاں سے آئی؟ حقارت سے بولی۔ ایک انسان کی زندگی اتنی حقیر شے نہیں ہے۔

کلارک۔ سلطنت کے تحفظ کے مقابلہ میں ایک انسان کی زندگی

کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جس رحم سے جس ہمدردی سے کسی غریب کا پیٹ بھرتا ہو۔ اس کی جسمانی تکالیف کا دفعیہ ہوتا ہو۔ کسی مغموم کی تشفی ہوتی ہو۔ اُس کا میں قایل ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں ان صفات سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ لیکن جو ہمدردی سلطنت کی جڑ کھوکھلی کر دے۔ سرکشوں کو سر اٹھانے کا موقعہ دے۔ رعایا میں بغاوت پھیلائے۔ اُسے میں ناعاقبت اندیشی ہی نہیں بلکہ حماقت سمجھتا ہوں۔

صوفیا کے چہرہ پر ایک غیر انسانی نمود کی جھلک دکھائی پڑی مگر اُس نے ضبط کیا۔ شاید اتنے تحمل سے اس نے کبھی کام نہیں لیا تھا۔ مذہب داری کو تحمل سے عناد ہے۔ مگر اس وقت اس کے منہ سے نکلا ہُوا ایک غیر محتاط کلمہ بھی اس کی ساری زندگی کو تباہ کر سکتا تھا۔ نرم ہو کر بولی۔ ہاں اس نقطۂ خیال سے بے شک شخصی زندگی کی کوئی قیمت نہیں باقی رہتی۔ میں نے اس پہلو سے خیال نہ کیا تھا مگر پھر بھی اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ چھوڑ دیا جائے تو اس ریاست میں قدم نہ رکھے گا۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنے وعدہ کا پکا ہے۔

نیلکنٹھ۔ کیا آپ سے اس نے وعدہ کیا ہے؟

صوفیا۔ ہاں وعدہ ہی سمجھئے۔ میں اس کی ضمانت کر سکتی ہوں۔

نیلکنٹھ۔ اتنا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے قول سے پھر نہیں سکتا۔

کلارک۔ جب تک اس کی تحریری درخواست میرے سامنے نہ آئے۔ میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

نیلکنٹھ۔ ہاں۔ یہ تو نہایت ہی ضروری ہے۔

صوفیا۔ درخواست کا مضمون کیا ہوگا؟

کلارک۔ سب سے پہلے وہ اپنا قصور تسلیم کرے اور اپنی وفاداری

کا یقین دلانے کے بعد حلفی معاہدہ کرے کہ اس ریاست میں پھر قدم نہ رکھوں گا۔ اُس کے ساتھ ضمانت بھی ہونی چاہئے۔ یا تو نقد روپے ہوں یا معزز آدمیوں کی ضمانت ہو۔ تمہاری ضمانت کی میری نظر میں کتنی ہی وقعت ہو۔ ضابطہ کی نظر میں اس کی ذرا بھی وقعت نہیں ہے۔

دعوت کے بعد صوفیا شاہی محل میں آئی تو سوچنے لگی۔ یہ عقدہ کیونکر حل ہو؟ یوں تو میں ونے کی منت سماجت کروں تو وہ ریاست سے چلے جانے پر راضی ہو جائیں گے۔ لیکن غالباً وہ تحریری معاہدہ نہ کریں گے۔ اگر کسی طرح میں نے رو دھو کر انہیں اس پر بھی راضی کر لیا تو یہاں کون معزز شخص ان کی ضمانت کرے گا؟ ہاں ان کے گھر سے نقد روپے آسکتے ہیں۔ مگر رانی جی کبھی اسے منظور نہ کریں گی۔ ونے کو کتنی ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے پر ان کو رحم نہ آئے گا۔ لطف تو جب ہے کہ تحریری معاہدہ اور ضمانت کا کوئی ذکر ہی نہ رہے۔ وہ بلا کسی شرط کے آزاد کر دیئے جائیں۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

محل برقی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ محل کے باہر چاروں طرف ساون کی کالی گھٹا تھی اور اتھاہ تاریکی۔ اس محیط تاریکی میں چمکدار محل ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے نیلے آسمان پر چاند نکلا ہو۔ صوفیا اپنے آراستہ کمرہ میں آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی ان قوتوں کو بیدار کر رہی ہے جن کا اثر لا محدود ہے۔ آج اُس نے مدت کے بعد اپنے بالوں میں پھول گوندھے ہیں۔ فیروزی ریشمی ساڑھی پہنی ہے اور کلائیوں میں کنگن باندھے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے ان حسن افزا ترکیبوں سے کام لیا ہے۔ جن سے عورتیں واقف ہوتی ہیں۔ یہ منتر انہیں کو آتا ہے۔ کہ کیونکر زلفوں کا ایک خم آنچل کی ایک لہر دل کو مضطرب کر دیتی ہے۔ آج اس نے مسٹر کلارک کے سلطنت پسندی والے اصول پر فتح یاب ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آج وہ اپنے حسن کی طاقت کو آزمائے گی۔

رم جھم بوندیں گر رہی تھیں گویا مولسری کے پھول جھڑ رہے ہوں۔

بوندوں میں ایک دلکش نغمہ تھا۔ شاہی محل اور سرِ کوہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دیوتاؤں نے محفلِ جشن وطرب آراستہ کی ہے۔ صوفیا پیانو پر بیٹھ گئی اور دل کو بے چین کر دینے والا راگ گانے لگی جس طرح صبح صادق کا سنہرا جلوہ ظہور پذیر ہوتے ہی قدرت کے ہر ہر جزو کو بیدار کر دیتا ہے۔ اسی طرح صوفیا کی پہلی تان نے دل میں ایک چٹکی سی لی۔ مسٹر کلارک آکر ایک کوچ پر بیٹھ گئے اور محو ہو کر سننے لگے۔ گویا کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ انہیں کبھی کوئی کشتی اُمڈے ہوئے سمندر میں جھکولے کھاتی نظر آتی جس پر چھوٹی چھوٹی خوبصورت چڑیاں منڈلاتی تھیں اور کبھی کسی صحرائے ناپیدار کنار میں ایک فقیر جھول کندھے پر رکھے لاٹھی ٹیکتا ہوا نظر آتا۔ نغمہ سے تخیل باتصویر بن جاتا ہے۔

جب تک صوفیا گاتی رہی مسٹر کلارک بیٹھے سر دُھنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہو گئی تو اس کے پاس گئے اور اس کی کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اس کے منہ کے پاس منہ لے جا کر بولے۔ ان انگلیوں کو دل میں رکھ لوں گا۔

صوفیا۔ دل کہاں ہے؟

کلارک نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں تڑپ رہا ہے۔

صوفیا۔ شاید ہو۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ میرا تو خیال ہے کہ خدا نے تم کو دل دیا ہی نہیں۔

کلارک۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر خدا نے جو کسر رکھی تھی۔ اُسے تمہاری نغمہ سرائیوں نے پورا کر دیا۔ شاید اُن میں خلق کرنے کی صفت ہے۔

صوفیا۔ اگر مجھ میں یہ اعجاز ہوتا تو آج مجھے ایک غیر شخص کے سامنے نادم نہ ہونا پڑتا۔

کلارک نے بے صبری سے کہا۔ کیا میں نے تمہیں نادم کیا؟ میں نے!
صوفیا۔ جی ہاں۔ آپ نے! مجھے آج تمہاری بے اعتنائی سے جتنا رنج ہُوا اُتنا شاید اور کبھی نہ ہُوا تھا۔ مجھے بچپن سے یہی سبق دیا گیا ہے۔ کہ ہر جان دار پر رحم کرنا چاہئے۔ مجھے بتلایا گیا ہے۔ کہ یہی انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔ مذہبی کتب میں بھی رحم اور ہمدردی ہی انسان کی خاص صفات بتلائی گئی ہیں۔ مگر آج معلوم ہُوا ہے کہ بے رحمی کی اہمیت رحم سے کہیں زیادہ ہے۔ سب سے بڑا رنج مجھے اس بات کا ہے کہ اجنبی آدمی کے سامنے میری ہتک ہوئی۔

کلارک۔ خدا جانتا ہے۔ صوفیا۔ میں تمہاری کتنی عزت کرتا ہوں۔ اس کا افسوس مجھے ضرور ہے کہ میں تمہاری مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہُوا۔ اس کا سبب تمہیں معلوم ہی ہے۔ ہماری سلطنت اسی وقت تک ناقابلِ فتح رہ سکتی ہے۔ جب تک رعایا کے دلوں پر ہمارا رعب قائم ہے۔ جب تک وہ ہم کو اپنا بھی خواہ اپنا محافظ اپنا سہارا سمجھتی رہے۔ جب تک ہمارے انصاف پر اس کا خاص اعتقاد ہو۔ جس روز رعایا کے دل سے ہمارا اعتبار اُٹھ جائے گا اُسی روز ہماری سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر سلطنت کو قائم رکھنا ہماری زندگی کا مقصد ہے تو شخصی خیالات وجذبات کے لئے اس میں ذرا بھی گنجائش نہیں۔ سلطنت کے تحفظ کے لئے ہم بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر سکتے ہیں۔ بڑی سے بڑی سختیاں جھیل سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی سلطنت جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور جس شخص سے ہمیں نقصان کا ذرا بھی اندیشہ ہو اُسے ہم کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اُسے بالکل فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی طرح کی رعایت۔ ہمدردی یہاں تک کہ منصفانہ سلوک بھی نہیں کر سکتے۔

صوفیا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ مجھے سلطنت سے اتنی محبت نہیں

جتنی تمہیں ہے اور میں اس کے لئے اتنی قربانیاں نہیں کر سکتی جتنی تم کر سکتے ہو۔ تو تم نے مجھے بالکل نہیں سمجھا۔ مجھے دعوے ہے کہ اس معاملہ میں میں کسی سے جو بھر بھی پیچھے نہیں ہوں۔ لیکن یہ بات میرے قیاس میں بھی نہیں آتی کہ دو دوستوں میں کبھی اتنا اختلاف ہو سکتا ہے کہ ہمدردی اور برداشت کے لئے کوئی گنجائش نہ رہے اور خصوصاً اُسی حالت میں جب کہ گوش دیوار کے لئے کوئی دوسرا کان بھی گھسنے کے لئے موجود ہو۔ دیوان کا دل حُب الوطنی کے جذبات سے ایک دم خالی ہے۔ وہ اس کی عمق و وسعت سے ذرا بھی واقف نہیں۔ اس نے تو یہی سمجھا ہو گا کہ جب ان دونوں میں میرے روبرو اس قدر بدمزگی ہو سکتی ہے تو تخلیہ میں نہ جانے کیا ہوتا ہو گا۔ شاید آج سے اُس کے دل میں میری عزت اٹھ گئی۔ اس نے اور لوگوں سے بھی یہ ماجرا بیان کیا ہو گا۔ میری تو ناک سی کٹ گئی۔ تم سمجھتے ہو کہ میں گا رہی ہوں۔ یہ گانا نہیں رونا ہے جب عقد والے مکان کے اور دلہن ہی پر یہ حالت ہو رہی ہے جہاں پھولوں سے خوشی کے نعروں سے پر جوش مصافحوں سے ہنستی ہوئی آنکھوں سے میرا خیر مقدم ہونا چاہئے تھا۔ تو میں اس مکان کے اندر قدم رکھنے کی جرأت کیونکر کر سکتی ہوں؟ تم نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ شاید تم مجھے بہت زیادہ ذکی الحس خیال کرتے ہو گے مگر اپنی فطرت کو فنا کر دینا میرے امکان کے باہر ہے۔ میں اپنے کو مبارکباد دیتی ہوں کہ میں نے اپنے عقد کے معاملہ میں اتنی دور اندیشی اور تامل سے کام لیا۔

یہ کہتے کہتے صوفیا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں گرنے لگیں۔ مصنوعی غم کے اظہار میں بھی اکثر واقعی غم کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مسٹر کلارک افسوس و معذرت کا راگ الاپنے لگے۔ مگر نہ مناسب الفاظ ہی ملتے تھے نہ ویسے خیالات۔ آنسوؤں کا سیلاب ذلیل اور توجیہہ

کرنے کوئی راہ فرار نہیں چھوڑتا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کہا۔ صوفیا مجھے معاف کرو۔ واقعی میں نہ سمجھتا تھا کہ اس ذراسی بات سے تمہیں اتنا ملال ہوگا۔

صوفیا۔ اس کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تم میرے غلام نہیں ہو۔ کہ میرے جا و بیجا احکامات کی تعمیل کرو۔ مجھ میں وہ اوصاف ہی نہیں ہیں جو مردوں کا دل کھینچ لیتے ہیں۔ نہ وہ حسن ہے۔ نہ وہ نمود ہے۔ نہ وہ اندازِ دلکشی ہے۔ ناز و نخرہ کرنا نہیں جانتی۔ روٹھ کر بیٹھ جانا نہیں جانتی۔ مجھے رنج صرف اس بات کا ہے کہ اس آدمی نے تو میرے ایک اشارہ پر میری بات مان لی اور تم اتنی محنت کرنے پر بھی انکار ہی کرتے جاتے ہو۔ وہ بھی اپنے اصولوں کا مضبوط آدمی ہے۔ حکام کی سختیاں برداشت کیں۔ ذلتیں اٹھائیں۔ جیل کے تاریک حجرہ میں قید ہونا پسند کیا۔ لیکن اپنی بات پر قائم رہا۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس کی ضد جائز تھی یا بیجا۔ ہاں وہ اُسے جائز سمجھتا تھا۔ وہ جس بات کو حق سمجھتا تھا اس سے خوف یا لالچ یا سزا کا خیال اسے منحرف نہیں کر سکا۔ لیکن جب میں نے نرمی سے اُسے سمجھایا کہ تمہاری حالت خطرناک ہے۔ تو اس کی زبان سے یہ حسرتناک الفاظ نکلے۔ "مِس صاحب۔ جان کی تو پرواہ نہیں۔ اپنے احباب و رفقاء کی نظروں سے گر کر زندہ رہنا قابلِ تعریف نہیں۔ پھر بھی میں آپ کی بات نہیں ٹالنا چاہتا۔ آپ کے الفاظ میں ثقالت نہیں۔ ہمدردی ہے اور میں ابھی تک بالکل بے حس نہیں ہوا ہوں۔" مگر تمہارے اوپر میرا کوئی جادو نہ چلا۔ شاید تم اس سے بھی زیادہ اپنے اصولوں کے پکے ہو۔ حالانکہ ابھی اس کی آزمائش نہیں ہوئی۔ خیر میں تمہارے اصولوں سے سوتیلا سلوک نہیں کرنا چاہتی۔ سواری کا انتظام کر دو۔ میں کل ہی چلی جاؤں گی۔ اور پھر اپنی نادانیوں سے تمہارے اصولوں کی راہ کا کانٹا بننے کے لئے نہ آؤں گی۔

مسٹر کلارک نے روحانی کرب کے ساتھ کہا۔ ڈارلنگ تم نہیں جانتیں کہ یہ کتنا خطرناک شخص ہے۔ ہم بغاوت سے سازشوں سے جنگ و جدل سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس قسم کے استقلال سے۔ دھن سے۔ میں بھی انسان ہوں۔ صوفیا۔ اگرچہ اس وقت میری زبان سے ایسا دعوے بہت دیدہ لُف نہیں معلوم ہوتا۔ مگر کم ازکم اس مقدم ہستی کے نام پر جس کا میں ایک ادنےٰ عقیدت مند ہوں۔ مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ میں اس نوجوان کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ اس کے آہنی ارادہ کا اس کی ہمت کا اُس کی سچائی کا دل سے معترف ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ وہ ایک باثروت باپ کا بیٹا ہے اور شاہزادوں کی طرح عیش و عشرت میں مصروف رہ سکتا ہے۔ مگر اُس کے یہی پاکیزہ اوصاف ہیں۔ جنہوں نے اس کو ناقابل فتح بنا رکھا ہے۔ ایک فوج کا مقابلہ کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا ایسے محض چند آدمیوں کا جنہیں دُنیا میں کسی کا خوف نہیں ہے۔ میرا قومی فرض میرے ہاتھ باندھے ہوئے ہے۔

صوفیا کو یہ معلوم ہو گیا۔ کہ میری دھمکی بالکل بے اثر نہیں ہوئی۔ مجبوری کا کلمہ زبان پر افسوس کا خیال دل میں آیا اور رضامندی کی پہلی منزل پوری ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت ناز و انداز کا اتنا اثر نہیں ہو سکتا جتنا پُرزور اصرار کا۔ اصول کا پابند انسان ناز و انداز کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا دل مضبوط کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے سامنے اپنی کمزوری کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن بیجا مگر پُرزور اصرار کے مقابلہ میں وہ نکما ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی ایک نہیں چلتی۔

صوفیا نے طنز سے کہا۔ اگر تمہارا قومی فرض تمہیں عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی خودداری عزیز ہے۔ وطن کی ابھی تک کسی نے تعریف یا توضیح نہیں کی۔ مگر عورت کا حفظِ مراتب اُس کا ایک نہایت ضروری جزو

ہے اور ہونا چاہئے۔ اس سے تم انکار نہیں کرسکتے۔
یہ کہہ کر وہ مالکہ کی طرح میز کے پاس گئی اور ایک ڈاکٹ فارم نکالا۔ جس پر ایجنٹ اپنے احکام لکھا کرتا تھا۔

کلارک۔ کیا کرتی ہو صوفیا؟ خدا کے لئے ضد نہ کرو۔

صوفیا۔ "جیل کے داروغہ کے نام حکم لکھوں گی" کہتے ہوئے وہ ٹائپ رائٹر کے پاس بیٹھ گئی۔

کلارک۔ یہ اندھیر نہ کرو صوفیا۔ غضب ہو جائے گا۔

صوفیا۔ میں غضب سے کیا۔ قیامت سے بھی نہیں ڈرتی۔

صوفیا نے ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرتے ہوئے حکم نامہ کو ٹائپ کیا۔ اس نے عمداً ایک لفظ بے موقع ٹائپ کر دیا جیسے ایک باضابطہ حکم نامہ میں نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس پر کلارک نے کہا۔ یہ لفظ نہ رکھو۔

صوفیا۔ کیوں شکریہ ادا نہ کروں؟

کلارک۔ حکم نامہ میں شکریہ کا کیا ذکر؟ کوئی پرائیویٹ خط تھوڑا ہی ہے۔

صوفیا۔ ہاں درست ہے۔ یہ لفظ خارج کئے دیتی ہوں۔ نیچے کیا لکھوں؟

کلارک۔ نیچے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف میرے دستخط ہوں گے۔

صوفیا نے پورا حکم نامہ پڑھ کر سُنا دیا۔

کلارک۔ ڈارلنگ۔ یہ تم بُرا کر رہی ہو۔

صوفیا۔ کچھ پرواہ نہیں۔ میں بُرا ہی کرنا چاہتی ہوں۔ دستخط بھی ٹائپ کر دوں؟ نہیں (مُہر نکال کر) یہ مہر کئے دیتی ہوں۔

کلارک۔ جو چاہو کرو۔ جب تمہیں اپنی ضد کے آگے کچھ بھلا بُرا

نہیں سوجھتا تو میں کیا کہوں۔

صوفیا۔ کہیں اور تو اس کی نقل نہ ہوگی؟

کلارک۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

یہ کہہ کر مسٹر کلارک اپنی خوابگاہ کی طرف جانے لگے۔ صوفیا نے کہا۔ آج اتنی جلدی نیند آگئی؟

کلارک۔ ہاں تھک گیا ہوں۔ اب سوؤں گا۔ تمہارے اس خط سے ریاست میں تہلکہ مچ جائے گا۔

صوفیا۔ ہاں اگر تمہیں اتنا خوف ہے تو میں اسے چاک کئے دیتی ہوں۔ اتنا نہیں گدگدانا چاہتی کہ ہنسی کے بدلے رونا آجائے۔ بیٹھے ہو تو دیکھو یہ لفافہ پھاڑتی ہوں۔

کلارک۔ کرسی پر بے پروائی کے ساتھ بیٹھ گئے اور بولے۔ "لو بیٹھ گیا۔ کیا کہتی ہو؟"

صوفیا۔ کہتی کچھ نہیں۔ شکریہ کا گیت سنتے جاؤ۔

کلارک۔ شکریہ کی ضرورت نہیں۔

صوفیا نے پھر گانا شروع کیا اور کلارک خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ ان کے چہرہ پر پُردرد اشتیاق کا رنگ نمودار تھا جو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ یہ امتحان و آزمائش کب تک؟ اس کھیل کی کوئی حد بھی ہے؟ اس اشتیاق نے انہیں سلطنت کی فکر سے آزاد کر دیا۔ "آہ کاش اب بھی معلوم ہو جاتا کہ تو اتنی بڑی بھینٹ پاکر خوش ہوگئی!" صوفیا نے ان کی آتشِ عشق کو خوب مشتعل کر دیا۔ اور اس وقت یک دم پیانو بند کر دیا۔ پھر بلا کچھ کہے ہوئے اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ کلارک وہیں بیٹھے رہے۔ جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر تنہا کسی درخت کے نیچے بیٹھا ہو۔

صوفیا نے ساری رات اپنی آئندہ زندگی کی تصویر کھینچنے میں بسر

کی مگر قاطر خواہ رنگ نہ دے سکی۔ پہلے رنگ بھر کر اُسے ذرا دور سے دیکھتی تو معلوم ہوتا کہ دھوپ کی جگہ چھاؤں ہے۔ چھاؤں کی جگہ دھوپ ہے۔ سُرخ رنگ زیادہ ہو گیا ہے۔ باغ میں قدرتی دلکشی ہے۔ پہاڑوں پر ضرورت سے زیادہ ہریالی ہے۔ اور دریاؤں میں غیر بادی سکون ہے پھر جُوں جُوں وہ اِن خرابیوں کو درست کرنے لگتی تو سارا منظر ضرورت سے زیادہ بے لُطف۔ اُداس اور مَیلا ہو جاتا۔ اس کی مذہبیت اب اپنی زندگی میں خدا کا ہاتھ دیکھتی تھی۔ اب خدا ہی اس کا محرک تھا۔ وہ اپنے نیک و بد اعمال کے نیکی بدی سے مبرا تھی۔

علی الصباح وہ بستر سے اٹھی تو مسٹر کلارک سو رہے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس نے شوفر کو بُلا کر موٹر کی تیاری کا حکم دیا اور ایک لمحہ میں جیل کی طرف روانہ ہوئی۔ جیسے کوئی لڑکا اسکول سے گھر کی طرف دوڑے۔

اس کے جیل پہنچتے ہی ہل چل سی مچ گئی۔ چوکیدار آنکھیں ملتے ہوئے دوڑ دوڑ کر وردیاں پہننے لگے۔ داروغہ جی نے جلدی میں اُلٹی چپکن پہنی اور بے تحاشا دوڑے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ننگے پاؤں بھاگے۔ یاد نہ آیا کہ رات کو جوتے کہاں رکھے تھے اور اس وقت تلاش کرنے کی فرصت نہ تھی۔ دنے سنگھ زیادہ رات گئے سوئے تھے اور ابھی تک خوابِ شیریں کے مزے لے رہے تھے۔ کمرہ میں مینہ کی شمولیت سے تر و تازہ ہوا آ رہی تھی۔ نرم قالین بچھا ہوا تھا۔ ابھی تک رات کا لیمپ بھی نہ بجھا تھا۔ گویا دنے کی بیقراری کی شہادت دے رہا تھا۔ صوفیا کا رومال ابھی تک دنے کے سرہانے پڑا ہوا تھا۔ اور اس میں سے بڑھیا خوشبو نکل رہی تھی۔ داروغہ نے حاضر ہو کر صوفیا کو سلام کیا۔ اور وہ ان کو ساتھ لئے دنے کے کمرہ میں گئی۔ دیکھا تو نیند

میں ہیں۔ رات کی میٹھی نیند سے چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہے۔ لبوں پر ہلکی مسکراہٹ ہے۔ گویا پھول پر شعاعیں چمک رہی ہوں۔ صوفیا کو ونے آج تک کبھی اتنے خوبصورت نہ معلوم ہوئے تھے۔

صوفیا نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ رات کو اس کی کیسی حالت تھی؟

ڈاکٹر۔ حضور کئی بار غش آئے مگر میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہاں سے نہیں ہٹا۔ جب یہ سو گئے تو میں کھانے کے لئے چلا گیا۔ اب تو ان کی حالت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

صوفیا۔ ہاں مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ آج وہ زردی نہیں ہے میں اب سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اسے کسی دوسری جگہ میں کیوں نہ بھجوا دوں۔ یہاں کی آب و ہوا اس کے موافق نہیں ہے۔ مگر آپ لوگوں کے سامنے وہ اپنے دل کی باتیں نہ کہے گا۔ آپ لوگ ذرا باہر چلے جائیں تو میں اسے جگا کر دریافت کر لوں اور اس کی حرارت کی بھی جانچ کر لوں۔ (مسکرا کر) ڈاکٹر صاحب میں بھی اس علم سے واقف ہوں۔ نیم حکیم ہوں لیکن خطرہ جان نہیں۔

جب کمرہ میں تخلیہ ہو گیا تو صوفیا نے ونے کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پیشانی کو سہلانے لگی۔ ونے کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اس طرح جھپٹ کر اٹھا جیسے نیند میں کسی دریا میں پھسل پڑا ہو۔ ثواب کا ثمرہ شاید ہی کسی کو اس قدر جلد ملا ہو۔

صوفیا نے مسکرا کر کہا۔ "تم ابھی تک سو رہے ہو۔ میری آنکھوں کی طرف دیکھو جو رات بھر نہیں جھپکیں۔"

ونے۔ "دنیا کا سب سے قیمتی جواہر پا کر بھی میٹھی نیند نہ سوؤں۔ تو مجھ سا بد نصیب اور کون ہوگا؟"

صوفیا۔ میں تو اس سے بھی زیادہ بیش قیمت جواہر پا کر بھی تفکرات

میں مبتلا ہو گئی۔ اب یہ خوف ہے۔ کہ کہیں وہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ نیند کا لطف ناداری میں ہے جب کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اچھا اب تیار ہو جاؤ۔

ونے۔ کس بات کے لئے؟

صوفیا۔ بھول گئے؟ اس تاریکی سے روشنی میں جانے کے لئے۔ اس کال کوٹھڑی سے جدا ہونے کے لئے۔ میں موٹر لائی ہوں۔ تمہاری رہائی کا حکم نامہ میری جیب میں ہے۔ کوئی ذلت آمیز شرط نہیں ہے۔ صرف اودے پور کی ریاست میں بلا اجازت نہ داخل ہونے کا وعدہ لیا گیا ہے۔ آؤ چلیں۔ میں تمہیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچا کر لوٹ آؤں گی۔ تم دہلی پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی میں تم سے وہیں آملوں گی۔ اور پھر ہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

ونے سنگھ کی حالت اس بچے کی سی تھی جو مٹھائیوں کے خوانچہ کو دیکھتا ہے مگر اس خوف سے کہ ماں مارے گی منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مٹھائیوں کا ذائقہ یاد کر کے اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ رس گلّے کتنے رسیلے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ دانت کسی مٹھاس کے گنڈ میں پھسل پڑے۔ امرتیاں کتنی کرکری ہیں۔ ان میں رس بھرا ہی ہو گا۔ گلاب جامن کتنی سوندھی ہوتی ہے کہ کھاتا ہی چلا جائے۔ مٹھائیوں سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ماں پیسے نہ دے گی۔ پیسے ہی نہ ہوں گے۔ وہ کس سے مانگے گی۔ زیادہ ضد کروں گا۔ تو رونے لگے گی۔ خیر ونے سنگھ آبدیدہ ہو کر بولے۔ "صوفیا میں بدنصیب شخص ہوں۔ مجھے اسی حالت میں رہنے دو۔ میرے ساتھ اپنی زندگی برباد نہ کرو۔ مجھے قسمت نے رنج اٹھانے ہی کے لئے بنایا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم......

صوفیا نے قطع کلام کر کے کہا۔ "ونے میں مصیبت ہی کی بھوکی ہوں۔ اگر تم عیش پسند ہوتے۔ اگر تمہاری زندگی عیش و عشرت کی زندگی ہوتی۔

اگر تم نفس کے غلام ہوتے تو شاید میں تمہاری طرف سے منہ پھیر لیتی۔ تمہارے حوصلہ و ایثار ہی نے مجھے تمہاری طرف کھینچا ہے۔"

دِیتے۔ اماں جی کو تم جانتی ہو۔ وہ مجھے کبھی معاف نہ کریں گی۔

صوفیا۔ تمہاری محبت کا سہارا پاکر میں ان کے غصہ کو برداشت کروں گی۔ جب وہ دیکھیں کہ میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بلکہ تمہارے پیچھے اڑنے والی گرد ہوں تو ان کا دل پگھل جائے گا۔

وِنے نے صوفیا کو محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم ان کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ وہ ہندو دھرم پر جان دیتی ہیں۔"

صوفیا۔ میں بھی ہندو دھرم پر جان دیتی ہوں۔ جو روحانی سکون مجھے اور کہیں نہ ملا وہ گوپیوں کی داستان الفت میں مل گیا۔ وہ پریم کا اوتار جس نے گوپیوں کو پریم کا رس چکھایا۔ جس نے کبجا کی ناؤ پار لگائی۔ جس نے پریم کا کھیل دکھانے کے لئے ہی سنسار کو اپنے قدموں سے پاک بنایا اُسی کی داسی بن کر جاؤں گی تو وہ کون سچا ہندو ہے جو مجھ سے بیرخی کرے گا۔

ونے نے مسکرا کر کہا۔" اس چھلیا نے تم پر جادو ڈال دیا؟ میرے خیال میں تو کرشن کی داستان محبت صرف ان کے بھگتوں کی خیالی ایجاد ہے۔"

صوفیا۔ ہو سکتی ہے یسوع کا وجود بھی تو خیالی کہا جاتا ہے۔ شیکسپیئر کا وجود بھی تو خیالی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کالیداس کی سرشت آب و گل سے بنی تھی؟ لیکن ان ہستیوں کے خیالات پر بھی ہم ان کی پاک شہرت کے معتقد ہیں اور واقعی ہستیوں کی شہرت بہ نسبت زیادہ تر۔ شاید اسی لئے کہ اوّل الذکر کا وجود غلیظ عناصر سے نہیں بلکہ لطیف تخیل سے ہوا ہے۔ آدمیوں کے نام ہوں یا نہ ہوں مگر ان کی معیاروں کے نام ضرور ہیں۔ اُن میں سے ہر شخص انسانی زندگی کا ایک ایک معیار ہے۔

ونے۔ صوفیا میں تم سے دلائل میں پیش نہ پا سکوں گا۔ مگر میرا دل

کہتا ہے کہ میں تمہارے حسنِ ظن سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ تم میری اصلی صورت نہیں دیکھ رہی ہو۔ کہیں اس پر نگاہ پڑ جائے تو تم میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرو گی۔ تم میرے پیروں کی زنجیر جا ہے نہ بن سکو مگر میری دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے والی ہوا ضرور بن جاؤ گی۔ ماں نے بہت سوچ بچار کر مجھے یہ بیڑیاں دی ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ ایک مرتبہ میں اس پابندی سے آزاد ہوا تو نفس مجھے اس قدر تیزی سے بہالے جائے گا کہ پھر شاید میرے وجود کا پتہ ہی نہ لگے۔ صوفیا مجھے اس سخت ترین آزمائش میں نہ ڈالو۔ میں دراصل بہت کمزور اور نفس پرور شخص ہوں۔ تمہاری اخلاقی بلندی مجھے خائف کر رہی ہے۔ ہاں مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کرو کہ آج ہی یہاں سے کسی دوسرے مقام کو روانہ ہو جاؤں۔

صوفیا۔ کیا تم مجھ سے اتنی دُور بھاگنا چاہتے ہو؟

ونے۔ نہیں نہیں۔ اس کا اور ہی سبب ہے۔ نہ جانے کیونکر یہ حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ کہ جسونت نگر ایک ہفتہ کے لئے خالی کر دیا جائے۔ کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سردار صاحب نے تمہاری حفاظت کے لئے یہ بند و بست کیا ہے۔ مگر لوگ تم کو بدنام کر رہے ہیں۔

صوفیا اور کلارک کی باہمی بحث سُن کر سردار نیلکنٹھ نے فوراً یہ حکم جاری کر دیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ میم صاحب کے سامنے صاحب کی ایک نہ چلے گی اور ونے کو رہا کر دینا پڑے گا۔ اس لئے پہلے ہی سے حفظِ امن کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ صوفیا نے متحیر ہو کر پوچھا۔ کیا ایسا حکم دیا گیا ہے؟

ونے۔ ہاں مجھے خبر ملی ہے۔ کوئی چپڑاسی کہتا تھا۔

صوفیا۔ مجھے مطلقاً خبر نہیں ہے۔ میں ابھی جاکر پتہ لگاتی ہوں اور اس حکم کو منسوخ کرائے دیتی ہوں والیسی زیادتی ریاستوں کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ یہ سب تو ہو جائے گا۔ مگر تم کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

ونے۔ نہیں صوفیا۔ مجھے معاف کرو۔ ووّر کا شہر انتظر قریب آ کر ریگ کا میدان بن جاتا ہے۔ تم میرے لئے ایک زندہ معیار ہو۔ تمہاری محبت کا مزہ میں تخیل ہی کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ میں تمہاری نظروں سے نہ گر جاؤں اپنے کو کہاں تک پوشیدہ رکھوں گا؟ تمہیں پاکر پھر میری زندگی بے لطف ہو جائے گی۔ پرستش اور حصول کے لئے پھر میرے پاس کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ صوفیا۔ میری زبان سے نہ جانے کیا کیا فضول باتیں نکل رہی ہیں۔ مجھے خود شک ہو رہا ہے کہ میں اپنے ہوش میں ہوں یا نہیں۔ فقیر تخت شاہی پر بیٹھ کر اگر پریشان خاطر ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ میری تم سے یہی آخری التجا ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔

صوفیا۔ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔

ونے۔ کم از کم مجھے یہاں سے جانے کے لئے مجبور نہ کرو۔ کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں یہاں سے نہ جاؤں گا۔ شہر کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں ہے کہ میں عوام کو قابو میں رکھ سکوں گا۔

صوفیا نے شانت سے کہا جیسی تمہاری مرضی۔ میں جتنا تمہیں وہ مزاج سمجھتی تھی۔ تم اس سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو۔ میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں اور اسی لئے کہتی ہوں کہ جیسی تمہاری مرضی۔ مگر شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ نوجوان عورت کا دل بچوں کی طرح ہوتا ہے۔ اسے جس چیز کے لئے منع کرو اسی کی طرف دوڑے گا۔ اگر تم اپنی تعریف کرتے اپنے کاموں کی سراہنا کرتے تو شاید میں تمہاری جانب سے بدشوق ہو جاتی۔ اپنے

عیوب و نقائص کو ظاہر کر کے تم نے مجھے اور بھی فریفتہ کر لیا ہے۔ تم مجھ سے ڈرتے ہو۔ اس لئے میں تمہارے سامنے نہ آؤں گی پر رہوں گی تمہارے ہی ساتھ۔ جہاں جہاں تم جاؤ گے میں سایہ کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گی۔ محبت ایک خیالی وجود ہے۔ خیال ہی سے اس کی پرورش ہوتی ہے۔ خیال ہی سے وہ زندہ رہتا ہے اور خیال ہی سے وہ فنا بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی مادی وجود نہیں ہے۔ تم میرے ہو۔ یہ یقین میری محبت کو زندہ اور آرزومند رکھنے کے لئے کافی ہے۔ جس دن اس یقین کی جڑ ہل جائے گی اسی دن اس زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر تم نے یہی فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ اس قید خانہ میں رہ کر تم اپنی زندگی کے مقصد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ پورا کر سکتے ہو تو میں اس فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ اس بے نفسی نے میرے دل میں تمہاری عزت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔ کل شام کو پھر آؤں گی۔ میں نے اس حکم نامہ کے لئے جتنا "تریا چرتر" کیا ہے۔ وہ تم سے بتلا دوں۔ تو تم تعجب کرو گے۔ تمہاری ایک بہن نے میری ساری کوشش پر پانی پھیر دیا۔ کلارک کہے گا میں کہتا تھا کہ وہ راضی نہ ہو گا۔ شاید طعنے دے۔ مگر کچھ مضایقہ نہیں کوئی بہانہ کر دوں گی۔

یہ کہتے کہتے صوفیا کے پُر اشتیاق لب ونے سنگھ کی طرف جھکے۔ مگر وہ کائی پر پھسلنے والے آدمی کی طرح گرتے گرتے سنبھل گئی۔ اُس نے آہستہ سے ونے سنگھ کا ہاتھ دبایا اور دروازہ کی طرف چلی۔ مگر باہر جا کر پھر واپس آئی اور نہایت لجاجت سے بولی "ونے تم سے ایک بات پوچھتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم صاف صاف بتلا دو گے۔ میں کلارک کے ساتھ یہاں آئی۔ اُس سے چالاکی برتی۔ اُسے جھوٹی اُمیدیں دلائیں اور اب بھی اُسے مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہوں۔ تم اسے بیجا تو نہیں خیال کرتے؟ تمہاری نگاہ میں میں قابلِ ملامت تو نہیں

بچوں ؟"

فرنے کے پاس اس کا ایک ہی ممکن جواب تھا صوفیا کا رویہ اس کو قابلِ اعتراض معلوم ہوتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اُس نے اس بات کو تعجب کے لہجہ میں ظاہر کردیا تھا۔ مگر اس وقت وہ اس خیال کو ظاہر نہ کرسکا۔ یہ کتنی سخت ناانصافی ہوتی۔ کتنی بڑی بے رحمی۔ وہ جانتا تھا کہ صوفیا نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ ایک مذہبی خیال کے تابع ہوکر۔ وہ اُسے خدائی تحریک سمجھ رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ نااُمید ہوگئی ہوتی۔ ایسی حالت میں کھری اور ٹھوس سچائی سے اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ عقیدت مندانہ سرگرمی سے بولے۔ "صوفیا تم یہ سوال کرکے اپنے اوپر اور اس سے زیادہ میرے اوپر ظلم کررہی ہو۔ میرے لئے تم نے اب تک تیاگ (ترک) ہی تیاگ کئے ہیں۔ تم نے عزت۔ ثروت۔ اصول کسی ایک کی بھی پرواہ نہیں کی۔ دنیا میں مجھ سے بڑھ کر احسان فراموش اور کوئی نہ ہوگا۔ اگر میں تمہارے اس پریم کی بے وقعتی کروں"۔

یہ کہتے کہتے وہ رُک گئے۔ صوفیا بولی۔ "کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟ رُک کیوں گئے؟ یہی نہ کہ تمہیں میرا کلارک کے ساتھ رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جس دن مجھے نااُمیدی ہوجائے گی کہ میں اپنی مغالطہ آمیز روش سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اسی دن میں کلارک کو پیروں سے اس طرح ٹھکرا دوں گی۔ اس کے بعد تم مجھے پریم کی جوگن کے بھیس میں دیکھو گے۔ جس کی زندگی کا واحد مقصد ہوگا۔ تمہارے اوپر نثار ہوجانا"۔

(۲۷)

نایک رام محلہ والوں سے رخصت ہوکر اودے پور روانہ ہوئے۔

ریل کے مسافروں کو ان کی بہت جلد عقیدت ہو گئی۔ کسی کو تمباکو مل کر کھلاتے۔ کسی کے بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔ جس مسافر کو دیکھتے کہ جگہ نہیں مل رہی۔ ادھر اُدھر بھٹک رہا ہے۔ جس کمرہ میں جاتا ہے۔ وہی دھکے کھاتا ہے۔ اس کو بلا کر اپنی بغل میں بٹھا لیتے۔ پھر ذرا دیر میں اس سے سوالوں کا تانتا باندھ دیتے:۔ کہاں مکان ہے؟ کہاں جاتے ہو؟ کتنے لڑکے ہیں؟ کیا کاروبار ہوتا ہے؟ ان سوالات کا سلسلہ اس التجا پر ختم ہوتا:۔ میرا نام نایک رام پنڈا ہے۔ جب کبھی کاشی آؤ۔ میرا نام پوچھ لو۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔ دو دن چار دن۔ مہینے دو مہینے جب تک جی چاہے آرام سے وہیں ٹھہرو۔ گھر دوار۔ نوکر چاکر۔ سب حاضر ہیں۔ گھر کا سا آرام پاؤ گے۔ وہاں سے چلتے وقت جو چاہے دے دو۔ نہ ہو نہ دو۔ گھر آ کر بھیج دو۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ کبھی مت سوچو۔ کبھی روپے نہیں ہیں۔ پھر چلیں گے۔ شُبھ کارج کے لئے مہورت نہیں دیکھی جاتی۔ ریل کا کرایہ لے کر چل کھڑے ہو۔ کاشی میں تو میں موجود ہی ہوں۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ کام پڑ جائے تو جان لڑا دیں۔ تیرتھ جاترا کے لئے ٹال مٹول مت کرو۔ کوئی نہیں جانتا کب بڑی جاترا کرنی پڑ جائے۔ دُنیا کے جھگڑے تو لگے ہی رہیں گے۔

دہلی پہنچے تو کئی نئے مسافر گاڑی میں آئے۔ آریہ سماج کے کسی جلسہ میں جا رہے تھے۔ نایک رام نے اُن سے بھی وہی جرح شروع کی۔ یہاں تک کہ ایک مہاشے گرم ہو کر بولے:۔۔۔ تم ہمارے باپ دادا کا نام پوچھ کر کیا کرو گے؟ ہم تمہارے پھندے میں پھنسنے والے نہیں۔ یہاں گنگا جی کے قائل نہیں۔ نہ تو کاشی ہی کو بیکنٹھ سمجھتے ہیں۔

نایک رام ذرا بھی خفیف نہیں ہوئے۔ مسکرا کر بولے۔۔۔ بابوجی آپ آریہ ہو کر ایسا کہتے ہیں۔ آریہ لوگوں نے ہی تو ہندو دھرم کی لاج رکھی۔ نہیں تو اب تک سارا دیس مسلمان کرستان ہو گیا ہوتا۔ ہندو دھرم

کے اودھارک ہوکر آپ کاشی کو بھلا کیسے نہ مانیں گے؟ اسی نگری میں راجہ ہرلیشچندر کی پریچھا (آزمائش) ہوئی تھی۔ وہیں بدھ بھگوان نے اپنا دھرم چکر چلایا تھا۔ وہیں شنکر بھگوان نے منڈن مسر سے ساستر ارتھ کیا تھا۔ وہاں جینی آتے ہیں۔ بدھ آتے ہیں۔ ولشنو آتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کی نگری نہیں ہے۔ سارے سنسار کی نگری ہے۔ دور دور کے لوگ بھی جب تک کاشی جی کے درشن نہ کریں۔ ان کی جاترا سپھل نہیں ہوتی۔ گنگا جی مکتی دیتی ہیں۔ پاپ کاٹتی ہیں۔ یہ سب تو گنواروں کو بہلانے کی باتیں ہیں۔ اُن سے کہو کہ چل کر اس پونر نگری کو دیکھ آؤ۔ جہاں یگ یگ پر آریہ جاتی کے نشان ملتے ہیں۔ جس کا نام لیتے ہی سینکڑوں مہاتماؤں۔ رشیوں منیوں کی یاد آجاتی ہے۔ تو اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی۔ پر اصل میں بات یہی ہے۔ کاشی کا مہاتم اس لئے ہے کہ وہ آریہ جاتی کا جیتا جاگتا پران ہے۔

اُن اصحاب کو پھر کاشی کی مذمت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے اور نایک رام کی ذہنی واقفیت کے قائل ہو گئے۔ حالانکہ نایک رام نے یہ چند فقرے ایسے موقعوں کے لئے کسی مقرر کی تقریر سے چن کر رٹ لئے تھے۔

ریل کے اسٹیشنوں پر وہ ضرور اُترتے اور ریل کے ملازموں سے تعارف پیدا کرتے۔ کوئی انہیں پان کھلا دیتا۔ کوئی کچھ ناشتہ کرا دیتا۔ سارا سفر ختم ہو گیا۔ مگر وہ لیٹے تک نہیں۔ ذرا بھی آنکھ نہ جھپکی۔ جہاں دو مسافروں کو لڑتے جھگڑتے دیکھتے۔ آپ فوراً ثالث بن جاتے۔ اور ان میں میل کرا دیتے۔ تیسرے روز وہ اودے پور پہنچ گئے اور ریاست کے حاکموں اور اہلکاروں سے ملتے جلتے گھومتے پھرتے جسونت نگر میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ مسٹر کلارک کا ڈیرا پڑا ہوا ہے۔ باہر سے آنے جانے والوں کی بڑی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ شہر کا پھاٹک بند سا ہے۔ لیکن

پنڈے کو کون روکتا؟ شہر میں پہنچ کر سوچنے لگے۔ ونے سنگھ سے کیونکر ملاقات ہو؟ رات کو تو ایک دھرم شالہ میں ٹھہرے۔ سویرا ہوتے ہی جیل کے داروغہ کے مکان میں جا پہنچے۔ داروغہ جی صوفیا کو بھیج کر آئے تھے۔ اور نوکر پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے حقہ کیوں نہیں بھرا۔ اتنے میں برآمدہ میں پنڈا جی کی آہٹ پاکر باہر نکل آئے۔ انہیں دیکھتے ہی نایک رام نے گنگا جل کی شیشی نکالی اور ان کے سر پر جل چھڑک دیا۔

داروغہ جی نے ذرا رکھائی سے کہا۔ "کہاں سے آتے ہو؟"

نایک رام۔ مہاراج استھان تو پراگ راج ہے پر آرہا ہوں بڑی دور سے۔ جی میں آیا ادھر بھی ججمانوں کو آسیرواد دیتا چلوں۔

داروغہ جی کا لڑکا جس کی عمر ابھی ۱۴-۱۵ سال کی تھی نکل آیا۔ نایک رام نے اسے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ گویا اس کے دیدار سے دلی مسرت حاصل ہو رہی ہے اور پھر داروغہ جی سے بولے۔ "یہ آپ کے چرنجیو پتر ہیں نا؟ پتا پتر کی صورت کیسی ملتی ہے کہ دور ہی سے پہچان لے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب کیا پڑھتے ہو؟"

لڑکے نے کہا۔ "انگریزی پڑھتا ہوں۔"

نایک رام۔ یہ تو میں ہی سمجھ گیا تھا۔ آج کل تو اسی ودیا کا دور دورہ ہے۔ راج ودیا ٹھہری۔ کس درجا (دفعہ) میں پڑھتے ہو بھیا؟

داروغہ۔ ابھی تو حال ہی میں انگریزی شروع کی ہے۔ اس پر بھی پڑھنے میں جی نہیں لگاتے۔ ابھی تھوڑی ہی پڑھی ہے۔

لڑکے نے سمجھا میری تحقیر ہو رہی ہے۔ بولا۔ "تم سے تو زیادہ ہی پڑھا ہوں۔"

نایک رام۔ اس کی کوئی چنتا نہیں سب آجائے گا۔ ابھی ان کی اوستھا (عمر) ہی کیا ہے۔ بھگوان کی اچھا (مرضی) ہوگی تو کل (خاندان)

کا نام روشن کر دیں گے۔ آپ کے گھر پر کچھ جگہ جمین بھی ہے؟

داروغہ جی نے اب سمجھا۔ زود فہمی سے نابلد تھے۔ اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے ــــ ہاں چیتوڑ کے علاقہ میں کئی گاؤں ہیں۔ پرانی جاگیر ہے۔ میرے پتاجی مہارانا کے درباری تھے۔ ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں مہارانا پرتاپ نے میرے بزرگوں کو یہ جاگیر بخشی تھی۔ اب بھی مجھے دربار میں کرسی ملتی ہے اور پان الائچی سے خاطر کی جاتی ہے۔ ضرورت ہوتی ہے۔ تو مہارانا کے یہاں سے آدمی آتا ہے۔ بڑا لڑکا مرا تھا۔ تو مہارانا نے ہمدردی کا خط بھیجا تھا۔

نایک رام۔ جاگیرداری کا کیا کہنا۔ جو جاگیردار وہی راجہ۔ نام کا فرق ہے۔ اصلی راجہ تو جاگیردار ہی ہوتے ہیں۔ رانا تو نام کے ہیں۔

داروغہ۔ راج گھرانے سے برابر آمد ورفت قائم ہے

نایک رام۔ ابھی ان کی کہیں بات چیت تو نہیں ہو رہی ہے؟

داروغہ۔ اجی لوگ جان تو کھا رہے ہیں۔ روز ایک نہ ایک جگہ سے پیغام آتا رہتا ہے۔ مگر میں تو سب کو ٹکا سا جواب دے دیتا ہوں۔ جب تک پڑھ لکھ نہ لے۔ اس وقت تک اس کی شادی کر دینا حماقت ہے۔

نایک رام۔ یہ آپ نے پکّی بات کہی۔ جتھارتھ (اصل) میں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ بڑے آدمیوں کی بدھی (عقل) بھی بڑی ہی ہوتی ہے۔ پر لوک ریت (دنیاوی رواج) پر چلنا ہی پڑتا ہے۔ اچھا اب آگیا (اجازت) دیجیئے۔ کئی جگہ جانا ہے۔ جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں۔ کسی کو جواب نہ دیجیئے گا۔ ایسی کنیا آپ کو نہ ملے گی۔ اور نہ ایسا اوتم کُل ہی پایئے گا۔

داروغہ۔ واہ واہ۔ اتنی جلد چلے جایئے گا۔ کم سے کم بھوجن تو کر لیجئے۔ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ آپ کس کا سندیسہ (پیغام) لائے ہیں؟

وہ کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟

نایک رام۔ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ پر ابھی بتانے کا حکم نہیں ہے۔

داروغہ نے لڑکے سے کہا، "تلک! اندر جاؤ۔ پنڈت جی کے لئے پان بنوا لاؤ۔ کچھ ناشتہ بھی لیتے آنا!"

یہ کہہ کر تلک کے پیچھے پیچھے خود اندر گئے اور بیوی سے بولے"۔ لو کہیں سے تلک کے بیاہ کا سندیسہ آیا ہے۔ پان طشتری میں بھیجنا۔ ناشتہ کے لئے کچھ نہیں ہے؟ وہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ گھر میں کتنی ہی چیز آئے۔ دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملتی۔ نہ جانے کہاں کے مربھو کے جمع ہو گئے ہیں۔ ابھی کل ہی ایک قیدی کے گھر سے مٹھائیوں کا ایک پورا تھال آیا تھا۔ کیا ہو گیا؟"

بیوی۔ انہیں لڑکوں سے پوچھو کیا ہو گیا۔ میں تو ہاتھ سے چھونے کی بھی قسم کھاتی ہوں۔ یہ کوئی صندوق میں بند رکھنے کی چیز تو ہے نہیں۔ جس کا جب جی چاہے نکال کر کھاتا ہے۔ کل سے کسی نے روٹیوں کی طرف نہیں دیکھا۔

داروغہ۔ تو آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ جو چیز گھر میں آئے اُسے احتیاط سے رکھو۔ احتیاط سے خرچ کرو۔ وہ لونڈا کہاں گیا؟

بیوی۔ تمہیں نے تو ابھی اُسے ڈانٹا تھا۔ بس چلا گیا۔ کہہ گیا ہے کہ گھڑی گھڑی کی ڈانٹ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔

داروغہ۔ یہ اور مصیبت ہوئی۔ یہ چھوٹے آدمی روز بروز چڑھتے جاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک ان کی خوشامد کرے۔ اب کون بازار سے مٹھائیاں لائے؟ آج تو کسی سپاہی کو بھی نہیں بھیج سکتا۔ نہ جانے

سر سے کب یہ بلا ٹلے ، ؟ تم چلے جاؤ ۔ تلک !
تلک ۔ شربت کیوں نہیں پلا دیتے ؟
بیوی ۔ شکر بھی تو نہیں ہے ۔ چلے کیوں نہیں جاتے ؟
تلک ۔ ہاں چلے کیوں نہیں جاتے ! لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے کہ حضرت مٹھائیاں لئے جاتے ہیں ۔
داروغہ ۔ تو اس میں کیا گالی ہے ؟ کسی کے گھر چوری تو نہیں کر رہے ہو ۔ بُرے کام سے لجانا چاہئے ۔ اپنا کام کرنے میں کیا لاج ؟
تلک یوں تو لاکھ سر ٹیکنے پر بھی بازار نہ جاتے ۔ مگر اس وقت انہیں اپنی شادی کی خوشی سُنی چلے گئے ۔ داروغہ جی نے طشتری میں پان رکھے اور نایک رام کے پاس لائے ۔
نایک رام ۔ سرکار آپ کے گھر پان نہیں کھاؤں گا ۔
داروغہ ۔ اجی ۔ ابھی کیا ہرج ہے ؟ ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی ۔
نایک رام ۔ میرا من بیٹھ گیا تو سب ٹھیک سمجھئے ۔
داروغہ ۔ یہ تو آپ نے بُری بیچ لگائی ۔ یہ بات نہیں ہو سکتی ۔ کہ آپ ہمارے دروازہ پر آئیں اور ہم بغیر کافی خاطر مدارت کئے آپ کو چلے جانے دیں ۔ میں تو مان بھی جاؤں گا پر تلک کی ماں کسی طرح نہ مانیں گی ۔
نایک رام ۔ اسی سے تو میں یہ سندیسہ لے کر آنے سے انکار کر رہا تھا ۔ جب پچھلے مالس کے دروازے پر جائے وہ بنا بھوجن اور دچھنا کے گلا نہیں چھوڑتا ۔ اسی سے تو آج کل کچھ لباڑیوں نے بَرکھوجنے کو ایک دھندا بنا لیا ہے ۔ اس سے یہ کام کرتے اور بھی سکوچ (تامل) ہوتا ہے ۔
داروغہ ۔ ایسے دغا باز یہاں روز ہی آیا کرتے ہیں ۔ مگر میں تو پانی کو بھی نہیں پوچھتا ۔ جیسا منہ ہوتا ہے ویسا بیڑا ملتا ہے ۔ یہاں

تو آدمی کو ایک نظر دیکھا اور اس کے رگ و ریشے سے واقف ہو گیا۔ آپ یوں نہ جانے پائیں گے۔

نایک رام۔ میں جانتا کہ آپ اس طرح پیچھے پڑ جائیں گے تو لبا ڑیوں ہی کی سی بات چیت کرتا۔ گلا تو چھوٹ جاتا

داروغہ۔ یہاں ایسا نادان نہیں ہوں۔ اُڑتی چڑیا پہچانتا ہوں۔

نایک رام ڈٹ گئے۔ دوپہر ہوتے ہوتے بچے بچے سے ان کی دوستی ہو گئی۔ داروغائن نے بھی پالاگن کہلا بھیجا۔ ادھر سے بھی آشیرواد دیا گیا۔ داروغہ تو دس بجے دفتر چلے گئے۔ نایک رام کے لئے گھر میں پوڑیاں۔ کچوریاں۔ رائیتہ۔ دہی۔ چٹنی۔ حلوہ۔ یہ سب چیزیں بڑی ترکیب سے تیار کی گئیں۔ پنڈت جی نے اندر جاکر بھوجن کیا۔ داروغائن نے خود پنکھا جھلا۔ پھر تو انہوں نے اور بھی رنگ جمایا۔ لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ دیکھے۔ داروغائن نے بھی لجاتے ہوئے ہاتھ دکھایا۔ پنڈت جی نے ریکھاؤں (خط) کی پرکھ کے علم میں اچھی واقفیت دکھلائی۔ اور بھی دھاک جم گئی۔ شام کو داروغہ جی دفتر سے لوٹے تو پنڈت جی شان سے مسند لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پڑوس کے کئی آدمی انہیں گھیرے کھڑے تھے۔ داروغہ نے کرسی پر لیٹ کر کہا۔۔۔ یہ عہدہ تو اتنا اونچا نہیں اور نہ مشاعرہ ہی کچھ ایسا زیادہ ملتا ہے۔ مگر کام اتنی ذمہ داری کا ہے کہ معتبر اشخاص کو ہی دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے آدمی کسی نہ کسی جرم کے لئے سزا پاکر آتے ہیں۔ اگر چاہوں تو ان کے گھر والوں سے ایک ایک ملاقات کے لئے ہزاروں روپے وصول کر لوں۔ لیکن اپنا یہ دستور نہیں ہے۔ جو سرکار سے ملتا ہے اسی کو بہت سمجھتا ہوں۔ کسی بیکل شخص کا تو یہاں گھڑی بھر بھی نباہ نہ ہو۔ ایک سے ایک خونی ڈکیت بدمعاش آتے رہتے ہیں۔ جن کے

ہزاروں مددگار ہوتے ہیں۔ چاہیں تو دن دہاڑے جیل کو لٹوا دیں مگر میں ایسے ڈھنگ سے ان پر رعب جماتا ہوں کہ بدنامی بھی نہ ہو اور نقصان بھی نہ اٹھانا پڑے۔ اب آج ہی کل دیکھیئے۔ کاشی کے کروڑپتی راجہ ہیں مہاراجہ بھرت سنگھ۔ اُن کا لڑکا بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہو کر آیا ہے۔ حکام تک اس کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بڑے صاحب کی میم صاحبہ دن میں دو دو بار اس کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لاتی ہیں اور سردار شیلکنٹھ داؤ بھی برابر خطوط کے ذریعہ اس کے حالات خیر و عافیت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ چاہوں تو مہاراجہ بھرت سنگھ سے ایک ملاقات کے لئے لاکھوں روپے اینٹھ لوں۔ مگر یہ اپنا شعار نہیں۔

نایک رام۔ اچھا کیا راجہ بھرت سنگھ کا لڑکا یہیں قید ہے ؟

داروغہ۔ اور یہاں سرکار کو کس پر اتنا اعتبار ہے ؟

نایک رام۔ آپ جیسے مہاتماؤں کے درشن دُرلبھ ہیں۔ مگر بُرا نہ مانئے تو کہوں۔ بال بچوں کا بھی دھیان رکھنا چاہئے۔ آدمی گھر سے چار پیسے کمانے ہی کے لئے نکلتا ہے۔

داروغہ۔ ارے تو کیا کوئی قسم کھائی ہے پر کسی کا گلا نہیں دباتا۔ چلئے آپ کو جیل خانہ کی سیر کراؤں۔ بڑی صاف ستھری جگہ ہے میرے یہاں تو جو کوئی مہمان آتا ہے اس کو وہیں ٹھہرا دیتا ہوں۔ جیل کے داروغہ کی دوستی سے جیل کی ہوا کھانے کے سوا اور کیا ملے گا ؟

یہ کہہ کر داروغہ جی مسکرائے۔ وہ نایک رام کو کسی حیلہ سے ٹالنا چاہتے تھے۔ نوکر بھاگ گیا تھا۔ قیدیوں اور چپڑاسیوں سے کام لینے کا موقعہ نہیں تھا۔ انہوں نے سوچا۔ اپنے ہاتھ چلم بھرنی پڑے گی۔ بستر بچھانا پڑے گا۔ پانی لانا پڑے گا۔ عزت میں بٹہ لگے گا۔ گھر کا پردہ فاش ہو جائے گا۔ انہیں وہاں ٹھہرا دوں گا۔ کھانا بھجوا دوں گا۔ پردہ ڈھکا

رہ جائے گا۔

نایک رام۔ کون جانے کبھی آپ کی سیوا (خدمت) میں آنا ہی پڑے۔ پہلے سے ٹھور ٹھکانا دیکھ لوں۔ مہاراجہ صاحب کے لڑکے نے کون سا قصور کیا تھا؟

داروغہ۔ قصور کچھ نہیں تھا۔ بس حاکموں کی ضد ہے۔ یہاں دیہاتوں میں گھوم گھوم کر لوگوں کو سمجھاتا پھرتا تھا۔ بعض حاکموں کو اس پر شبہ ہو گیا کہ یہ بغاوت پھیلا رہا ہے۔ یہاں لاکر قید کر دیا۔ مگر آپ تو ابھی اُسے دیکھئے ہی گا۔ ایسا صبر و شاکر اور خلیق شخص آج تک میں نے نہیں دیکھا۔ ہاں وہ کسی سے دبتا نہیں۔ خوشامد کرکے چاہے کوئی پانی بھرا لے مگر چاہو کہ رعب سے اُس کو دبا لیں۔ تو پھر جو بھر بھی نہ دبے گا۔

نایک رام دل میں خوش تھے کہ بڑی اچھی ساعت گھر سے چلا تھا کہ بھگوان آپ ہی سب دروازے کھولے دیتے ہیں۔ دیکھوں اب ونے سنگھ سے کیا بات ہوتی ہے۔ یوں تو وہ نہ جائیں گے مہارانی جی کی بیماری کا بہانہ کرنا پڑے گا۔ وہ راضی ہو جائے۔ پھر تو یہاں سے نکالی لے جانا میرا کام ہے۔ بھگوان کی دیا ہو جاتی تو میری مراد پوری ہو جاتی۔ گھر بس جاتا۔ زندگی سپھل ہو جاتی۔

(۲۸)

صوفیا کے چلے جانے پر ونے کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے۔ نفس ایک بزدل دشمن ہے جو ہمیشہ پس پشت وار کرتا ہے۔ جب تک صوفیا سامنے بیٹھی تھی۔ اُسے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ صوفیا کے پیٹھ پھیرتے ہی اُس نے خم ٹھوکنا شروع کر دیا۔ " نہ جانے میری باتوں کا صوفیا پر کیا اثر ہوا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھ گئی

کہ میں نے زندگی بھر کے لئے قومی خدمت کا عہد کر لیا ہے۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اُسے ماتاجی کی ناراضگی کا خوف دلانے لگا۔ جیسے بھولے بھالے بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر بات پر ماں سے کہہ دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ جب وہ میرے لئے اتنی قربانیاں کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ مذہب جیسی پاک شئے کو ترک کر دینے سے بھی اُس کو عار نہیں۔ تو اس کے سامنے قومی خدمت اور قرض ادائی کا ڈھونگ رچنا بالکل خلاف قاعدہ ہے۔ مجھے وہ اپنے دل میں کتنا بیہودہ۔ کتنا کم ہمت۔ کتنا بے انس سمجھ رہی ہوگی۔ مانا کہ دوسروں کے مفاد کی کوشش کرنا معیارِ زندگی ہے۔ لیکن ذاتی مفاد کا خیال بھی تو یک دم قابلِ ترک نہیں۔ بڑے سے بڑا قومی خادم بھی ذاتی مفاد کی طرف جھکتا ہے۔ اس مفاد کا صرف ایک جزو ترک کر دینا قوم پرستی کے لئے کافی ہے یہی قانونِ قدرت ہے۔ آہ میں نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی ماری۔ وہ کتنی مغرور ہے۔ پھر بھی اُس نے میرے لئے کیا کیا ذلتیں برداشت نہیں کیں۔ میری ماں نے اسے جتنا ذلیل کیا اتنا شدید اس کی ماں نے کیا ہوتا تو وہ اس کا مُنہ نہ دیکھتی مجھے آخر سوجھی کیا۔ بے شک میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ اس کی جذباتی رفعت مجھے خائف کرتی ہے۔ مگر میری عقیدت میری کمزوریوں کی تلافی نہیں کر سکتی؟ جہانگیر جیسا نفس پرست اور کم فہم شخص اگر نور جہاں کو خوش رکھ سکتا ہے تو میں اپنی بے نفسی اپنی محبت سے اُسے آسودہ نہیں کر سکتا؟ کہیں وہ میری اُداسی سے ناخوش ہو کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے مُنہ نہ پھیر لے۔ اگر میری قوم پرستی اور یاں کی خود غرضی اور پس و پیش کا یہ انجام ہوا تو یہ زندگی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔ " آہ کتنا بے نظیر حُسن ہے! اعلیٰ تعلیم و تحمل سے چہرہ پر کیسی متانت آگئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی دیوی جنت سے اتر آئی ہے۔

گویا ظاہری دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ وہ صرف باطنی دنیا میں چلتی پھرتی ہے۔ پاکیزہ خیالی قدرتی حسن کو کتنا دلفریب بنا دیتی ہے۔ وہی حسن کا اصلی سنگار ہے۔ پوشاکوں اور زیوروں سے تو اس کی قدرتی رونق ہی زائل ہو جاتی ہے۔ وہ مصنوعی اور خواہش انگیز ہو جاتی ہے۔ (بے ڈھنگا) کا لفظ ہی اس مفہوم کو خوب ادا کرتا ہے۔ قہقہہ اور تبسم میں جو فرق ہے۔ دھوپ اور چاندنی میں جو فرق ہے۔ موسیقی اور شاعری میں جو فرق ہے۔ وہی فرق مرصع اور مہذب حسن میں ہے۔ اس کا تبسم کتنا دلآویز ہے۔ جیسے بسنت کی ٹھنڈی ہوا یا کسی شاعر کا اچھوتا خیال۔ یہاں کسی حسینہ سے باتیں کرنے لگو تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ یا تو شین قاف درست نہیں یا تذکیر و تانیث کا خیال نہیں۔ صوفیا کے لئے عہد قاعدہ یا اصول سے انحراف کرنا قابل عفو ہی نہیں بلکہ زینت بخش بھی ہے۔ یہ میرے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس کے بغیر میری زندگی ایک سوکھے پیڑ کی طرح ہوگی۔ جس کو لگاتار بارش بھی سرسبز نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کا مفاد اور مفہوم ہی باقی نہ رہے گا۔ زندگی رہے گی مگر محبت اور خوشی اور مقصد سے خالی!

وتے اسی قسم کے خیالات میں غرق تھا کہ داروغہ جی آکر بیٹھ گئے اور بولے "معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ بلا سر سے جلد ہی ٹلے گی۔ ایجنٹ صاحب یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں۔ سردار صاحب نے شہر میں منادی کروادی ہے کہ اب کسی کو بستی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے معلوم ہوتا ہے۔ میم صاحب نے یہ حکم دیا ہے۔"

وتے۔ میم صاحب بہت دور اندیش ہیں۔

داروغہ۔ یہ نہایت اچھا ہوا۔ ورنہ فساد ضرور ہو جاتا اور سینکڑوں جانیں تلف ہوتیں۔ جیسا تم نے کہا میم صاحب نہایت دور اندیش ہیں۔

حالانکہ عمر ابھی کچھ نہیں ہے۔

وسنے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کل یہاں سے چلی جائیں گی۔

داروغہ۔ ہاں اور کیا۔ سُنی بات کہتا ہوں۔ حکام کی باتوں کی گھنٹہ گھنٹہ بھر میں خبر ملتی رہتی ہے۔ رسد اور بیگار جو ایک ہفتہ کے لئے لے جانے والی تھی بند کر دی گئی ہے۔

وسنے۔ یہاں پھر نہ آئیں گی؟

داروغہ۔ تم تو اتنے بیقرار ہو گویا اُن پر عاشق ہو۔

وسنے نے شرمندہ ہو کر کہا "مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ کل تمہیں دیکھنے آؤں گی۔"

داروغہ۔ کیا ہوگا۔ پر اب تو ان کی تیاری ہے۔ یہاں تو خوش ہیں۔ کہ بے داغ بچ گئے ورنہ اور سب جگہ جیلروں پر جرمانے ہوئے ہیں۔

داروغہ جی چلے گئے تو وسنے سوچنے لگے:۔ "صوفیا نے کل آنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا اپنا وعدہ بھول گئی؟ اب نہ آئے گی؟ اگر ایک بار آ جاتی تو میں اس کے قدموں پر گر کر کہتا۔ صوفیا۔ میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ دیوی اپنی پرستش کرنے والے سے اس لئے تو ناراض نہیں ہوتی کہ وہ اس کے قدموں کو چھوتے ہوئے کبھی جھجکتا ہے؟ یہ تو پوجنے والے کی ناعقیدت مندی کا نہیں بلکہ عین عقیدت مندی کا ثبوت ہے۔"

جوں جوں دن گزرتا تھا وسنے کی بیتابی بڑھتی جاتی تھی مگر اپنے دل کی بات کس سے کہے؟ اس نے سوچا۔ رات کو یہاں سے کسی طرح بھاگ کر صوفیا کے پاس جا پہنچوں۔ وائے قسمت کہ وہ میری رہائی کا حکم نامہ تک نے کر آئی تھی۔ اس وقت میرے سر پر نہ جانے کون سا شیطان سوار ہوا تھا۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ونے ۔ جھکائے دفتر کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا۔ کیوں نہ پھر بیہوشی کا بہانہ کرکے گر پڑوں؟ یہاں سب لوگ پریشان ہو جائیں گے اور صوفیا کو میری خبر ضرور مل جائے گی۔ اگر اس کی موٹر تیار رہو گی۔ تو بھی وہ ایک بار مجھے دیکھنے ضرور آ جائے گی۔ مگر مجھے تو سوانگ بھرنا بھی نہیں آتا۔ اپنے اوپر خود ہی ہنسی آ جائے گی۔ کہیں ہنسی رُک نہ سکی تو خفت اٹھانی پڑے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے بنا ہُوا ہے۔ کاش اس قدر موسلا دھار بارش ہونے لگتی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکتی۔ مگر شاید بارش کے دیوتا اندر کو بھی مجھ سے دشمنی ہے۔ آسمان پر بادل کا کہیں نام و نشان نہیں۔ گویا کسی قاتل کا بے رحم دل ہو۔ کلارک ہی کو کچھ ہو جاتا تو آج اس کا جانا رُک جاتا۔

جب اندھیرا ہو گیا تو اُسے صوفیا پر غصہ آنے لگا۔ جب آج ہی اس کو یہاں سے چلا جانا تھا۔ تو اس نے مجھ سے کل آنے کا وعدہ ہی کیوں کیا؟ مجھ سے دیدہ دانستہ جھوٹ کیوں کہا؟ کیا اب کبھی ملاقات ہی نہ ہو گی۔ جبھی پوچھوں گا۔ اسے خود ہی سمجھ جانا چاہئے تھا کہ یہ اس وقت پریشان ہے۔ اس سے میرے دل کی حالت مخفی نہیں ہے۔ وہ اس کشمکش سے بخوبی واقف ہے۔ جس میں مبتلا ہوں۔ ایک طرف محبت و عقیدت ہے تو دوسری طرف اپنا عہد ماں کی ناخوشی کا خوف اور بدنامی کا خیال۔ اس قدر مختلف جذبات کے یکجا ہونے پر اگر کوئی بے معنی گفتگو کرنے لگے تو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ اُس کو اس حالت میں مجھ سے ناخوش ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ اپنی محبت آمیز ہمدردی سے میرے دل کی آگ کو فرد کرنا چاہئے تھا۔ اگر اس کی یہی مرضی ہے کہ میں اسی حالت میں گھُل گھُل کر مر جاؤں۔ تو یہی سہی۔ یہ دل کی جلن

زندگی کے ساتھ ہی مٹ جائے گی۔ تہ۔ یہ دو دن کتنے خوشی کے دن تھے!
رات ہو رہی ہے۔ پھر اسی تاریک اور گندی کوٹھڑی میں بند کیا جاؤں گا۔
کون پوچھے گا کہ مرتے ہو یا جیتے۔ اس تاریکی میں چراغ کی روشنی نظر
بھی آئی تو جب تک میں وہاں پہنچوں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔
اتنے میں دارو غہ پھر آئے۔ مگر اب کے وہ تنہا نہ تھے۔ ان کے ساتھ
ایک پنڈت جی بھی تھے۔ ونے سنگھ کو خیال آیا کہ میں نے ان پنڈت
جی کو کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہ آتا تھا کہ کہاں۔ دارو غہ جی دیر تک
کھڑے پنڈت جی سے باتیں کرتے رہے۔ ونے سے کوئی نہ بولا۔
پس اس نے سمجھا کہ مجھے دھوکا ہوا ہے۔ کوئی اور آدمی ہو گا۔
رات کو سب قیدی کھانا کھا کر لیٹے۔ چاروں طرف کے دروازے بند کر
دئے گئے۔ ونے کانپ رہا تھا کہ مجھے بھی اپنی کوٹھری میں جانا پڑے گا۔
مگر نہ جانے کیوں اس کو وہیں پڑا رہنے دیا گیا۔
روشنی گل کر دی گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ونے اسی حالت
اضطراب میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیسے یہاں سے نکلوں۔ جانتا تھا کہ
چاروں طرف کے دروازے بند ہیں۔ نہ رسی ہے نہ کوئی اوزار۔ نہ
کوئی رفیق نہ مددگار۔ تاہم وہ منتظر سا دروازہ پر کھڑا تھا کہ شاید کوئی
تدبیر سوجھ جائے۔ مایوسی میں انتظار اندھے کی لاٹھی کا کام
دیتا ہے۔
دفعتاً سامنے سے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ ونے نے
سمجھا۔ کوئی چوکی دار ہو گا۔ وہ ڈر گیا کہ مجھے یہاں کھڑا دیکھ کر
کہیں اس کے دل میں کوئی شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ آہستہ کمرہ کی
طرف چلا۔ اتنا بزدل وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ توپ کے سامنے کھڑا
ہوا سپاہی بھی بچھو کو دیکھ کر خائف ہو جاتا ہے۔

ونے کمرہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے وہ آدمی بھی اندر آ پہنچا۔
ونے نے چونک کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟"
نایک رام بولے:- آپ کا غلام ہوں نایک رام پنڈا۔
ونے۔ تم یہاں کہاں؟ اب یاد آیا۔ آج تمہیں تو داروغہ کے ساتھ پگڑی باندھے کھڑے تھے؟ ایسی صورت بنالی تھی کہ پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ تم یہاں کیسے آگئے؟
نایک رام۔ آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔
ونے۔ جھوٹے ہو۔ یہاں کوئی ججمانی ہے کیا؟
نایک رام۔ ججمان کیسے۔ یہاں تو مالک ہی ہیں۔
ونے۔ کب آئے گھر؟ وہاں تو سب خیریت ہے؟
نایک رام۔ ہاں سب خیریت ہی ہے۔ کنور صاحب نے جب سے آپ کا حال سنا ہے بہت گھبرائے ہوئے ہیں رانی جی بھی بیمار ہیں۔
ونے۔ اماں جی کب سے بیمار ہیں؟
نایک رام۔ کوئی ایک مہینہ ہونے آتا ہے۔ بس گھلی جاتی ہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ نہ کسی سے کچھ بولتی ہیں۔ نہ جانے کون روگ ہے۔ کہ کسی بید حکیم ڈاکٹر کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ دور دور سے ڈاکٹر بلائے گئے ہیں پر روگ کی تھاہ نہیں ملتی۔ کوئی کچھ بتاتا ہے۔ کوئی کچھ۔ کلکتہ سے کوئی کبیراج آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب یہ بچ نہیں سکتیں۔ ایسی گھل گئی ہیں کہ دیکھتے ہی ڈر لگتا ہے مجھے دیکھا تو دھیرے سے بولیں۔ "پنڈا جی اب ڈیرا کوچ ہے۔" میں کھڑا کھڑا روتا رہا۔
ونے نے سسکتے ہوئے کہا۔ "ہائے ایشور۔ مجھے ماں کے چرنوں

کے درشن بھی نہ ہوں گے کیا؟"
نایک رام۔ میں نے جب بہت پوچھا۔ سرکار کسی کو دیکھنا چاہتی ہو تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ "ایک بار ونے کو دیکھنا چاہتی ہوں پر بھاگ میں دیکھنا بدا نہیں ہے۔ نہ جانے اُس کا کیا حال ہوگا!"
ونے اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ جب ذرا آواز قابو میں ہوئی تو بولے۔ "اماں جی کو کبھی کسی نے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اب پریشان ہوں۔ کیسے ان کے درشن ہوں گے؟ بھگوان نہ جانے کن پاپوں کی یہ سزا مجھے دے رہے ہیں!"
نایک رام۔ میں نے پوچھا کہ حکم ہو تو جا کر انہیں لاؤں۔ اتنا سُننا تھا کہ وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔ "وہ تم اسے لوا لاؤ گے؟ نہیں وہ نہ آئے گا۔ وہ مجھ سے روٹھا ہوا ہے۔ کبھی نہ آئے گا۔ اُسے ساتھ لاؤ تو تمہارا بڑا احسان ہوگا!" اتنا سنتے ہی میں وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ اب دیر نہ کیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماتا کی خواہش دل کی دل ہی میں رہ جائے اور آپ کو جنم بھر پچھتانا پڑے۔
ونے۔ کیسے چلوں گا؟
نایک رام۔ اس کی چنتا مت کیجئے۔ لے تو میں چلوں گا۔ جب یہاں تک آ گیا تو یہاں سے نکلنا کیا مشکل ہے۔
ونے کچھ سوچ کر بولے۔ "پنڈا جی میں تو چلنے کے لئے تیار ہوں پر اندیشہ یہی ہے کہ کہیں اماں جی ناراض نہ ہو جائیں۔ تم تو اُن کے سوبھاؤ کو نہیں جانتے۔"
نایک رام۔ بھیّا۔ اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ انہوں نے تو کہا ہے کہ جیسے بنے ویسے لاؤ۔ انہوں نے تو کہا کہ ماپھی (معافی) بھی

مانگنی پڑے تو اس وقت مانگ لینی چاہئے۔
ونے۔ تو چلو کیسے چلتے ہو؟
نایک رام۔ دیوال پھاند کر نکل جائیں گے۔ یہ کون مشکل ہے۔
ونے سنگھ کو خیال ہوا کہ کہیں کسی کی نگاہ پڑ جائے تو صوفیا اس بات کو سن کر کیا کہے گی۔ سارے حکام مجھ پر تالیاں پیٹیں گے۔ صوفیا سوچے گی کہ بڑے سچے بنتے تھے۔ اب وہ سچائی کہاں گئی؟ کسی طرح صوفیا کو یہ خبر دی جا سکتی تو وہ ضرور حکم نامہ بھیج دیتی۔ پر یہ بات نایک رام سے کیسے کہوں؟ بولے۔ پکڑے گئے تو؟
نایک رام۔ پکڑے گئے تو۔ پکڑے گا کون؟ کہیں کچی گولی نہیں کھیلے ہیں۔ سب آدمیوں کو پہلے ہی سے گانٹھ رکھا ہے۔
ونے۔ خوب سوچ لو۔ پکڑے گئے تو پھر کسی طرح چھٹکارا نہ ہوگا۔
نایک رام۔ پکڑے جانے کا تو نام ہی نہ لو۔ یہ دیکھو۔ سامنے کئی اینٹیں دیوال سے ملا کر رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے پہلے ہی سے وہ انتظام کر لیا ہے۔ میں اینٹوں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ میرے کندھے پر چڑھ کر اس رسّی کو لئے دیوال پر چڑھ جائے گا۔ رسّی اس طرف پھینک دیجئے گا۔ میں اسے ادھر مضبوط پکڑے رہوں گا۔ آپ ادھر دھیرے سے اتر جائیے گا۔ پھر وہاں آپ رسّی کو مضبوط پکڑے رہئے گا۔ میں بھی ادھر سے چلا آؤں گا۔ رسّی بڑی مضبوط ہے۔ ٹوٹ نہیں سکتی۔ مگر ہاں چھوڑ نہ دیجئے گا۔ نہیں تو میری ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی۔
یہ کہہ کر نایک رام رسّی کا پلندہ لئے ہوئے اینٹوں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ ونے بھی آہستہ آہستہ چلے۔ دفعتاً کسی چیز

کھٹکنے کی آواز آئی۔ ونے نے چونک کر کہا۔ بھائی میں نہ جاؤں گا۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ ماتاجی کے درشن کرنا مجھے بدا نہیں ہے۔

نایک رام۔ تو اسی جھوٹ پر چلے تھے سانپ کے منہ میں انگلی ڈالنے۔ خطرہ کے وقت حفظ مراتب کا خیال جاتا رہتا ہے۔

ونے۔ تم مجھے ضرور پھنساؤ گے۔

نایک رام۔ مرد ہو کر پھنسنے سے اتنا ڈرتے ہو۔ پھنس ہی گئے تو کون چوڑیاں میلی ہو جائیں گی۔ دشمن کی قید سے بھاگنے میں لاج نہیں جاتی۔ یہ کہہ کر وہ اینٹوں پر کھڑا ہو گیا اور ونے سے بولا۔ میرے کندھے پر آ جاؤ۔

ونے۔ کہیں تم گر پڑے تو؟

نایک رام۔ تمہارے جیسے پانچ سوار ہو جائیں تو لے کر دوڑوں۔ دھرم کی کمائی ہے۔ بیس بل ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے ونے کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے کندھے پر ایسی آسانی سے اٹھا لیا گویا کوئی بچہ ہے۔

ونے۔ کوئی آ رہا ہے۔

نایک رام۔ آنے دو۔ یہ رسی کمر میں باندھ لو اور دیوار پکڑ کر چڑھ جاؤ۔

اب ونے نے ہمت مضبوط کی۔ یہی فیصلہ کن موقع تھا۔ صرف ایک جست کی ضرورت تھی۔ اوپر پہنچ گئے۔ تو بیڑا پار ہے۔ نہ پہنچ سکے۔ تو ذلت۔ بدنامی۔ سزا سب کچھ ہے۔ اوپر بہشت ہے۔ نیچے دوزخ۔ اوپر نجات ہے۔ نیچے قید۔ دیوار پر چڑھنے میں ہاتھوں کے سوا اور کسی چیز سے مدد نہ مل سکتی تھی۔ کمزور ہونے پر بھی فطرتاً مضبوط آدمی تھے۔ چھلانگ ماری اور بیڑا پار ہو لیا۔ دیوار پر جا پہنچے اور

رسی پکڑ کر نیچے اتر پڑے۔ بدقسمتی سے پیچھے ہی دیوار سے ملی ہوئی گہری خندق تھی۔ جس میں برساتی پانی بھرا ہوا تھا۔ ونے نے جیوں ہی رسّی چھوڑ دی۔ گردن تک پانی میں ڈوب گئے اور پھر بڑی مشکل سے باہر نکلے۔ پھر رسّی پکڑ کر نایک رام کو اشارہ کیا۔ وہ مشتاق کھلاڑی تھا۔ دم زدن میں نیچے آ پہنچا۔ ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ دیوار ہی پر بیٹھا تھا اور صرف اترنے کی دیر تھی۔

ونے۔ دکھتا کھائی ہے۔

نایک رام۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ تم سے بتانے کی یاد ہی نہ رہی۔

ونے۔ تم اس کام میں ہوشیار ہو۔ میں کبھی نہ نکل سکتا۔ اب کدھر چلوگے؟

نایک رام۔ سب سے پہلے تو دیوی کے مندر میں چلوں گا اور وہاں سے پھر موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن کو۔ ایشور نے چاہا تو آج کے تیسرے دن گھر پہنچ جائیں گے۔ دیوی کی مدد نہ ہوتی تو اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے یہ کام نہ ہوتا۔ انہیں نے یہ سنکٹ ہرا ہے۔ ان پر اپنا خون چڑھاؤں گا۔

اب دونوں آزاد تھے۔ ونے کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرے پیر خود بخود اٹھے جاتے ہیں۔ وہ اتنے ہلکے ہو گئے تھے۔ ذرا دیر میں دونوں سڑک پر آ گئے۔

ونے۔ صبح ہوتے ہی دوڑ دھوپ شروع ہو جائے گی۔

نایک رام۔ تب تک ہم لوگ یہاں سے سو کوس پر ہوں گے۔

ونے۔ گھر سے بھی تو وارنٹ کے ذریعہ پکڑ منگا سکتے ہیں۔

نایک رام۔ وہاں کی چنتا مت کرو۔ وہ اپنا راج ہے۔

آج سڑک پر بڑی ہل چل تھی۔ سینکڑوں آدمی لالٹینیں لئے بستی سے چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک غول ادھر سے آتا تھا۔ دوسرا اُدھر سے۔ عموماً لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ونے سنگھ کو حیرت ہوئی کہ آج یہ بھیڑ کیسی۔ عوام پر وہ سکوت نما پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ جو کسی خوف ناک جوش کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن وہ کسی سے کچھ پوچھ نہ سکتے تھے کہ پہچان نہ لئے جائیں۔

نایک رام۔ دیبی کے مندر تک تو پیدل ہی چلنا پڑے گا۔

ونے۔ پہلے ان آدمیوں سے تو پوچھو۔ کہاں دوڑے جا رہے ہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہو۔

نایک رام۔ ہوگی ہمیں ان باتوں سے کیا مطلب۔ چلو اپنی راہ چلیں۔

ونے۔ نہیں نہیں۔ ذرا پوچھو تو کیا بات ہے۔

نایک رام نے ایک آدمی سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ نو بجے کے وقت ایجنٹ صاحب اپنی میم کے ساتھ موٹر پر بیٹھے ہوئے بازار کی طرف سے نکلے۔ موٹر بڑی تیزی سے جا رہا تھا۔ چوراہے پر پہنچا تو ایک آدمی جو بائیں طرف سے آتا تھا موٹر کے نیچے آگیا۔ صاحب نے آدمی کو دبتے ہوئے دیکھا مگر موٹر کو نہ روکا۔ یہاں تک کہ کئی آدمی موٹر کے پیچھے دوڑے۔ بازار کے اس سرے تک آتے آتے موٹر کو بہت سے آدمیوں نے گھیر لیا۔ صاحب نے آدمیوں کو ڈانٹا کہ ابھی ہٹ جاؤ۔ جب لوگ نہ ہٹے تو انہوں نے پستول داغ دی۔ ایک آدمی فوراً گر پڑا۔ اب لوگ غصہ سے پاگل ہو کر صاحب کے بنگلہ کی طرف جا رہے تھے۔

ونے نے پوچھا۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک آدمی ۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے گا ۔ یہی ہوگا نہ ۔ مارے جائیں گے ۔ مارے تو یونہی جا رہے ہیں ۔ ایک دن تو مرنا ہی ہے ۔ دس پانچ آدمی مر گئے تو کون سنسار سونا ہو جائے گا ۔

ونے کے ہوش اڑ گئے ۔ یقین ہو گیا کہ آج کوئی فساد ضرور برپا ہوگا ۔ بگڑی ہوئی رعایا وہ پانی کا سیلاب ہے ۔ جو کسی کے رُکے نہیں رُک سکتا ۔ یہ لوگ جھلائے ہوئے ہیں ۔ اس حالت میں ان سے صبر و عفو کی باتیں کرنا فضول ہے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ بنگلہ کو گھیر لیں ۔ صوفیا بھی وہیں ہے کہیں اس پر حملہ نہ کر بیٹھیں ۔ غصہ میں شرافت کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ نایک رام سے بولے ۔ پنڈا جی ۔ ذرا بنگلہ تک ہوتے چلیں ۔

نایک رام ۔ کس کے بنگلے تک ؟

ونے ۔ پولیٹکل ایجنٹ کے ۔

نایک رام ۔ اُن کے بنگلہ پر جا کر کیا کیجئے گا ؟ کیا ابھی تک پر اپکار سے جی نہیں بھرا ۔ یہ جانیں وہ جانیں ۔ ہم سے آپ سے مطلب ؟

ونے ۔ نہیں موقع نازک ہے ۔ وہاں جانا ضروری ہے ۔

نایک رام ۔ ناحق اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو ۔ وہاں کچھ دنگا ہو جائے تو ؟ آخر مرد ہیں ۔ چُپ چاپ کھڑے منہ تو دیکھتے نہ رہیں گے ۔ دو چار ہاتھ ادھر یا اُدھر چلا ہی دیں گے ۔ بس دھر پکڑ ہو جائے گی ۔ اس سے کیا فائدہ ؟

ونے ۔ کچھ بھی ہو ۔ میں یہاں یہ ہنگامہ ہوتے دیکھ کر اسٹیشن نہیں جا سکتا ۔

نایک رام ۔ رانی جی پل پل بھر میں پوچھتی ہوں گی ۔

ونے ۔ تو یہاں ہمیں کون دو چار دن لگ جاتے ہیں ۔ تم یہیں ٹھہرو ۔ میں ابھی آتا ہوں ۔

نایک رام۔ جب تمہیں کوئی ڈر نہیں ہے۔ تو یہاں کون رونے والا بیٹھا ہُوا ہے؟ میں آگے آگے چلتا ہوں۔ دیکھنا میرا ساتھ نہ چھوڑنا۔ یہ تم ے لو۔ جوکھم کا معاملہ ہے۔ میرے لئے یہ لکڑی کافی ہے۔

یہ کہہ کر نایک رام نے ایک دونلی پستول کمر سے نکال کر ونے کے ہاتھ میں رکھ دی۔ ونے پستول لئے ہوئے آگے بڑھے۔ جب شاہی محل کے نزدیک پہنچے تو اتنی بھیڑ دیکھی کہ ایک ایک قدم چلنا مشکل ہو گیا اور محل سے ایک گولی کے فاصلہ پر تو انہیں مجبور ہو کر رُک جانا پڑا۔ سر ہی سَر نظر آ رہے تھے۔ محل کے سامنے ایک برقی لالٹین جل رہی تھی۔ اور اس کی صاف روشنی میں ہلنا چلنا۔ رُکتا ٹھٹھکتا ہُوا لوگوں کا ہجوم اس طرح محل کی طرف جا رہا تھا گویا اُسے نگل جائے گا۔ محل کے سامنے اس ہجوم کو روکنے کے لئے وردی پوش سپاہیوں کی ایک قطار سنگین چڑھائے ہوئے خاموش کھڑی تھی اور اونچے چبوترہ پر کھڑی ہوئی صوفیا کچھ کہہ رہی تھی مگر اس شور و غل میں اُس کی آواز کچھ سُنائی نہ دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دیوی کی مورت ہے۔ جو صرف اشاروں سے کچھ کہہ رہی ہے۔

دفعتاً صوفیا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ صوفیا نے اونچی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں آخری مرتبہ تم لوگوں کو جتانے دیتی ہوں کہ یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ۔ ورنہ سپاہیوں کو مجبور ہو کر گولیاں چلانی پڑیں گی۔ ایک لمحہ میں یہ میدان صاف ہونا چاہیئے۔"

بیرپال سنگھ نے آ کر کہا۔ "رعایا اس قسم کی بدعتیں اب نہیں برداشت کر سکتی۔"

صوفیا۔ اگر لوگ دیکھ بھال کر راستہ میں چلیں۔ تو ایسے واقع

کیوں ہوں؟

بیرپال سنگھ۔ موٹر والوں کے لیئے بھی کوئی قانون ہے یا نہیں؟

صوفیا۔ ان کے لیئے قانون بنانا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔

بیرپال سنگھ۔ ہم قانون بنا نہیں سکتے مگر اپنی جانوں کی حفاظت تو کر سکتے ہیں۔

صوفیا۔ تم بغاوت پہ آمادہ ہو اور تم خود اس کے بُرے نتائج کے ذمہ وار ہو گے۔

بیرپال سنگھ۔ ہم باغی نہیں ہیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا ایک بھائی کسی موٹر کے نیچے دب جائے چاہے وہ موٹر تمہارا ناہی کا کیوں نہ ہو اور ہم منہ نہ کھولیں۔

صوفیا۔ وہ محض اتفاق تھا۔

بیرپال سنگھ۔ احتیاط اُس اتفاقی حادثہ کو ٹال سکتی تھی۔ اب ہم اُس وقت تک یہاں سے نہ جائیں گے۔ جب تک ہم سے وعدہ نہ کیا جائے گا کہ آئندہ ایسے ناگوار واقعات کے لیئے مجرم کو مناسب سزا دی جائے گی چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

صوفیا۔ اتفاقیہ باتوں کے لیئے کوئی وعدہ نہیں کیا جا سکتا لیکن...

صوفیا کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ کسی نے ایک پتھر اس کی طرف پھینکا جو اُس کے سر میں اتنے زور سے لگا کہ وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اگر ونے فوراً کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر عوام کو سمجھاتے تو شاید فساد نہ ہوتا اور لوگ چپ چاپ اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ صوفیا کا زخمی ہو جانا عوام کا غصہ فرد کرنے کے لیئے کافی تھا۔ مگر جو پتھر صوفیا کے سر میں لگا۔ وہی کئی گنا زور کے ساتھ ونے کے سینہ

پر دل پر لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جامہ سے باہر ہو گیا۔ مجمع کو زبردستی ہٹاتا آدمیوں کو دھکے دیتا کچلتا ہوا صوفیا کی بغل میں جا پہنچا۔ پستول کمر سے نکالی اور بیرپال سنگھ پر گولی چلا دی۔ پھر کیا تھا۔ سپاہیوں کو گویا حکم مل گیا۔ انہوں نے بندوقیں سر کرنی شروع کر دیں۔ کہرام مچ گیا۔ لیکن پھر بھی لوگ کئی منٹ تک وہیں کھڑے گولیوں کا جواب اینٹ پتھر سے دیتے رہے۔ دو چار بندوقیں ادھر سے بھی چلیں۔ بیرپال سنگھ بال بال بچ گیا اور ونے کے نزدیک ہونے کے سبب انہیں پہچان کر بولا ــ آپ بھی انہیں میں ہیں!

ونے۔ قاتل!

بیرپال سنگھ۔ پرماتما ہم سے روٹھ گیا ہے۔

ونے۔ تمہیں ایک عورت پہ ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی؟

چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں ــ ونے سنگھ ہیں۔ یہ کہاں سے آ گئے؟ یہ بھی ادھر مل گئے۔ انہیں نے تو پستول چھوڑی ہے۔

"بنا ہوا تھا۔ گھر کا بھیدی لنکا داہ۔"

"شاید شرط پر چھوڑے گئے ہیں۔"

"دولت کی ہوس سر پر سوار ہے۔"

"مار دو ایک پتھر۔ سر پھٹ جائے۔ یہ بھی ہمارا دشمن ہے۔"

"دغاباز ہے۔"

"اتنا بڑا آدمی اور تھوڑے سے روپوں کے لئے ایمان بیچ بیٹھا۔"

بندوقوں کی باڑھ کے سامنے نہتے لوگ کب تک ٹھہرتے۔ جب اپنی طرف کئی آدمی لگاتار گرے تو بھگدڑ پڑ گئی۔ کوئی ادھر بھاگا۔ کوئی اُدھر۔ مگر بیرپال سنگھ اور اس کے ساتھی پانچوں سوار جن کے پاس

بندوقیں تھیں۔ محل کے پیچھے کی طرف سے ونے سنگھ کے سر پر جا پہنچے۔ تاریکی میں کسی کی نگاہ ان پر نہ پڑی۔ ونے نے اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپ سُنی تو چونکے۔ پستول چلائی مگر وہ خالی تھی۔

بیر پال سنگھ نے طنز سے کہا۔ آپ تو رعایا کے دوست بنتے تھے۔

ونے۔ تم جیسے قاتلوں کی مدد کرنا میرا قاعدہ نہیں۔

بیر پال۔ مگر ہم اُن سے اچھے ہیں جو حکام سے مل کر رعایا کی گردن پر چھری چلائے۔

ونے سنگھ غضبناک ہو کر باز کی طرح جھپٹے کہ اُس کے ہاتھ سے بندوق چھین لیں۔ مگر بیر پال کے ایک ساتھی نے جھپٹ کر ونے سنگھ کو نیچے گرا دیا اور دوسرا ساتھی تلوار لے کر ان کی طرف لپکا ہی تھا کہ صوفیا جو اب تک بیہوش سی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ چیخ مار کر اُٹھی اور ونے سنگھ سے لپٹ گئی۔ تلوار اپنے نشانہ پر نہ پہنچ کر صوفیا کے ماتھے پر پڑی۔ اتنے میں نایک رام لاٹھی لئے ہوئے آ پہنچا اور لاٹھی چلانے لگا۔ دو باغی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ بیر پال سنگھ اب تک ششدر اور ساکت کھڑا تھا۔ نہ اُسے معلوم تھا کہ صوفیا کو خنجر کس نے مارا۔ نہ اس نے اپنے ساتھیوں ہی کو ونے پر حملہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ یہ سب کچھ اُس کی آنکھوں کے سامنے مگر اُس کی مرضی کے خلاف ہی ہو رہا تھا مگر اب اپنے ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر وہ بے لاگ نہ رہ سکا۔ اس نے بندوق کا کندا تان کر اتنی زور سے نایک رام کے سر پر مارا کہ اُس کا سر پھٹ گیا اور ایک لمحہ میں اُس کے تینوں ساتھی اپنے زخمی ساتھیوں کو لے کر بھاگ نکلے۔ ونے سنگھ سنبھل کر اُٹھے تو دیکھا کہ بغل میں نایک رام خون سے شرابور بیہوش پڑا ہے اور صوفیا کا کہیں پتہ نہیں۔ اسے کون لے گیا۔ کیوں لے گیا۔ کیسے لے گیا۔ ان باتوں کی انہیں مطلق خبر

نہ تھی۔ میدان میں ایک آدمی بھی نہ تھا۔ دو چار لاشیں البتہ اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔

مسٹر کلارک کہاں تھے؟ طوفان اُٹھا اور گیا۔ آگ لگی اور بجھی۔ مگر ان کا کہیں پتہ تک نہیں۔ وہ شراب کے نشہ میں مخمور۔ دین دُنیا سے بے خبر۔ اپنی خواب گاہ میں پڑے ہوئے تھے۔ باغیوں کا شور سُن کر صوفیا محل سے نکل آئی تھی۔ مسٹر کلارک کو اس لئے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے آنے سے عوام کے قتل کئے جانے کا اندیشہ تھا۔ اُس نے پُر امن ذرائع سے امن قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی کا یہ انجام تھا۔ وہ پہلے ہی سے ہوشیار ہو جاتی تو شائد حالت اتنی نازک نہ ہونے پاتی۔

ونے نے نایک رام کو دیکھا۔ نبض کا پتہ نہ تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ فکر، رنج اور پشیمانی سے دل اتنا بیقرار ہوا کہ وہ رو پڑے۔ فکر تھی ماں کی کہ اُن کے درشن بھی نہ کرنے پایا۔ غم تھا صوفیا کا کہ نہ جانے اُسے کون لے گیا۔ پشیمانی تھی اپنے غصہ پر کہ میں ہی اس بغاوت اور قتل کا سبب ہوں۔

آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مگر ونے کے قلبی آسمان پر چھائی ہوئی غم کی گھٹا اس سے کہیں زیادہ کالی اور گھنگھور تھی۔

(۲۹)

مسٹر ولیم کلارک اپنے دیگر ہموطنوں کی طرح شراب کے شائق ضرور تھے۔ مگر اُس کے عادی نہ تھے۔ وہ ہندوستانیوں کی طرح پی کر بدمست ہونا نہ چاہتے تھے۔ گھوڑے پر سوار ہونا جانتے تھے۔ مگر اُس کو قابو سے باہر نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن آج صوفیا نے دیدہ دانستہ ان کو معمول سے زیادہ پلا دی تھی۔ حوصلہ دلاتی جاتی تھی۔ "واہ اتنی ہی۔ ایک گلاس اور تو لو۔ اچھا یہ میری خاطر سے۔

واہ ابھی تم نے میرا جام صحت تو پیا ہی نہیں۔" صوفیا نے ونے سے کل ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر اُن کی باتیں اسے ایک لمحہ کے لئے بھی چین نہ لینے دیتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی:۔ ونے نے آج یہ نئے بہانے کیوں ڈھونڈ نکالے؟ میں نے ان کے لئے مذہب کی بھی پرواہ نہیں کی۔ پھر بھی وہ مجھ سے بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب میرے پاس اور کون سی تدبیر ہے؟ کیا محبت کا دیوتا اتنا سنگدل ہے۔ کیا وہ بڑی سے بڑی بھینٹ پاکر بھی راضی نہیں ہوتا؟ ماں کی ناراضگی کا اتنا خوف انہیں کبھی نہ تھا۔ کچھ نہیں۔ اب اُن کی محبت گھٹ گئی ہے۔ مردوں کا دل ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اس کا ایک اور ثبوت مل گیا۔ اپنی ناقابلیت کا تذکرہ اُن کے مُنہ سے کتنا غیر فطری معلوم ہوتا تھا۔ وہ جو اتنے پراوپکاری، اتنے نیاگی، اتنے سچے، اتنے فرض شناس ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ ہائے وہ کیا جانتے ہیں کہ میں ان سے کتنی گہری عقیدت رکھتی ہوں۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کے قدم چھو سکوں۔ کتنا پاک دل ہے۔ کتنا اُونچا خیال۔ کتنا روحانی ایثار! انہیں۔ وہ مجھ سے دُور رہنے ہی کے لئے یہ حیلہ کر رہے ہیں۔ انہیں خوف ہے کہ میں اُن کے پیروں کی زنجیر بن جاؤں گی۔ انہیں فرض کے راستہ سے ہٹا دوں گی۔ اُن کو معیار سے الگ کر دوں گی۔ میں ان کے اس خوف کو کیسے رفع کروں؟

دن بھر انہیں خیالات میں غرق رہنے کے بعد شام کو وہ اتنی مضطرب ہوئی کہ اُس نے رات ہی کو ونے سے پھر ملنے کا قصد کیا۔ اس نے کلارک کو شراب پلا کر اسی لئے بیہوش کر دیا تھا کہ اس کو کسی طرح کا شُبہ نہ ہو۔ جیل کے حکام سے اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ وہ اس وقفہ کو ونے سے منّت و سماجت کرنے میں ان کی سوئی ہوئی محبت کو جگانے میں ان کے شکوک کو رفع کرنے میں گزارنا چاہتی تھی۔ مگر اُس کی کوشش اُسی کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ مسٹر کلارک موقع پر پہنچ سکتے تو شاید معاملہ اتنا سنگین نہ ہونے پاتا۔ کم از کم صوفیا کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔

کلارک صاحب اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر بھی اس کی حفاظت کرتے ۔صوفیا نے اس سے دغا کرکے اپنا ہی ستیاناس مار لیا۔ اب وہ نہ جانے کہاں اور کس حالت میں تھی۔ عموماً لوگوں کا خیال تھا کہ باغیوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کی لاش کو زیورات کے طمع سے اپنے ساتھ لے گئے۔ صرف دنے سنگھ اس بات سے متفق نہ تھے۔ انہیں یقین تھا کہ صوفیا ابھی زندہ ہے۔ باغیوں نے ضمانت کے طور پر اس کو اپنے یہاں قید کر رکھا ہے کہ انہیں صلح کی شرائط طے کرنے میں انہیں آسانی ہو۔ صوفیا ریاست کو دبا دینے کے لئے ان کے ہاتھوں میں ایک آلہ کی طرح تھی۔

اس سانحہ سے ریاست میں تہلکہ مچ گیا۔ حکام آپ سے ڈرتے تھے اور رعایا اپنے لئے۔ اگر ریاست کے ملازموں ہی تک معاملہ رہتا تو زیادہ تشویش کی بات نہ تھی۔ ریاست خون کا بدلہ خون سے لیکر مطمئن ہو جاتی۔ زیادہ سے زیادہ ایک کی جگہ چار کو قتل کر ڈالتی۔ مگر صوفیا کے درمیان میں پڑ جانے سے معاملہ زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا۔ وہ اب ریاست کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ خود ریاست پر کوئی زوال نہ آ جائے۔ اس لئے ملزموں کی گرفتاری میں غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی سے کام لیا جا رہا تھا۔ ذرا سا مشتبہ ہونے پر بھی لوگوں کو ماخوذ کر لیا جاتا تھا اور انہیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ گواہ اور ثبوت کی کوئی پوچھ نہ تھی۔ ان ملزموں کا مواخذہ کرنے کے لئے ایک علیحدہ عدالت قائم کر دی گئی تھی۔ وہاں انصاف کرنے کے لئے (۹) رعایا کے چنے چنے دشمنوں کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ عدالت کسی کو چھوڑنا نہ جانتی تھی۔ کسی ملزم کو سزائے موت دینے کے لئے ایک سپاہی کی شہادت کافی تھی۔ سردار نیلکنٹھ بلا کھائے پیئے صبح سے شام تک ملزموں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب خود ہی شملہ۔ دہلی اور اودے پور ایک کئے ہوئے تھے۔ پولیس کے اہلکاروں کے نام روزانہ تاکیدیں بھیجی جاتی تھیں اور ادھر شملہ سے بھی تاکیدوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

تاکیدوں کے بعد دھمکیاں آنے لگیں۔ اسی مناسبت سے یہاں رعایا کے ساتھ بھی حکام کی سختیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ مسٹر کلارک کو یقین تھا کہ اس معاملہ میں ریاست کا ہاتھ بھی ضرور تھا۔ اگر ریاست نے پیشتر ہی سے باغیوں کا رہنا ناممکن کر دیا ہوتا تو وہ ہرگز اس طرح سر نہ اٹھا سکتے تھے۔ ریاست کے بڑے بڑے حکام بھی اُن کے سامنے جاتے ہوئے کانپتے تھے۔ وہ دورہ پر نکلتے تو ایک اور انگریزی رسالہ ساتھ لے لیتے۔ علاقے کے علاقے اجڑوا دیتے۔ گاؤں کے گاؤں تباہ کرا دیتے یہاں تک کہ عورتوں پر بھی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ریاست اور کلارک ان تمام بداعمالیوں میں ونے بھی دل و جان سے شرکت کرتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اُن پر دیوانگی سی طاری تھی۔ خدمت و ایثار کے خیالات ان کے دل سے یک قلم محو ہو گئے تھے۔ صوفیا اور اُس کے دشمنوں کا سراغ لگانے کی کوشش بس یہی ایک کام اُن کے لئے رہ گیا تھا۔ مجھے دنیا کیا کہتی ہے۔ میری زندگی کا کیا مقصد ہے۔ ماتا جی کا کیا حال ہُوا۔ ان باتوں کی طرف اب اُن کا دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ اب تو وہ ریاست کے دستِ راست بنے ہوئے تھے۔ حکام انہیں وقتاً فوقتاً اور بھی اشتعال دیتے رہتے تھے۔ باغیوں کے دبانے میں کوئی پولیس کا اہلکار یا ریاست کا نوکر اتنا بے اُنس بے انصاف اور بے پرواہ نہ بن سکتا تھا۔ اُن کی وفاداری کی کوئی حد نہ تھی یا یوں کہیئے کہ اس وقت وُہ ریاست کے ایک خاص رُکن بنے ہوئے تھے یہاں تک کہ سردار نیلکنٹھ بھی اُن سے دبتے تھے۔ مہارانا صاحب کو ان پر اتنا اعتبار تھا کہ ان کی رائے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اُن کے لئے آنے جانے میں کوئی روک نہ تھی اور مسٹر کلارک سے تو اُن کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں ایک ہی بنگلہ میں رہتے تھے اور در پردہ سردار صاحب کی جگہ پر ونے کی تقرری کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔

تقریباً ایک سال تک تمام ریاست میں یہی حال رہا جب جسونت نگر

باغیوں سے پاک وصاف ہو گیا یعنی وہاں کوئی جوان شخص باقی نہ رہ گیا تو ہوسنے خود ہی صوبہ کا پتہ لگانے پر آمادہ ہوا۔ ان کی مدد کے لئے خفیہ پولیس کے کئی تجربہ کار اہلکار تعینات کئے گئے۔ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نایک رام ابھی تک کمزور تھے۔ اُن کے بچنے کی تو کوئی اُمید ہی باقی نہ رہی تھی۔ مگر زندگی باقی تھی بچ گئے۔ انہوں نے ونے کو جانے پر آمادا دیکھا تو ہمراہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جاکر بولے۔ "بھیّا۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں یہاں اکیلا نہ رہوں گا۔"

ونے۔ میں کہیں پردیس تھوڑا جاتا ہوں۔ ساتویں روز یہاں آیا کروں گا۔ تم سے ملاقات ہو جائے گی۔

سردار نیلکنٹھ وہاں بیٹھے ہوئے تھے بولے۔ ابھی تم جانے کے قابل نہیں ہو۔

نایک رام۔ سردار صاحب۔ آپ بھی انہیں کی سی کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ نہ رہوں گا۔ تو رانی جی کو کون سامنہ دکھاؤں گا۔

ونے۔ تم یہاں زیادہ آرام سے رہ سکوگے۔ تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں۔

نایک رام۔ سردار صاحب اب آپ ہی بھیّا کو سمجھائیے۔ آدمی ایک گھڑی کی نہیں چلا آتا۔ ایک ہفتہ تو بہت ہوتا ہے۔ پھر مورچہ لینا ہے بیرپال سنگھ سے جس کا لوہا میں بھی مانتا ہوں۔ میری کئی لاٹھیاں اُس نے ایسی روک لیں کہ ایک بھی پڑ جاتی تو کام تمام ہو جاتا۔ پکا پھینکیت ہے۔ کیا میری جان تمہاری جان سے زیادہ پیاری ہے۔

نیلکنٹھ۔ ہاں بیرپال ہے تو ایک ہی شیطان۔ نہ جانے کب کدھر سے کتنے آدمیوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔ اس کے گوئند سے ساری ریاست میں پھیلے ہوئے ہیں۔

نایک رام۔ تو ایسے جوکھم میں کیسے ان کا ساتھ چھوڑ دوں؟

مالک کی چاکری میں جان بھی نکل جائے تو کیا غم ہے۔ اور یہ زندگی ہے کس لئے؟

ونے۔ بھئی بات یہ ہے کہ میں اپنے لئے کسی غیر کی جان جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

نایک رام۔ ہاں جب آپ مجھے غیر سمجھتے ہیں تو دوسری بات ہے۔ ہاں غیر تو ہوں ہی۔ غیر نہ ہوتا تو رانی جی کے اشارہ پر یہاں کیسے دوڑا آتا۔ جیل میں جا کر کیسے باہر نکال لاتا اور سال بھر تک کھاٹ کیوں سیتا۔ سردار صاحب۔ ہجور ہی اب نیائے کیجئے۔ میں غیر ہوں؟ جس کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرتا ہوں وہی غیر سمجھتا ہے۔

نیلکنٹھ۔ ونے سنگھ یہ آپ کا انیائے ہے۔ آپ انہیں غیر کیوں کہتے ہیں؟ اپنے خیر خواہوں کو غیر کہنے سے انہیں رنج پہنچتا ہے۔

نایک رام۔ بس سردار صاحب۔ ہجور نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی پولیس کے آدمی غیر نہیں اور میں غیر ہوں۔

ونے۔ اگر غیر کہنے سے تمہیں رنج ہوتا ہے تو میں یہ لفظ واپس لیتا ہوں۔ میں نے غیر صرف اس خیال سے کہا تھا کہ تمہاری نسبت مجھے گھر والوں کو جواب دینا پڑے گا۔ پولیس والوں کے لئے تو کوئی مجھ سے جواب نہ طلب کرے گا۔

نایک رام۔ سردار صاحب اب آپ ہی اس کا جواب دیجئے۔ یہ میں کیسے کہوں کہ مجھے کچھ ہو گیا۔ تو کنور صاحب کچھ پوچھ تا چھ نہ کریں گے۔ اُن کا بھیجا ہؤا آیا ہی ہوں۔ بھیّا کو جواب دہی تو ضرور کرنی پڑے گی۔

نیلکنٹھ۔ یہ مانا کہ تم ان کے بھیجے ہوئے آئے ہو مگر تم اتنے نادان نہیں ہو کہ تمہارے نفع نقصان کی ذمہ داری ونے سنگھ کے سر ہو۔ تم اپنا بھلا برا آپ سمجھ سکتے ہو۔ کیا کنور صاحب اتنا بھی نہ سمجھیں گے؟

نایک رام۔ اب کہئے دھرما وتار۔ اب تو مجھے لے چلنا پڑے گا۔

سردار صاحب نے میری ڈگری کر دی۔ میں کوئی نابالک (نابالغ) نہیں ہوں کہ سرکار کے سامنے آپ کو جواب دینا پڑے۔

بالآخر ونے سنگھ نے نایک رام کو ساتھ لے جانا منظور کر لیا۔ اور دو تین دن کے بعد دس آدمیوں کی ایک جماعت بھیس بدل کر سب طرح تیار ہو کر سراغرساں کتوں کو ساتھ لئے آمد و رفت کے ناقابل پہاڑی راستوں میں داخل ہوئی۔ پہاڑوں سے آگ نکل رہی تھی۔ اکثر کوسوں تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ملتا۔ راستے پتھریلے۔ درختوں کا پتہ نہیں۔ دوپہر کو لوگ غاروں میں آرام کرتے تھے۔ رات کو بستی سے الگ کسی چوپال یا مندر میں سو رہتے۔ دو دو آدمی ایک ساتھ رہتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار سب آدمیوں کو ایک ہی جگہ پر جمع ہونا پڑتا تھا۔ دوسرے روز کا دستور العمل طے کر کے لوگ پھر الگ الگ ہو جاتے تھے۔

نایک رام اور ونے سنگھ کی ایک جوڑی تھی۔ نایک رام ابھی تک چلنے پھرنے میں کمزور تھا۔ پہاڑوں کی چڑھائی میں تھک کر بیٹھ جاتا۔ خوراک کی مقدار بہت کم ہو گئی تھی۔ کمزور اتنا ہو گیا تھا کہ پہچاننا مشکل تھا۔ لیکن ونے سنگھ پر جان قربان کرنے کو تیار رہتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ دیہاتیوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے۔ مختلف مزاج اور رتبہ کے لوگوں سے واقف تھا۔ جس گاؤں میں پہنچتا دھوم مچ جاتی کہ کاشی سے پنڈا جی آئے ہیں۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ نائی۔ کہار آ پہنچتے۔ دودھ گھی پھل پھول۔ سبزی ترکاری وغیرہ کی افراط ہو جاتی۔ بچے۔ بوڑھے۔ مرد عورت بیدھڑک پنڈا جی کے پاس آتے۔ اور انہیں حسب مقدور دکشنا دیتے۔ پنڈا جی باتوں باتوں میں ان سے گاؤں کا سارا حال دریافت کر لیتے۔ ونے سنگھ کو اب معلوم ہوا کہ نایک رام ساتھ نہ ہوتے تو مجھے کتنی دقتیں پیش آتیں۔ وہ خود کم سن۔ متین اور شرمیلے آدمی تھے۔ اُن میں وہ حکیمانہ انداز نہ تھا جو عوام پر اپنا رعب جما لیتا ہے۔ نہ ان میں وہ شیریں کلامی تھی جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے۔ ایسی حالت میں نایک رام کا ساتھ ہونا اُن

کے لئے خدائی مدد سے کم نہ تھا۔

راستہ میں کبھی کبھی خونخوار درندوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر نایک رام سینہ سپر ہو جاتا تھا۔ ایک روز چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ دُور تک آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ دھوپ کی شدت سے ایک ایک قدم چلنا مشکل تھا۔ کوئی کنواں یا تالاب بھی نظر نہ آتا تھا۔ دفعتاً ایک اونچا ٹیکرا دکھائی دیا۔ نایک رام اس پر چڑھ گیا کہ شاید اوپر سے کوئی گاؤں یا کنواں نظر آئے۔ اس نے چوٹی پر پہنچ کر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو دُور پر ایک آدمی جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی اور پیٹھ پر ایک تھیلی تھی۔ کوئی بغیر وردی کا سپاہی معلوم ہوتا تھا۔ نایک رام نے اس کو کئی بار زور زور سے پکارا تو اس نے گردن پھیر کر دیکھا۔ نایک رام اُسے پہچان گئے۔ یہ ونے سنگھ کے ساتھ کا ایک رضاکار تھا۔ اسے اشارہ سے بُلایا اور ٹیلے سے اُتر کر اُس کے پاس گئے۔ اس قومی رضاکار کا نام اندر دت تھا۔

اندر دت نے پوچھا۔ تم یہاں کیسے آ پھنسے جی؟ تمہارے کنور کہاں ہیں؟

نایک رام۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی گاؤں بھی ہے۔ کہیں دانہ پانی مل سکتا ہے؟

اندر دت۔ جس کے رام دھنی اُسے کون کمی۔ کیا راج دربار نے بھوجن کی رسد نہیں لگائی۔ تیلی سے بیاہ کر کے تیل کا رونا۔

نایک رام۔ کیا کروں بھائی۔ بُرا پھنس گیا ہوں۔ نہ رہتے بنتا ہے نہ جاتے۔

اندر دت۔ اُن کے ساتھ تم بھی اپنی مٹی خراب کر رہے ہو۔ کہاں ہیں آج کل؟

نایک رام۔ کیا کرو گے؟

اندر دت۔ کچھ نہیں۔ ذرا ملنا چاہتا تھا۔
نایک رام۔ ہیں تو وہ بھی۔ یہیں بھینٹ ہو جائے گی۔ تھیلی میں کچھ ہے؟
اس طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں ونے سنگھ کے پاس پہنچے۔ ونے نے اندر دت کو دیکھا تو غصے سے بولا۔ "اندر دت تم کہاں؟ گھر کیوں نہیں گئے؟"
اندر دت۔ آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ آپ سے کتنی ہی باتیں کرنی ہیں۔ پہلے یہ بتلائیے کہ آپ نے یہ چولا کیوں بدلا؟
نایک رام۔ پہلے تم اپنی تھیلی میں سے کچھ نکالو۔ پھر باتیں ہوں گی۔
ونے سنگھ اپنی کایا پلٹ کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بولے:۔ "اس لئے کہ مجھے اپنی بھول معلوم ہو گئی۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ رعایا بڑی متحمل اور امن پسند ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ کمینہ اور پاجی ہے۔ اس کو جوں ہی اپنی طاقت کا کچھ احساس ہو جاتا ہے وہ اسے برے طریقہ پر استعمال کرنے لگتی ہے۔ جو آدمی طاقت کے پیدا ہوتے ہی پاگل ہو جائے اس کا کمزور اور پامال رہنا ہی اچھا ہے۔ گذشتہ بغاوت کا ہونا اس امر کا ایک بین ثبوت ہے۔ ایسی حالت میں میں نے جو کچھ کیا اور کر رہا ہوں وہ بالکل قرین انصاف اور قرین مصلحت ہے۔
اندر دت۔ کیا آپ کی رائے میں رعایا کو چاہیئے کہ خواہ اس پر کتنے ہی مظالم کئے جائیں پر وہ زبان نہ ہلائے؟
ونے۔ ہاں موجودہ حالت میں اس کا یہی فرض ہے۔
اندر دت۔ اس کے رہنماؤں کو بھی یہی معیار اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے؟
ونے۔ بے شک۔
اندر دت۔ تو جب آپ نے رعایا کو بغاوت پر آمادہ دیکھا تو اس کے سامنے کھڑے ہو کر تحمل اور امن کا وعظ کیوں نہیں دیا؟

وِنے۔ بالکل فضول تھا۔ اُس وقت کوئی میری نہ سُنتا۔

اندردت۔ اگر نہ سُنتا تو کیا آپ کا یہ فرض نہیں تھا کہ دونوں صفوں کے درمیان میں کھڑے ہوکر بیٹھے آپ خود ہی گولی کا نشانہ بن جاتے ؟

وِنے۔ میں اپنی زندگی کو اتنی ہیچ نہیں سمجھتا۔

اندردت۔ جو زندگی قومی خدمت کے لئے وقف ہو چکی اُس کے لئے اس سے بہتر اور کون موت ہو سکتی تھی ؟

وِنے۔ آگ میں کود نے کا نام خدمت نہیں ہے۔ اس پر تشدد کرنا ہی اس کی خدمت کرنا ہے۔

اندردت۔ اگر یہ خدمت نہیں ہے تو غریب رعایا کو اپنے نفس پر قربان کر دینا بھی خدمت نہیں ہے۔ بہت ممکن تھا کہ صوفیا نے اپنے دلائل سے بیرپال سنگھ کو لاجواب کر دیا ہوتا۔ مگر آپ نے مغلوب النفس ہو کر پستول کا پہلا وار کیا اور اس لئے اس کشت و خون کا سارا الزام آپ ہی کی گردن پر ہے اور جلد یا دیر میں آپ کو اس کا کفارہ کرنا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں۔ رعایا کو آپ کے نام سے کتنی نفرت ہے ؟ اگر کوئی شخص آپ کو یہاں دیکھ کر پہچان جائے تو اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ آپ کے اوپر تیر چلائے۔ آپ نے یہاں کی رعایا کے ساتھ اپنے رفیقوں کے ساتھ۔ اپنی قوم کے ساتھ اور سب سے زیادہ اپنی قابل تعظیم ماں کے ساتھ جو دغا کی ہے اُس کا الزام کبھی آپ کے سر سے دُور نہ ہوگا۔ شاید رانی جی آپ کو دیکھیں تو اپنے ہاتھوں سے آپ کی گردن پر تلوار پھیر دیں۔ آپ کی زندگی سے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ انسان کا کتنا اخلاقی زوال ہو سکتا ہے۔

وِنے نے کسی قدر نرم لہجہ میں کہا۔" اندردت۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے خود غرضی سے حکام کی مدد کی تو تم میرے ساتھ سخت ناانصافی کر رہے ہو۔ رعایا کا ساتھ دینے میں جتنی آسانی سے نیک نامی مل سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ آسانی سے حکام کا ساتھ دینے میں بدنام ہو جانا یقینی ہے۔ یہ

میں جانتا تھا۔ لیکن خادم کا فرض نیکنامی اور بدنامی کا لحاظ کرنا نہیں ہے۔ اُس کا فرض سچائی کے راستہ پر چلنا ہے۔ میں نے قومی خدمت کا عہد کیا ہے اور ایشور نہ کرے کہ میں وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رہوں۔ جب میرے خدمتی جذبہ میں خودغرضی کا شائبہ ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں رعایا کی نامناسب روش دیکھ کر بھی اس کی حمایت کروں۔ میرا عہد میری عقل کا خون نہیں کر سکتا۔

اندر دت۔ کم از کم اتنا تو آپ مانتے ہی ہیں کہ اپنے فائدہ کے لئے عوام کو نقصان نہ پہنچانا چاہیئے۔

ونے۔ تم مجھ پر جھوٹا الزام لگاتے ہو۔ میں عوام کے لئے سچائی سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ سچائی مجھ کو ملک و قوم دونوں سے زیادہ عزیز ہے۔ جب تک میں سمجھتا تھا کہ رعایا حق بجانب ہے میں اس کی حفاظت کرتا تھا۔ جب مجھے معلوم ہُوا کہ اس نے حق سے انحراف کیا ہے تو میں نے بھی اُس سے اپنا منہ موڑ لیا۔ مجھے ریاست کے حکام سے کوئی دلی عناد نہیں ہے۔ میں وہ شخص نہیں ہوں کہ حکام کو راہِ حق پر دیکھ کر بھی خواہ مخواہ ان سے دشمنی کروں اور نہ مجھ سے یہی ہو سکتا ہے کہ رعایا کو بغاوت اور سرکشی پر آمادہ دیکھ کر بھی اس کی مدد کروں۔ اگر کوئی شخص مس صوفیا کے موٹر کے نیچے دَب گیا۔ تو یہ ایک اتفاقی بات تھی۔ صوفیا نے جان بوجھ کر تو اس پر سے اپنا موٹر چلا نہیں دیا۔ ایسی حالت میں رعایا کا یوں برانگیختہ ہو جانا اس امر کا بیّن ثبوت تھا۔ کہ وہ حکام کو بزور اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ آپ صوفیا کے تعلق سے میرے اطوار پر حملہ کر کے صرف میرے ساتھ بے انصافی نہیں کر رہے ہیں بلکہ خود اپنے کو بھی ذلیل کر رہے ہیں۔

اندر دت۔ یہ ہزاروں آدمی بلا کسی قصور کے کیوں قتل ہوئے؟ کیا یہ بھی رعایا کا ہی قصور تھا؟

ونے۔ اگر آپ حکام کی مشکلات سے ذرا بھی واقف ہوتے تو

ہرگز یہ سوال نہ کرتے۔ میں اس کے لئے آپ کو معاف کرتا ہوں۔ ایک سال قبل جب حکام سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ شاید میں بھی ایسا ہی خیال کرتا۔ لیکن اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ انہیں ایسے مواقع پر انصاف سے کام لینے میں کتنی دقتیں پیش آتی ہیں۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ذی اختیار ہوتے ہی انسان کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ انسان فطرتاً انصاف پسند ہوتا ہے۔ اُسے کسی کو خواہ مخواہ ایذا پہنچانے سے خوشی نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ اُتنا ہی رنج ہوتا ہے جتنا کسی خادم قوم کو۔ فرق صرف اتنا ہی ہے۔ کہ خادمِ قوم کسی غیر کو موردِ الزام قرار دے کر اپنے کو خوش کر لیتا ہے۔ یہیں اُس کا فرض تمام ہو جاتا ہے۔ حُکام کو یہ موقع نہیں ملتا۔ وہ خود اپنے روّیہ کی صفائی پیش نہیں کر سکتے۔ آپ کو خبر نہیں کہ حُکام نے ملزموں کو ڈھونڈ نکالنے میں کتنی دقتیں اُٹھائیں۔ رعایا ملزموں کو چھپا لیتی تھی اور کسی سیاسی اصول کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اس لئے ملزموں کے ساتھ بیگناہوں کا ماخوذ ہو جانا ممکن ہی تھا۔ پھر آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس بغاوت نے ریاست کو کتنی بڑی مُصیبت میں ڈال دیا ہے۔ انگریزی سرکار کو شک ہے کہ دربار ہی کی وجہ سے یہ ساری سازش ہوئی۔ اب دربار کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو اس الزام سے بری کرے۔ اور جب تک مس صوفیا کا سُراغ نہیں مل جاتا۔ ریاست کی حالت نہایت نازک اور تشویشناک ہے۔ ہندوستانی ہونے کے سبب میرا فرض ہے کہ ریاست کے چہرہ سے اس داغ کو مٹادوں۔ خواہ اس کے لئے مجھے کتنی ہی ذلّت کتنی ہی بدنامی کتنی ہی سخت کلامی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ خادمِ قوم کی حالت کوئی مستقل صورت نہیں رکھتی۔ گردوپیش کے حالات کے مطابق اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کل میں ریاست کا جانی دشمن تھا۔ آج اُس کا جان نثار خادم ہوں اور اس کے لئے مجھے ذرا بھی ندامت نہیں ہے۔

اندردت۔ ایشور نے آپ کو بحث کے لئے عقل دی ہے اور اُس

سے آپ دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کی کوئی تاویل رعایا کے دل سے یہ خیال دور نہیں کر سکتی کہ آپ نے اُس کے ساتھ دغا کی اور اس دغا کی جو سزا آپ کو صوفیا کے ہاتھوں ملے گی اُس سے آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

ونے نے اس طرح جھپٹ کر اندردت کا ہاتھ پکڑ لیا گویا وہ کہیں بھاگا جا رہا ہو اور بولے۔ تمہیں صوفیا کا پتہ معلوم ہے؟

اندردت۔ نہیں۔

ونے۔ جھوٹ بولتے ہو۔

اندردت۔ ہو سکتا ہے۔

ونے۔ تمہیں بتانا پڑے گا۔

اندردت۔ آپ کو اب مجھ سے یہ پوچھنے کا حق نہیں رہا۔ آپ کا یاد ربار کا مقصد پورا کرنے کے لئے میں دوسروں کی جان عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ آپ نے ایک مرتبہ دغا کی ہے اور پھر کر سکتے ہیں۔

نایک رام۔ بتا دیں گے۔ آپ کیوں اتنے گھبرائے جاتے ہیں۔ اتنا تو بتا ہی دو بھیّا اندردت۔ کہ میم صاحب کشل (خیریت) سے ہیں نا؟

اندردت۔ ہاں اچھی طرح ہیں اور خوش ہیں۔ کم سے کم ونے سنگھ کے لئے کبھی بیچین نہیں ہوتیں۔ سچ پوچھو تو انہیں اب ان کے نام سے نفرت ہو گئی ہے۔

ونے۔ اندردت ہم اور تم بچپن کے دوست ہیں۔ تمہیں ضرورت ہو تو میں اپنی جان تک دے دوں مگر تم اتنی ذراسی بات بتلانے سے انکار کر رہے ہو۔ یہی دوستی ہے؟

اندردت۔ دوستی کے پیچھے دوسروں کی جان کیوں عذاب میں ڈالوں۔

ونے۔ میں ماتا کے چرنوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اسے مخفی رکھوں گا۔ میں صرف ایک مرتبہ صوفیا سے ملنا چاہتا ہوں۔

اندر دت - کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی۔
ونے - اندر میں تمام عمر تمہارا احسان مانوں گا۔
اندر دت - جی نہیں بتی بخشئے مُرغا بانڑا ہی اچھا۔
ونے - مجھ سے جو قسم چاہے لو۔
اندر دت - جس بات کے بتلانے کا مجھے اختیار نہیں ہے اُسے بتلانے کے لئے آپ مجھ سے ناحق اصرار کر رہے ہیں۔
ونے - تم سنگدل ہو۔
اندر دت - میں اس سے بھی زیادہ سخت ہوں۔ مجھے جتنا چاہے کوس لیجئے۔ پر صوفیا کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔
نایک رام - ہاں بھیّا۔ بس یہی ٹھیک چلی جائے۔ مردوں کا یہی کام ہے۔ دو ٹوک کہہ دیا کہ جانتے ہیں پر بتلائیں گے نہیں۔ چاہے کسی کو بھلا لگے چاہے بُرا۔
اندر دت - اب تو قلعی کھل گئی نا؟ کیوں کنور صاحب مہاراج اب تو بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کروگے؟
ونے - اندر دت - جلے پر نمک نہ چھڑکو۔ جو بات پوچھتا ہوں بتلا دو۔ ورنہ میری جان کو رونا پڑے گا۔ تمہاری جتنی خوشامد کر رہا ہوں اُتنی آج تک کسی کی نہیں کی تھی۔ مگر تمہارے اوپر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔
اندر دت - میں ایک بار کہہ چکا کہ مجھے جس بات کے بتلانے کا اختیار نہیں وہ کسی طرح نہ بتلاؤں گا۔ بس اس بارہ میں تمہارا اصرار بے فائدہ ہے۔ یہ لوئیں اپنی راہ جاتا ہوں۔ تمہیں جہاں جانا ہو جاؤ۔
نایک رام - سیٹھ جی بھاگوَمت۔ مس صاحبہ کا پتہ بتائے بنا نہ جانے پاؤ گے۔
اندر دت - کیا زبردستی پوچھو گے؟
نایک رام - ہاں زبردستی پوچھوں گا۔ براہمن ہو کر تم سے بھیک مانگ

رہا ہوں اور تم انکار کرتے ہو۔ اسی پر دھرنا تماؤ سیوک بنتے ہو۔ یہ سمجھ لو براہمن بھیک لئے بنا دروازے سے نہیں جاتا۔ نہیں پاتا تو دھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہے اور بھیر لے کر ہی اٹھتا ہے۔

اندر دت۔ مجھ سے یہ پنڈتی چالیں نہ چلو۔ سمجھے۔ ایسے بھیک دینے والے کوئی اور ہوں گے۔

نایک رام۔ کیوں باپ دادوں کا نام ڈبوتے ہو بھیا؟ کہتا ہوں یہ بھیک دئے بنا اب تمہارا گلا نہیں چھوٹ سکتا۔

یہ کہتے ہوئے نایک رام فوراً زمین پر بیٹھ گئے۔ اندر دت کے دونوں پیر پکڑ لئے۔ ان پر اپنا سر رکھ دیا اور بولے "اب تمہارا جو دھرم ہو وہ کرو۔ میں مورکھ ہوں گنوار ہوں پر براہمن ہوں۔ تم سامرتھی آدمی ہو جیسا مناسب سمجھو کرو۔"

اندر دت اب بھی نہ پسیجے۔ انہوں نے اپنے پیروں کو چھڑا کر چلے جانے کی کوشش کی۔ مگر اُن کے چہرہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑے لیس و پیش میں پڑے ہوئے ہیں اور اس عاجزانہ التماس کا لحاظ نہ کرنے پر نہایت شرمندہ ہیں۔ وہ طاقتور شخص تھے۔ رضاکاروں میں کوئی ان کا سا ڈیل ڈول والا نوجوان نہ تھا۔ نایک رام ابھی کمزور تھے۔ قریب تھا کہ اندر دت اپنے پیروں کو چھڑا کر نکل جائیں کہ نایک رام نے ونے سے کہا "بھیا کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ پکڑ لو ان کے پاؤں۔ پھر دیکھوں یہ کیسے نہیں پنگلتے۔"

ونے سنگھ کسی ذاتی غرض کے لئے بھی کسی کی خوشامد کرنا بُرا سمجھتے تھے پھر پاؤں پر گرنے کی تو بات ہی کیا۔ کسی سادھو مہاتما کے سامنے عاجزی کرنے سے انہیں عار نہ تھا۔ بشرطیکہ اس سے دلی عقیدت ہو۔ صرف اپنا کام نکالنے کے لئے انہوں نے سر جھکانا سیکھا ہی نہ تھا۔ مگر جب اُنہوں نے نایک رام کو اندر دت کے پیروں پر گرتے دیکھا تو خودداری کا کوئی موقعہ باقی نہ رہا۔ سوچا کہ جب میری خاطر نایک رام براہمن ہو کر یہ ذلت برداشت کر رہا ہے تو میرا دُور ہی کھڑے

ہوئے شان دکھلانا مناسب نہیں۔ اگرچہ ابھی ذرا پہلے اندردت سے انہوں نے سخت کلامی سے گفتگو کی تھی اور ان کی خوشامد کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ مگر صوفیا کا حال بھی اس کے سوا اور کسی تدبیر سے معلوم ہونا غیر ممکن تھا۔ اُنہوں نے اپنی خودداری کو بھی صوفیا پر قربان کر دیا۔ "میرے پاس یہی ایسی ایک چیز تھی جسے میں نے ابھی تک تیرے ہاتھ سے نہ دیا تھا آج اُسے بھی تیرے حوالہ کرتا ہوں۔ آتما اب بھی سر نہ جھکانا چاہتی تھی پر کمر جھک گئی" اور ایک لمحہ میں اُن کے ہاتھ اندردت کے پیروں پر جا پہنچے۔ اندر دت نے فوراً پیر کھینچ لئے اور ونے کو اٹھاتے ہوئے بولے۔ "ونے یہ کیا غضب کر رہے ہو؟"

ونے کی حالت اس نوکر کی سی تھی جسے اس کے مالک نے تھوک کر چاٹنے کا حکم دیا ہو۔ انہیں اپنی اس ذلت پر رونا آگیا۔

نایک رام نے اندردت سے کہا۔ "بھیّا مجھے بھکاری سمجھ کر دُھتکار سکتے تھے۔ مگر اب بتاؤ۔"

اندردت نے مخمصہ میں پڑ کر کہا۔ "ونے کیوں مجھے اتنا نادم کر رہے ہو۔ میں زبان دے چکا ہوں۔ کہ میں کسی سے یہ بھید نہ بتاؤں گا۔"

نایک رام۔ تم سے کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہے۔ جو اپنا دھرم سمجھو وہ کرو۔ تم آپ بدّھیمان (عقل مند) ہو۔

اندردت نے جھنجھلا کر کہا۔ "زبردستی نہیں تو اور کیا ہے؟ غرض باولی ہوتی ہے پر آج معلوم ہوا کہ وہ اندھی بھی ہوتی ہے۔ ونے تم مفت ہی اپنی آتما پر یہ ظلم کر رہے ہو۔ بھلے آدمی کیا خودداری کو بھی گھول کر پی گئے؟ تمہارا فرض تھا کہ جان دے کر بھی آتما کی حفاظت کرتے۔ اب تمہیں معلوم ہوا ہوگا کہ خودغرضی انسان کو کتنا ذلیل کر دیتی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ایک سال قبل ساری دنیا مل کر بھی تمہارا سر نہ جھکا سکتی تھی۔ آج تمہارا یہ اخلاقی تنزل ہو رہا ہے! اب اٹھو مجھے گنہگار نہ کرو۔

ونے کو اتنا غصّہ آیا کہ اس کے پیروں کو کھینچ لوں اور سینہ پر چڑھ بیٹھوں۔ ظالم اس حالت میں نیش زنی سے باز نہیں آتا۔ مگر یہ خیال کر کے کہ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ مغموم ہو کر بولے ۔" اندر دت تم مجھے جتنا ذلیل سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں۔ مگر صوفیا کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میری خودداری۔ میری دانائی۔ میری زندگی۔ میرا فرض سب کچھ محبت کی آگ میں بھسم ہو چکا۔ اگر تمہیں اب بھی مجھ پر ترس نہ آئے تو میری کمر سے پستول نکال کر میرا کام تمام کر دو۔"

یہ کہتے ہوئے ونے سنگھ آب دیدہ ہو گئے۔ اندر دت نے انہیں اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ ترحمانہ انداز سے بولے۔"ونے معاف کرو۔ اگرچہ تم نے قوم کی بدخواہی کی ہے پر میں جانتا ہوں کہ تم نے وہی کیا جو شاید تمہاری جیسی حالت میں میں یا اور کوئی شخص بھی کرتا۔ مجھے تمہاری تحقیر کرنے کا حق نہیں ہے۔ تم نے اگر محبت کے لئے خودداری کو فنا کر دیا تو میں بھی دوستی اور شرافت کے لئے اپنے وعدہ سے مکر جاؤں گا۔ جو تم چاہتے ہو وہ میں بتلا دوں گا۔ مگر اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ مس صوفیا کی نگاہوں سے تم گر گئے ہو۔ اسے اب تمہارے نام سے نفرت ہے۔ اس سے مل کر تمہیں رنج ہوگا۔"

نایک رام۔ بھیا تم اپنی سی کر دو۔ مس صاحب کو منانا و نانا ان کا کام ہے۔ عاسک (عاشق) لوگ بڑے چلنے پرزے ہوتے ہیں چپٹتے ہوئے شہدے دیکھتے ہی کر سیدھے ہوتے ہیں۔ معسوک (معشوق) کو چٹکی بجاتے اپنا کر لیتے ہیں۔ جرا آنکھوں میں پانی بھر کر دیکھا اور وہ پانی ہوا۔

اندر دت۔ مس صوفیا مجھے کبھی معاف نہ کریں گی۔ لیکن اب ان کا سا دل کہاں سے لاؤں؟ ہاں ایک بات بتلا دو۔ یہ جانے بغیر میں کچھ بھی نہ بتلا سکوں گا۔

ونے۔ پوچھو۔

اندر دت۔ تمہیں وہاں اکیلے جانا پڑے گا۔ وعدہ کرو کہ خفیہ پولیس کا کوئی آدمی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔

وینے:۔ اس سے تم بے فکر رہو۔

اندر دت۔ اگر تم پولیس کے ساتھ گئے تو صوفیا کی لاش کے سوا اور کچھ نہ پاؤ گے۔

وینے۔ میں ایسی حماقت ہی کیوں کروں گا۔

اندر دت۔ یہ سمجھ لو کہ میں صوفیا کا پتہ بتلا کر ان لوگوں کی جانیں تمہارے ہاتھوں میں رکھے دیتا ہوں جن کی کھوج میں تم نے کھانا پینا حرام کر رکھا ہے۔

نایک رام۔ بھیا چاہے اپنی جان نکل جائے اُن پر کوئی آنچ نہ آنے پائے گی۔ لیکن یہ بھی بتا دو کہ وہاں ہم لوگوں کی جان کا جوکھم تو نہیں ہے؟

اندر دت (وینے سے)۔ اگر وہ لوگ تم سے دشمنی برتنا چاہتے تو اب تک تم لوگ زندہ نہ ہوتے۔ ریاست کی ساری سنگت بھی نہیں بچا نہ سکتی۔ انہیں تمہاری ایک ایک بات کی خبر ملتی رہتی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمہاری جان ان کی مٹھی میں ہے۔ رعایا کے ساتھ اتنی بُرائی کرنے پر اگر تم ابھی زندہ ہو تو صرف مس صوفیا کی بدولت۔ اگر مس صوفیا تم سے ملاقات کرنا چاہتیں تو اس سے زیادہ آسان کوئی بات نہ تھی۔ لیکن وہ تو اب تمہارے نام سے چڑتی ہیں۔ اگر اب بھی تمہیں اُن سے ملنے کی خواہش ہو تو میرے ساتھ آؤ۔

وینے سنگھ کو اپنی قلبی تالیف کرنے والی قوت پر کامل اعتماد تھا۔ اس کی انہیں ذرا بھی فکر نہ تھی کہ صوفیا مجھ سے بات چیت نہ کرے گی۔ ہاں فکر اس بات کی تھی کہ میں نے صوفیا ہی کے لئے حکام کی جو مدد کی اُس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ صوفیا کو یہ طرزِ عمل پسند نہیں ہے۔ وہ دوستوں کے درمیان میں ہے اور خوش ہے تو میں یہ طریقہ اختیار ہی کیوں کرتا؟ مجھے رعایا سے کوئی عداوت تو تھی نہیں۔ صوفیا پر بھی تو اس کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری

ہے۔ وہ میرے مزاج سے واقف ہے تو کیا ایک خط بھیج کر مجھے اپنے حالات سے آگاہ نہ کر سکتی تھی؟ جب اُس نے ایسا نہیں کیا تو اُسے اب مجھ سے برہم ہونے کا کیا حق ہے؟

یہ سوچتے ہوئے وہ اندردت کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ بھوک پیاس سب جاتی رہی۔

(۳۰)

چلتے چلتے شام ہوگئی۔ کوہستان کی شام میدان کی راتوں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ ہر سہ اشخاص چلے جا رہے تھے لیکن ابھی منزل مقصود کا پتہ نہ تھا۔ پہاڑیوں کے سائے لمبے ہوگئے۔ سورج ڈوبنے کے پہلے ہی دن ختم ہو گیا۔ راستہ مشکل سے نظر آتا تھا۔ دونوں آدمی بار بار اندردت سے پوچھتے۔ اب کتنی دور ہے مگر یہی جواب ملتا کہ چلے آؤ۔ اب پہنچے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ونے نے ایک بار جھنجھلا کر کہا۔ اندردت! اگر تم ہمارے خون کے پیاسے ہو تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟ اس طرح گڑھا گڑھا کر کیوں مارتے ہو؟ اندردت نے اس کا بھی یہی جواب دیا کہ چلے آؤ۔ اب دور نہیں ہے۔ ہاں ذرا ہوشیار رہنا۔ راستہ خطرناک ہے۔

ونے کو اب بار بار پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ اندردت کے ساتھ کیوں آیا؟ کیوں نہ پہلے اس کے ہاتھوں صوفیا کو ایک خط بھیج دیا؟ جواب ملنے پر جب صوفیا کی تحریر پہچان لیتا تو بے خوف ہو کر اس طرف آتا۔ صوفیا اتنی سنگدل تو ہے نہیں کہ خط کا جواب ہی نہ دیتی۔ یہ عجلت کرنے میں مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اندردت کی نیت درست نہیں معلوم ہوتی۔ ان تفکرات کی وجہ سے اُس کا راستہ اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ یہ لوگ جیوں جیوں آگے بڑھتے تھے۔ راستہ بیہڑ اور ناہموار ہوتا جاتا تھا کبھی ٹیلوں پر چڑھنا پڑتا کبھی اتنا نیچے اترنا پڑتا کہ معلوم ہوتا کہ تحت الثریٰ

کو جا رہے ہیں۔ کبھی دائیں بائیں گہرے غاروں کے درمیان میں ایک تنگ سی پگ ڈنڈی مل جاتی۔ آنکھیں بالکل کام نہ دیتی تھیں۔ صرف اٹکل کا سہارا تھا جو دراصل چشمِ باطن ہے۔ ونے پستول چڑھائے ہوئے تھے۔ دل میں عہد کر لیا تھا کہ ذرا بھی شک ہوا تو اندردت پر پہلا وار کروں گا۔

دفعتاً اندردت رک گئے اور بولے —"لیجیے آ گئے۔ بس آپ لوگ یہیں ٹھہریے میں جا کر ان لوگوں کو اطلاع دے دوں"۔

ونے نے متحیر ہو کر کہا" یہاں گھر تو کوئی نظر نہیں آتا۔ بس سامنے ایک درخت ہے"۔

اندردت۔ باغیوں کے لئے ایسے ہی پوشیدہ مقامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں ملک الموت کے فرشتے بھی نہ پہنچ سکیں۔

ونے۔ مجھے یوں اکیلے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ کیوں نہ یہیں سے آواز دو۔ یا چلو میں بھی چلتا ہوں۔

اندردت۔ یہاں سے تو شاید سنکھ کی آواز بھی نہ پہنچے اور دوسروں کو لے چلنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ گھر میرا نہیں ہے اور دوسروں کے گھر میں میں آپ کو کیونکر لے جا سکتا ہوں؟ ان غریبوں کے پاس یہاں کوئی فوج یا قلعہ نہیں ہے۔ صرف راستہ کی پیچیدگی ان کی حفاظت کرتی ہے۔ مجھے دیر نہ لگے گی۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا اور کئی قدم چل کر اسی درخت کے نیچے غائب ہو گیا۔ ونے سنگھ کچھ دیر تک تو اندیشہ میں پڑے ہوئے اس کی راہ دیکھتے رہے پھر نایک رام سے بولے —"اس ظالم نے تو برا پھنسایا۔ یہاں اس سنسان مقام پر لا کر کھڑا کر دیا۔ کہ بے موت ہی مر جائیں۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا"۔

نایک رام۔ تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے؟ عاشق لوگ تو جان ہتھیلی پر لئے ہی رہتے ہیں۔ مرے تو ہم کہ سوکھے ہی برد ہے۔

ونے۔ میں اس کی نیت کو تاڑ گیا تھا۔

نایک رام۔ تو پھر کیوں بنا کان پونچھ ہلائے چلے آئے؟ اپنے ساتھ مجھے بھی ڈبو دیا۔ کیا عِسک (عشق) میں بدھی بھی گھن چکر ہو جاتی ہے؟

ونے۔ آدھ گھنٹہ ہو گیا ابھی تک کسی کا پتہ نہیں ہے۔ یہاں سے بھاگنا بھی چاہیں تو کہاں جائیں؟ اس نے ضرور دغا کی۔ زندگی کا یہیں تک ساتھ تھا۔

نایک رام۔ عاسک ہو کر مرنے سے ڈرتے ہو؟ مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ آج ہی سہی۔ ڈر کیا؟ جب اکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا غم؟ مارے اس کا جتنا جی چاہے۔

ونے۔ کہیں سچ مچ صوفیا آ جائے۔

نایک رام۔ پھر کیا کہنے؟ لپک کر ٹانگ لینا۔ مزہ تو جب آئے کہ تم ہائے ہائے کر کے رونے لگو اور وہ آنچل سے تمہارے آنسو پونچھے۔

ونے۔ بھئی دیکھنا۔ میں اُسے دیکھ کر رو پڑوں تو ہنسنا مت۔ اسے دیکھتے ہی دوڑوں گا اور اتنی زور سے پکڑوں گا۔ کہ چھڑا نہ سکے۔

نایک رام۔ یہ میرا انگوچھا لے لو۔ جھٹ پٹ اُس کے پاؤں باندھ دینا۔

ونے۔ تم ہنسی اُڑا رہے ہو اور میرا دل دھڑک رہا ہے کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے آہا میں سمجھ گیا۔ میں ادھر سے ایک بار گیا ہوں۔ ہم جسونت نگر کے آس پاس ہی کہیں ہیں۔ اندردت ہم کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے اتنا چکر دے کر لایا ہے۔

نایک رام۔ جسونت نگر یہاں ہو تو بھی کیا؟ ہم یہاں چلائیں۔ تو کون سُنے گا؟

ونے۔ کیا سچ مچ اس نے دھوکا دیا۔ کیا؟ میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہاں سے کسی طرف کو چل دیں۔ اگر صوفیا نے سخت باتیں کہنا شروع کیں تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ جس کے لئے اتنے ادھرم اور پاپ کئے اُس کی ہمدردی کیسے سہی جائے گی؟ ایسی ہی باتوں سے دُنیا سے جی کھٹا ہو جاتا ہے جس کے لئے چور بنے وہی پکارے چور۔

نایک رام۔ عورتوں کا یہی حال ہے۔

ونے ۔ جو سُنا کرتا تھا وہ آنکھوں کے آگے آ یا ۔

نایک رام ۔ میں یہ انگوچھا بچھائے دیتا ہوں ۔ پتھر ٹھنڈا ہو گیا ہے ۔ آرام سے بیٹھو ۔ مس صاحبہ آئیں ۔ تو ہمارا اچھا ۔ نہیں تو تڑکے یہاں سے چل دیں گے ۔ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی ۔ میں یہ پستول لئے بیٹھا ہوں ۔ کوئی کھٹکا ہوا تو دیکھا جائے گا ۔ میرا تو اب یہاں سے جی بھر گیا ۔ نہ جانے وہ کون دن ہو گا کہ پھر گھر کے درشن ہوں گے ۔

ونے ۔ میرا تو گھر سے ناتا ہی ٹوٹ گیا ۔ صوفیا کے ساتھ جاؤں گا تو گھر نے ہی نہ پاؤں گا ۔ صوفیا نہ ملی تو جاؤں گا ہی نہیں ۔ یہیں دھونی رما دوں گا ۔

نایک رام ۔ بھیّا تمہارے سامنے بولنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے پر ساتھ رہتے رہتے ڈھیٹھ ہو گیا ہوں ۔ مجھے تو مس صاحب ایسی کوئی بڑی اپسرا نہیں معلوم ہوتیں ۔ یہاں تو سنگھوں کی دیا سے روز ہی ایسی ایسی صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ مس صاحب اُن کے آگے پانی بھریں ۔ مکھڑا دیکھو تو جیسے ہیرا دمک رہا ہو ۔ اور ان کے لئے تم راج پاٹ چھوڑنے پر تیار ہو ۔ سچ کہتا ہوں ۔ رانی جی کو بڑا دُکھ ہو گا ۔ ماں کا دل دکھانا مہاپاپ ہے ۔ کچھ حال بھی تو نہیں ملا ۔ نہ جانے چل بسیں کہ ہیں ۔

ونے ۔ پنڈا جی ۔ میں صوفیا کے روپ کا اُپاسک (پرستار) نہیں ہوں ۔ میں خود نہیں جانتا کہ اُس میں وہ کون سی بات ہے جو مجھے اتنا کھینچ رہی ہے ۔ میں اس کے لئے راج پاٹ کیا اپنا دھرم تک چھوڑ سکتا ہوں ۔ اگر میں تمام دُنیا کا مالک ہوتا تو اُسے بھی صوفیا کی بھینٹ دیتا ۔ اگر آج مجھے معلوم ہو جائے کہ صوفیا اس دنیا میں نہیں ہے تو تم مجھے جیتا نہ پاؤ گے ۔ اُس سے ملنے کی اُمید ہی میری زندگی کا سہارا ہے ۔ اُس کے چرنوں پر جان نچھاور کر دینا ہی میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے ۔

درخت کی طرف لالٹین کی روشنی نظر آئی ۔ دو شخص آ رہے تھے ۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں جاجم ۔ ونے نے دونوں کو پہچان لیا ۔ ایک تو بیرپال سنگھ تھا اور دوسرا اس کا ساتھی ۔ بیرپال نے سامنے آ کر

لالٹین رکھ دی اور دونے کو پرنام کر کے دونوں چپ چاپ جاجم بچھانے لگے۔
جاجم بچھا کر بیر پال بولا "آئیے۔ بیٹھ جائیے۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں صاحب ابھی آ رہی ہیں"۔
امید اور ناامیدی کے مخالف حالات میں پڑ کر دونے کا دل بیٹھا جاتا تھا انہیں شرم آ رہی تھی۔ کہ جن آدمیوں کو میں نے حکام کی مدد سے تباہ کر دینے کی کوشش کی بالآخر انہیں کے دروازہ کا مجھے گدا ہونا پڑا۔ مزہ تو جب آتا کہ یہ سب ہتھکڑیاں پہنے ہوئے میرے سامنے آتے اور میں ان کو معاف کر دیتا۔ واقعی فتح کا سہرا تو انہیں کے سر رہا۔ آہ جنہیں میں بدمعاش اور قاتل سمجھتا تھا وہی آج میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔
جب وہ جاجم پر جا بیٹھے اور نایک رام ہوشیار ہو کر ٹہلنے لگے تو بیر پال نے کہا "کنور صاحب میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آج آپ کو اپنے سامنے عدالت کی کرسی پر بیٹھے نہ دیکھ کر اپنے دروازہ پر بیٹھا دیکھ رہا ہوں ورنہ ان بدنصیبوں کے ساتھ میری گردن پر بھی چھری چل جاتی جنہوں نے مار کھا کر رونے کے سوا اور کوئی قصور نہیں کیا تھا۔"
ونے۔ بیر پال سنگھ اُن باتوں کی چرچا کر کے مجھے نادم نہ کرو۔ اگر اُن کا کچھ کفارہ ہو سکتا ہے تو میں کرنے کو تیار ہوں۔
بیر پال۔ سچے دل سے؟
ونے۔ ہاں اگر مس صوفیا کی تم نے حفاظت کی ہے۔
بیر پال۔ انہیں تو آپ ابھی خود دیکھیں گے۔
ونے۔ تو میں بھی تمہیں معاف کرا دینے کی حتے الامکان کوشش کروں گا۔
بیر پال۔ آپ جانتے ہیں۔ میں مس صاحب کو کیوں لایا؟ اسی لئے کہ ہم انہیں کی خدمت اور سفارش سے اپنے بچاؤ کی اُمید رکھتے تھے۔ ہمیں

اُمید تھی کہ ہم مس صاحب کے ذریعے اپنی جانوں کی امان پانے میں کامیاب ہونگے۔ مگر بد قسمتی سے انہیں ہمارے قیاس کی بہ نسبت کہیں زیادہ گہرا زخم لگا تھا جس کے بھرنے میں پورے نو مہینے لگ گئے۔ اپنے مُنہ سے کیا کہیں یہ جتنی دلی لگن کے ساتھ ہم نے ان کی تیمار داری کی وہ ہمیں جانتے ہیں۔ یہی سمجھ لیجئے کہ مجھے چھ مہینے تک گھر سے نکلنے کا موقعہ نہ ملا۔ اتنے دنوں تک جسونت نگر میں رہا یا اور انصاف دونوں کا خون ہوتا رہا۔ روز روز کی خبریں سُنتا تھا اور اپنا ماتھا ٹھونک کر رہ جاتا تھا۔ مس صاحب کو اپنی حفاظت کے لئے لایا تھا۔ اُن کے پیچھے سارا علاقہ تباہ ہوگیا۔ خیر جو کچھ ایشور کو منظور تھا ہُوا۔ اب میری آپ سے یہی التجا ہے کہ میرے اوپر رحم کی نگاہ ہونی چاہئے۔ آپ کو پرماتما نے اس قابل بنایا ہے۔ آپ کے ایک اشارہ سے ہم لوگوں کی جان بچ جائے گی۔

ونے نے کھُلے دل سے کہا کہ مجھے تو پورا یقین ہے کہ دربار تمہارا قصور معاف کر دے گا۔ ہاں تم کو بھی یہ عہد کرنا پڑے گا کہ اب سے ریاست کے ساتھ تم کسی قسم کی عداوت نہ رکھو گے۔

بیر پال۔ میں یہ عہد کرنے کو تیار ہوں۔ کنور صاحب سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ہمیں بالکل مجبور بنا دیا۔ یہ آپ ہی کا تشدد ہے جس نے ہمیں اتنا کمزور کر دیا۔ جن جن آدمیوں پر ہمیں بھروسہ تھا وہ سب دغا دے گئے۔ دوست دشمن میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کے لئے اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے یا حکام کا اعتماد پانے کے لئے ہماری آستین کا سانپ ہوگیا۔ وہی میں ہوں کہ آج چوہے کی طرح بل میں چھپا ہُوا ہوں۔ ہر لمحہ یہی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں پولیس نہ آجائے۔

ونے۔ مس صوفیا کبھی مجھے یاد کرتی ہیں؟

بیر پال۔ مس صاحب کو آپ سے جتنی محبت ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ (اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرکے) ان کے وار سے آپ

کونسں صاحب نے ہی بچایا تھا اور مس صاحب ہی کی خاطر سے آپ اتنے دنوں تک ہمارے ہاتھوں سے بچے رہے۔ ہمیں آپ سے ملنے کا موقع نہ تھا پر ہماری بندوقوں کو تھا۔ مس صاحب آپ کو یاد کر کے گھنٹوں رویا کرتی تھیں پر اب اُن کا دل آپ سے ایسا پھٹ گیا ہے کہ آپ کا کوئی نام بھی لے لیتا ہے تو چڑ جاتی ہیں۔ وہ تو کہتی ہیں کہ مجھے ایشور نے اپنا مذہب ترک کرنے کی سزا دی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اب بھی انہیں آپ کی ذات سے گہری عقیدت ہے۔ محبت کی طرح روٹھنا بھی گہرے تعلقات کے سبب ہُوا کرتا ہے۔ آپ اُن کی جانب سے ناامید نہ ہوں۔ آپ راجہ ہیں۔ آپ کے لئے سب کچھ زیبا ہے۔ مذہب کی بندش تو چھوٹے آدمیوں کے لئے ہے۔

دفعتاً اُسی درخت کی طرف دوسری لالٹین کی روشنی دکھائی دی۔ ایک بڑھیا لوٹا لئے ہوئے آرہی تھی۔ اس کے پیچھے صوفیا تھی۔ ہاتھ میں ایک تھالی لئے ہوئے جس میں ایک گھی کا چراغ جل رہا تھا۔ وہی صوفیا تھی۔ وہی حُسن منوّر کا مجسّمہ۔ البتہ نورِ حُسن کی کمی نے اُسے ایک ناقابلِ بیان مغانیز اور روحانی نمود دے رکھی تھی۔ گویا اُس کا وجود عناصر سے نہیں بلکہ پاکیزہ نور کے ذرّات سے ہُوا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی ونے کے دل میں ایسا حوصلہ پیدا ہُوا کہ دوڑ کر اُس کے قدموں پر گر پڑوں۔ حُسن پرشکوہ فریفتہ نہیں کرتا بلکہ فتح کر لیتا ہے۔

بڑھیا نے لوٹا رکھ دیا اور لالٹین لئے چلی گئی۔ بیرپال سنگھ اور اُس کا ساتھی بھی وہاں سے ہٹ کر دور چلے گئے۔ نایک رام بھی انہیں کے ساتھ ہو لئے۔ اب وہ بے خوف تھے۔

ونے نے کہا۔ صوفیا۔ آج میری زندگی کا مبارک دن ہے۔ میں تو مایوس ہو چلا تھا۔

صوفیا۔ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ آپ کے درشن ہوئے۔ آپ کا درشن بدا تھا ورنہ مرنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔

ونے کو اپنے شکوک محض موہوم سے معلوم ہونے لگے۔ اندر دت اور میرپال نے مجھے خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ملاقات محبت کو بیدار کر دیتی ہے۔ دلی امنگ کے بہاؤ میں ان کی معصوم عقل کسی پھولوں کی مالا کی طرح بہتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ اس فقرہ میں کتنا بڑا طنز تھا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

صوفیا نے تھال میں سے دہی اور چاول نکال کر ونے کی پیشانی پر ٹیکا لگایا۔ اور مسکرا کر بولی "اب آرتی کروں گی۔"

ونے نے متاثر ہو کر کہا۔ پیاری یہ کیا ڈھکوسلا کر رہی ہو؟ تم بھی ان رسمیات کے جال میں پھنس گئیں؟

صوفیا۔ واہ۔ آپ کی خاطر تواضع کیسے نہ کروں۔ آپ میرے نجات دہندہ ہیں۔ مجھے ان ڈاکوؤں اور قاتلوں کے پنجہ سے چھڑا رہے ہیں۔ آپ کا خیر مقدم کیسے نہ کروں؟ میرے لئے آپ نے ریاست میں اندھیر مچا دیا۔ سینکڑوں بے گناہوں کا خون کر دیا۔ کتنے ہی گھر بے چراغ کر دئیے۔ ماؤں کو بیٹوں کے سوگ کا مزہ چکھا دیا۔ سہاگ والیوں کو بیوگی کی گود میں بیٹھا دیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے ضمیر کا اپنے اصولوں کا اپنے زندگی کے معیار کا ستیاناس مار دیا۔ اتنی نیکنامیاں پیدا کرنے پر بھی میں آپ کی مناسب تعظیم نہ کروں؟ میں اتنی احسان فراموش نہیں ہوں۔ اب آپ ایک حقیر خادم نہیں بلکہ ریاست کا داہنا ہاتھ ہیں راجے مہاراجے آپ کی عزت کرتے ہیں۔ میں آپ کی عزت کیسے نہ کروں؟

اب ونے کی آنکھیں کھلیں۔ طنز کا ایک ایک لفظ دل میں تیر کی طرح لگا۔ بولے۔ "صوفیا میں تمہارا وہی شیدائی اور قوم کا وہی قدیم خادم ہوں۔ تم اس طرح میری تضحیک کر کے میرے ساتھ ناانصافی کر رہی ہو۔ ممکن ہے کہ سہو کے سبب میری ذات سے دوسروں کو ایذا پہنچی ہو مگر میرا اصلی مقصد محض تمہاری حفاظت کرنا تھا۔"

صوفیا نے بگڑ کر کہا۔ "بالکل جھوٹ ہے۔ غلط ہے متہم کرنا ہے۔

یہ سب میری خاطر نہیں اپنی خاطر تھا۔ اس کا مقصد محض اس کمینہ خود سری کو آسودہ کرنا تھا۔ جو تمہارے دل میں خدمت کا سوانگ بھرے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے تمہاری حکومت پسندی پر اپنے کو قربان نہیں کیا تھا بلکہ تمہاری خدمت ہمدردی اور حب الوطنی پر۔ میں نے اس لئے تمہیں اپنا معبود بنایا تھا کہ تمہاری زندگی کا معیار بلند تھا۔ تم میں عیسے کا رحم۔ بدھ کا تیاگ۔ لوتھر کی سچائی۔ ان اوصاف کا شائبہ نظر آتا تھا۔ کیا غریبوں کو ستانے والے بیدرد۔ خود غرض حکام کی دنیا میں کمی تھی؟ تمہاری معیار پرستی نے مجھے تمہارے قدموں پر جھکایا۔ جب میں ساری خلقت کو نفس پرستی میں مبتلا دیکھ کر دنیا سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اس وقت تمہاری بے نفسی نے مجھے اپنا شیدا بنا لیا۔ لیکن اتفاقات دنیوی کے ایک ہی پلٹے نے تمہاری اصلی حالت ظاہر کر دی۔ میرا سراغ لگانے کے لئے تم نے برائی بھلائی کا خیال بھی ترک کر دیا۔ جو شخص اپنی ذاتی غرض کے لئے اس قدر زیادتی کر سکتا ہے وہ برا سے برا کام بھی کر سکتا ہے۔ تم اپنے معیار سے اسی وقت گر گئے جب تم نے اس بغاوت کو فرد کرنے کے لئے غیر اشتدادی ذرائع کی بہ نسبت جبر و تشدد سے کام لینا زیادہ مناسب خیال کیا۔ شیطان نے پہلی مرتبہ تم پر وار کیا اور تم پھر نہ سنبھلے۔ برابر گرتے ہی چلے گئے۔ ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے کھاتے اب تم اتنا گر گئے ہو کہ تم میں شرافت تمیز اور مردانگی کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ تمہیں دیکھ کر میرا سر خود بخود جھک جاتا تھا۔ میری محبت کی بنیاد عقیدت تھی۔ وہ بنیاد اب جڑ سے ہل گئی۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ آہ مجھے جتنا مغالطہ ہوا اتنا کبھی کسی کو نہ ہوا ہوگا۔ جس شخص کے لئے اپنے والدین سے منحرف ہوئی۔ اپنا گھر بار چھوڑا۔ جس پر اپنے دیرینہ اصولوں کو قربان کر دیا۔ جس کے لئے ذلت رسوائی بدنامی سب باتیں برداشت کیں وہ اتنا خود غرض۔ اتنا نفس پرست۔ اتنا کم فہم نکلا۔ کوئی دوسری عورت تمہارے ان اوصاف؟ پر فریفتہ ہو سکتی ہے۔ محبت کے معاملہ میں عورتیں معیار کا

لحاظ نہیں کرتیں۔ لیکن میری تعلیم۔ میری صحبت۔ میرا مطالعہ اور سب سے زیادہ تمہیں طبعی میلان نے مجھے ان باتوں کی قدر کرنا نہیں سکھلایا۔ اگر آج تم ریاست کے ہاتھوں ظلم ذلت اور سزا سے تکلیف پاکر میرے سامنے آتے تو میں تمہاری بلائیں لیتی۔ تمہارے پیروں کی خاک اپنے ماتھے پر لگاتی اور اپنے نصیبوں کو سراہتی۔ لیکن مجھے اس چیز سے نفرت ہے جسے لوگ کامیاب زندگی کہتے ہیں۔ کامیاب زندگی مترادف ہے۔ خوشامد ظلم اور دغا کی۔ میں جن مہاتماؤں کو دنیا میں بزرگ ترین خیال کرتی ہوں۔ ان کی زندگیاں کامیاب نہ تھیں۔ دنیاوی نقطۂ خیال سے وہ لوگ معمولی آدمیوں سے بھی گئے گذرے تھے۔ جنہوں نے تکلیفیں اٹھائیں جلا وطن ہوئے۔ پتھروں سے مارے گئے کوسے گئے اور بالآخر دنیا نے اُن کو بلا ایک بوند آنسو گرائے بھی اپنے یہاں سے رخصت کر دیا۔ بہشت کو بھیج دیا۔ تم پولیس کی ایک جماعت لے کر مجھے کھوجنے نکلے۔ اس کا مقصد یہی کہ رعایا پر رُعب قائم کیا جائے۔ میری رائے میں جس ریاست کا وجود ہی ظلم پر مبنی ہو اُس کا نشان جتنا ہی جلد مٹ جائے اُتنا ہی اچھا۔ خیر اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟ تمہیں اپنی یہ عزت وشوکت مبارک ہو۔ میں تو اپنے اسی حال میں خوش ہوں۔ جن کے ساتھ ہوں۔ وہ دردمند ہیں جو کسی بیکس کی حمایت میں اپنی جان تک دے سکتے ہیں۔ ان کے دلوں میں تم سے کہیں زیادہ خدمت وایثار کے جذبات موجود ہیں۔

ولنے آزردہ خاطر ہو کر بولے۔ صوفیا الینور کے لئے میرے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کرو۔ اگر میں منصب و وقار کا خواہشمند ہوتا تو آج میری حالت ایسی قابلِ رحم نہ ہوتی۔ میں نے وہی کیا جو مجھے قرینِ انصاف معلوم ہوا۔ میں حتے الامکان ایک لمحہ کے لئے بھی حق سے منحرف نہیں ہوا۔

صوفیا۔ یہی تو افسوس ہے کہ تمہیں وہ بات کیوں قرینِ انصاف معلوم ہوئی جو خلاف انصاف تھی۔ اس سے تمہارے دلی میلان کا پتہ چلتا ہے۔

تم فطرتاً خود غرض واقع ہوئے۔ انسانوں کو سبھی چیزیں یکساں عزیز نہیں ہوتیں۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو نام کے لئے دولت کو ٹھیکروں کی طرح لٹاتے ہیں۔ وہ اپنے کو بےغرض نہیں کہہ سکتے۔ خود غرضی کا بلند معیاری سے کیا تعلق؟ جس کے ارادے اتنے کمزور ہیں اس کی کم از کم میں ذرا بھی عزت نہیں کر سکتی اور عزت کے بغیر محبت محض بدنامی کا سبب ہوتی ہے۔

ونے اُن لوگوں میں نہ نکلے جن پر مخالف حالات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اُن کے دل پر مایوسی جلد ہی قبضہ کر لیتی تھی۔ بیقرار ہو کر بولے۔ صوفی مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اُسے حق سمجھ کر یا حالاتِ گرد و پیش سے مجبور ہو کر کیا ہے۔

صوفیا۔ دُنیا میں جتنے کام ہوتے ہیں۔ وہ سب سہواً یا ضرورتاً ہوتے ہیں کوئی تیسرا سبب میں نے آج تک نہیں سُنا۔

ونے۔ صوفیا اگر میں جانتا کہ میری طرف سے تمہارا دل اتنا سخت ہو گیا ہے تو تمہیں منہ نہ دکھاتا۔

صوفیا۔ میں تمہارے منہ دیکھنے کی بہت شائق نہ تھی۔

ونے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ مگر مان لو کہ میں نے مظالم ہی کئے تو کیا مجھے تمہارے ہاتھوں یہ سزا ملنی چاہئے؟ یہ خوف مجھے ماتا جی سے تھا تم سے نہ تھا۔ آہ صوفی! اس محبت کا یوں خاتمہ نہ ہونے دو۔ یوں میری زندگی کو برباد نہ کرو۔ اُسی محبت کے تعلق سے جو تم کو کبھی میرے ساتھ تھی مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ یہ تکلیف میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ تمہیں یقین نہ آئے گا کیونکہ اس وقت تمہارا دل میری طرف سے پتھر ہو گیا ہے لیکن یہ صدمہ میرے لئے مہلک ثابت ہوگا اور اگر موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے تو اُس زندگی میں بھی یہی صدمہ میرے دل کو تڑپاتا رہے گا۔ صوفیا میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بھالے کی نوک کو سینہ پر لے سکتا ہوں۔ مگر تمہاری بےرُخی نظر۔

تمہارا یہ بیدردانہ برتاؤ واقعی سوہان روح ہے۔ اس سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ تم مجھے زہر دے دو۔ میں اس پیالہ کو آنکھیں بند کرکے یوں پی جاؤں گا۔ جیسے کوئی بھگت چرنامرت پیتا ہے۔ مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ یہ زندگی جسے تمہاری نذر کر چکا تھا تمہارے ہی کام آ گئی۔

یہ عشقیہ الفاظ شاید اور کسی وقت ونے کے منہ سے نہ نکلتے۔ شاید انہیں پھر یاد کرکے ان کو حیرت ہوتی کہ یہ الفاظ میرے منہ سے کیوں نکلے۔ مگر اس وقت خیالات کے جوش نے انہیں زیادہ لسان بنا دیا تھا۔ صوفیا بے اعتنائی کے ساتھ سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر بیدردانہ لہجہ میں بولی ― "ونے میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے دل میں ابھی جو کچھ تمہاری عزت باقی ہے اسے بھی پامال نہ کرو۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ الفاظ تمہارے دل سے نہیں نکل رہے بلکہ تم سوچ رہے ہو کہ کیونکر اس سے اپنی توہین کا بدلہ لوں۔ مجھے تعجب ہوگا اگر صبح ہوتے ہوتے یہ مقام خفیہ پولیس کے سپاہیوں سے بھر نہ جائے۔ یہاں کے رہنے والے حراست میں لے نہ لئے جائیں اور انہیں بالآخر سزائے موت نہ دی جائے۔ میری سزا کے لئے تم نے کوئی اور ہی طریقہ سوچ رکھا ہوگا۔ میں نہیں خیال کر سکتی کہ وہ کیا ہے لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں۔ کہ اگر مجھے بدنام کرکے یا میرے چال چلن کو برا بتلا کر تم مجھ سے جسمانی خواہ روحانی تکلیف پہنچا سکو گے تو تمہیں ایسا کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو مگر میں اس کو دل سے نہیں نکال سکتی۔ کوئی ایسا جادو کوئی ایسا معجزہ نہیں ہے جو تمہیں پھر میری نگاہوں میں قابل احترام بنا سکے۔ جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوں۔ اس کے لئے میرے دل میں جگہ نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے ان باتوں سے دکھ نہیں ہو رہا ہے۔ ایک ایک لفظ میرے دل پر آرے کا کام کر رہا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھو کہ تمہیں دل سے نکال کر میں پھر کسی دوسری صورت کو اس میں جگہ دوں گی حالانکہ تمہارے

دل میں ایسے احساسات ہوں تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ نہیں، یہی میری محبت کا اول اور آخر دور ہے۔
اب یہ زندگی اس سے بہتر کاموں میں صرف ہوگی۔ کون جانے ایشور نے مجھے راہ حق سے
منحرف ہونے کی تمہارے ہی ہاتھوں سزا دلائی ہو۔ تمہارے لئے میں نے وہ سب
کچھ کیا جو نہ کرنا چاہئے تھا۔ مکر۔ فریب۔ چالاکی۔ تریاچرتر ایک سے بھی عار نہیں
کیا۔ کیونکہ میری معصوم نگاہوں میں تم ایک بے لوث اور پاک روحانی وجود تھے۔
تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مسٹر کلارک کے ساتھ آنے میں مجھے کتنی روحانی تکلیف
برداشت کرنی پڑی۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم میری زندگی کے لئے مشعلِ ہدایت کا
کام دو گے۔ میری زندگی کو سدھار دو گے۔ سنوار دو گے۔ کامیاب بناؤ گے۔ آخر مجھ میں
کون سا ایسا وصف ہے جس پر تم مفتون ہو؟ اگر حسن کے طالب ہو تو حسن کی دنیا
میں کمی نہیں ہے۔ تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ حسین عورتیں مل سکتی ہیں۔ اگر میری
باتیں تمہیں میٹھی معلوم ہوتی ہیں تو تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ شیریں کلام عورتیں
مل سکتی ہیں۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جلد یا دیر میں تمہیں اپنی پسند
اور طبیعت کے موافق کوئی حسینہ مل ہی جائے گی جس کے ساتھ تم اپنی ثروت و
شوکت کا [illegible] اٹھا [illegible] گے کیونکہ [illegible] خادم [illegible] بننے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے اور
نہ ہو سکتی ہے۔ یہ ادا [illegible] کے لئے دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ
دیکھے گا۔ [illegible] تم نے مجھے تارک الدنیا بنا دیا۔ میری
نفسانی [illegible] کر دیا۔ مذہبی کتب کے دائمی مطالعہ سے جو راستہ نہ ملا۔
اسے [illegible] دیا۔ اس کے لئے تمہاری ممنون ہوں۔ مذہب اور راستی
کی [illegible] سے کون [illegible] لاولد؟ لامذہبی۔ اب لامذہبی کی قدر [illegible] کرو گی
جا [illegible] ہو گیا [illegible] ان [illegible] بیہ قوت کا انتقام لیا [illegible] گی جنہوں نے [illegible]
گردنوں پر [illegible] بیٹھے ہیں۔ ایک ایک کو دوزخ [illegible] میں جھونک دوں گی۔
جبھی میرے دل کو تسکین ہوگی۔ جو لوگ آج بے گناہوں کا خون بہا کر عزت اور
نیک نامی بھوگ رہے ہیں انہیں دوزخ کے آتش کدہ میں جلا [illegible] رجب تک

ظالموں کی اُس جماعت کو تباہ نہ کر دوں گی۔ چین نہ لوں گی خواہ اس کام میں مجھے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ خواہ ریاست میں انقلاب کیوں نہ پیدا ہو جائے۔ خواہ ریاست کا نشان ہی کیوں نہ مٹ جائے۔ میرے دل میں یہ خواہش ارادہ تمہیں نے پیدا کیا ہے اور اس کا الزام تمہاری ہی گردن پر ہے۔ عیسےٰ کا عفو و رحم۔ بُدھ کا استقلال اور تزکیہ نفس۔ کرشن کی محبت اور بے تعلقی کی غیر فانی شہرت بھی اب میرے اس خون کی پیاس کو نہیں بجھا سکتی۔ برسوں کا غور و خوض مطالعہ اور خیال تمہاری بد اعمالیوں کے ہاتھوں رائیگاں ہو گیا۔ بس اب جاؤ۔ میں جو کچھ کروں گی وہ تم سے کہہ چکی۔ تمہاری جو مرضی ہو وہ تم بھی کرو۔ میں آج سے باغیوں کے گروہ میں شامل ہوتی ہوں۔ تم خفیہ پولیس کے دامن میں پناہ لو۔ جاؤ ایشور پھر ہم کو نہ ملائے۔

یہ کہہ کر صوفیا نے طشت اٹھا لیا اور چلی گئی جیسے امید دل سے نکل جائے۔ ونے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جو درد بھری صدا سے کم دلسوز نہ تھی اور زمین پر بیٹھ گئے جیسے کوئی بد نصیب بیوہ اپنے پیارے شوہر کی لاش اٹھ جانے کے بعد ایک سرد آہ بھر کر بیٹھ جائے۔

تینوں آدمی جو دور کھڑے تھے آکر ونے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ نایک رام نے کہا " بھیا آج تو خوب کھوب باتیں ہوئیں۔ تم نے بھی پکڑ پایا تو اتنے دنوں کی کسر نکال لی۔ آگئی پنجہ میں نا؟ وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ عاسک لوگ بڑے چلمہ باج ہوتے ہیں۔ پہلے تو خوب آرتی اتاری۔ دہی چاول کا ٹیکہ لگایا میم ہیں تو کیا۔ ہم لوگوں کی رسمیں جانتی ہیں۔ کب چلنا طے ہُوا؟ جلدی چلو میرا ابھی گھر بسے۔"

ونے کی آنکھیں اشک آلودہ تھیں مگر اس جُملہ پر ہنس پڑے۔ بولے " بس اب دیر نہیں ہے۔ گھر کو خط لکھ دو تیاری کریں۔"

نایک رام۔ بھیا آنند تو تب آئے جب دونوں بارا تیں ساتھ ہی نکلیں۔

وسے۔ ہاں جی۔ ساتھ ہی نکلیں گی۔ پہلے تمہاری۔ پیچھے میری۔
نایک رام: ٹھیک کرو۔ اب سواری کا بندوبست کرو۔ جس میں ہم لوگ کل سویرے ٹھنڈے ٹھنڈے نکل جائیں۔ یہاں پالکی تو مل جائے گی نا؟"
بیرپال۔ سب انتظام ہو جائے گا اب بھوجن کرکے آرام کیجئے۔ دیر ہو گئی ہے۔
وِنے۔ یہاں سے جسونت نگر کتنی دُور ہے؟
بیرپال۔ یہ پُوچھ کر کیا کیجئے گا؟
وِنے۔ مجھے ابھی وقت وہاں پہنچنا چاہیئے۔
بیرپال۔ (متفکر ہو کر) آپ دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں۔ راستہ خراب ہے۔
وِنے۔ کوئی ہرج نہیں۔ چلا جاؤں گا۔
نایک رام۔ بھیّا۔ مس صاحب ابھی رہیں گی نا؟ رات کو کیسے چلو گے؟
وِنے۔ تمہیں تو خبط سا ہو گیا ہے۔ مس صاحب میری کون ہوتی ہیں اور میرے ساتھ کیوں جانے لگیں؟ اگر آج میں مر جاؤں تو شاید اُن سے زیادہ خوشی اور کسی کو نہ ہوگی۔ تمہیں تھکاوٹ معلوم ہوتی ہو تو آرام کرو مگر میں تو یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے کانٹوں بھری راہ بھی یہاں کی پھولوں والی سیج سے زیادہ آرام دہ ہوگی۔ آپ لوگوں میں سے کوئی راستہ دکھلا سکتا ہے؟
بیرپال۔ چلنے کو تو میں خود حاضر ہوں لیکن راستہ نہایت خطرناک ہے۔
وِنے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے اسی وقت پہنچا دیجئے اور ہو سکے تو آنکھوں پر پٹی باندھ دیجئے۔ مجھے اب اپنے اوپر ذرا بھی اعتبار نہیں رہا۔
بیرپال۔ بھوجن تو کر لیجئے۔ اتنی خاطر تو کیجئے۔
وِنے۔ اگر مہمان نوازی کرنی ہو تو مجھے گولی مار دیجئے۔ اس سے بڑھ کر آپ میری خاطر نہیں کر سکتے۔ میں نے آپ کے ساتھ کتنی بُرائی کی ہے۔ اگر آپ نے اس کا سواں حصّہ بھی میرے ساتھ کیا ہوتا تو مجھے کسی ترغیب کی ضرورت نہ پڑتی۔

میں شیطان ہوں۔ قاتل ہوں۔ زمین میرے بوجھ سے جس قدر ہلکی ہو جائے اُتنا ہی اچھا۔

نایک رام۔ معلوم ہوتا ہے۔ مس صاحب سچ مچ پھرنٹ ہو گئیں مگر کہے دیتا ہوں کہ وہ دو ہی چار دن میں تمہارے پیچھے پیچھے دوڑتی پھریں گی۔ عاشق کی ہائے بُری ہوتی ہے۔

بیرپال۔ کنور صاحب۔ میرا اتنا کہنا مانئے کہ ابھی نہ جائیے۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں مس صاحب آپ کے یوں چلے جانے سے گھبرا نہ جائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل سورج نکلتے تک آپ جسونت نگر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت کچھ بھوجن کر لیجئے۔

ونے۔ میرے لئے اب یہاں کا پانی بھی حرام ہے۔ اگر تمہیں نہیں چلنا ہے تو نہ سہی۔ مجھے تم سے اتنی خاطر داری کرانے کا حق نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔

بیرپال مجبور ہو کر ساتھ جانے کو تیار ہوا۔ نایک رام کا بھوک سے بُرا حال تھا۔ مگر کیا کرتے۔ ونے کو جاتے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں اشخاص روانہ ہو گئے۔

آدھ گھنٹے تک تینوں آدمی چپ چاپ چلتے رہے۔ ونے کو صوفیا کی اور سب باتیں تو یاد نہ تھیں، مگر ان تینوں پر اُس نے حملے کئے تھے اور اُن کے بارہ میں جو نفرت بھری پیشینگوئیاں [illegible] لفظ اُن کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ صوفیا مجھے اتنا کم ظرف سمجھتی ہے۔ وہ [illegible] ابھی تو [illegible] نہیں چاہتی۔ دل کی اتفاقیہ تحریک [illegible] کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑتی۔

دفعتاً اُنہوں نے بیرپال سے پوچھا — "تمہاری رائے میں میں جوش میں آکر یہ بے انصافی کر بیٹھا یا جیسے مس صوفیا کہتی ہیں میں فطرتاً کمینہ ہوں۔

بیرپال۔ کنور صاحب۔ مس صوفیا کی اس وقت کی باتوں کا ذرا بھی برا

نہ مانے۔ جس طرح پرش میں آپ کے چرنوں بجا نہیں رہ سکے ویسے ہی وہ بھی پرش میں واسنائیں پک گئی ہوں گی۔ جب آپ نے سیوا اور پراپکار کے لئے راج کو چھوڑ دیا تو کس کا منہ ہے کہ آپ کو خود غرض کہہ سکے۔

ونے۔ نہ جانے اس نے اتنی سخت کلامی کہاں سے سیکھ لی؟ آدمی بھکاری کو بھی جواب دے تو نرمی سے۔ اس نے تو مجھے اس طرح دھتکارا جیسے کتے کو۔

نایک رام۔ کسی انگریز کو بیاہے گی اور کیا۔ یہاں کالے آدمیوں کے پاس کیا دھرا ہے۔ مرغی کا انڈا کہاں ملے گا؟

ونے۔ تم بالکل بیوقوف ہو۔ نہیں مرغی کے انڈے ہی کی پڑی ہے۔

نایک رام۔ ایک بات کہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ وہ آزادی کہاں پاتیں؟ اسے کر رانی بنا دو گے۔ پردہ میں بٹھا دو گے۔ گھوڑی پر سوار کرا کر سیر کرا سکو گے تو تم جاؤ گے؟ کمر میں ہاتھ ڈال کر گھمانے پر تو نہ بٹھاؤ گے؟ ٹوپی اتار کر ٹھہر آئے بیرے تو نہ کرو گے؟

ونے۔ پھر وہی حماقت کی باتیں۔ ارے بولنگا مہاراج۔ صوفیا کو تم نے کیا سمجھا ہے۔ ہمارے مذہب سے جتنی وہ واقف ہے اتنا کوئی پنڈت بھی نہ ہوگا۔ وہ ہمارے یہاں کی دیویوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اسے تو کسی راجہ کے گھر پیدا ہونا چاہئے تھا۔ نہ جانے عیسائی گھرانے میں کیوں پیدا ہوئی؟ مجھ سے منہ پھیر کر وہ اب کسی کو منہ نہیں لگا سکتی۔ اس کا مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنی آنکھوں کا۔ وہ اب شادی نہیں کرے گی۔

بیرپال۔ آپ بہت سچ کہتے ہیں۔ واقعی وہ دیوی ہیں۔

ونے۔ سچ کہنا۔ کبھی میرا تذکرہ بھی کرتی تھیں؟

بیرپال۔ اس کے سوا تو انہیں اور کوئی بات ہی نہ تھی۔ زخم گہرا تھا بیہوش پڑی رہتی تھیں مگر چونک چونک کر آپ کو پکارا اٹھتی تھیں۔ کبھی کہتیں کہ ونے کو بلا دو انہیں دیکھ کر مروں گی۔ کبھی کبھی تو کئی کئی دن تک آپ ہی کی رٹ لگی رہتی۔

جب کسی کو دیکھتیں یہی پوچھتیں۔ ونے آئے؟ کہاں ہیں؟ میرے سامنے لاتا۔ اُن کے چرن کہاں ہیں؟ ہم لوگ اُن کی حالت دیکھ دیکھ کر رونے لگتے تھے۔ جرّاح نے ایسی چیر پھاڑ کی کہ آپ سے کیا کہوں۔ یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس کو دیکھتے ہی سُوکھ جاتی تھیں۔ لیکن ہم جیوں ہی کہہ دیتے کہ آج ونے سنگھ کے آنے کی خبر ہے تو بس فوراً دل مضبوط کر کے مرہم پٹی کرا لیتی تھیں۔ جرّاح سے کہتی تھیں۔ جلدی کرو۔ وہ آنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو آ جائیں۔ بس یہ سمجھئے کہ آپ کے نام نے اُنہیں موت کے منہ سے نکال لیا۔

ونے سنگھ نے دردناک لہجہ میں کہا۔ بس کرو۔ اب اور کچھ نہ کہو۔ یہ دُکھ بھری کہانی نہیں سنی جاتی۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

بیرپال۔ ایک روز اُسی حالت میں آپ کے پاس جانے کو تیار ہو گئیں۔ رو رو کر کہنے لگیں۔ اُنہیں لوگوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں اُنہیں چھڑانے جا رہی ہوں۔ . .

ونے۔ رہنے دو۔ بیرپال! ورنہ دل پھٹ جائے گا۔ اُس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مجھے ذرا کہیں لٹا دو۔ نہ جانے کیوں دل ڈوبا جاتا ہے۔ آہ مجھ جیسے بدنصیب کے لئے یہی مناسب سزا ہے۔ دیوتاؤں سے میرا سُکھ نہ دیکھا گیا۔ ان سے کسی کا کبھی بھلا نہیں ہوا۔ چلے چلو۔ نہ لیٹوں گا۔ مجھے اسی وقت جسونت نگر پہنچنا ہے۔

پھر لوگ چپ چاپ چلنے لگے۔ ونے اتنی تیزی سے چل رہے تھے گویا دوڑ رہے ہیں۔ دُکھتے ہوئے اعضا میں عجیب پھُرتی آ گئی تھی۔ بیچارے نایک رام دوڑتے دوڑتے ہانپ رہے تھے۔ رات کے دو بجے ہوں گے۔ ہوا میں جان بخش تازگی آ گئی تھی۔ کم سن حسینۂ شب پوری جوانی پر پہنچ گئی تھی۔ جب اُس لاشعوری دلکشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب اُس کی جادو بھری طاقت کا متسد نہیں کیا جا سکتا۔ نایک رام تو کئی بار ادونگھ کر گرتے گرتے بچ گئے۔ ونے تو آرام کرنے کی خواہش ہونے لگی کہ بیرپال بولے لیجئے جسونت نگر پہنچ گئے

ونے۔ ارے اتنی جلد! ابھی تو چلتے ہوئے کل چار ہی گھنٹے ہوئے ہوں گے۔

بیرپال۔ آج اسیدھے آئے۔

وِنے۔ آؤ۔ آج یہاں کے حاکم سے تمہاری صفائی کرا دوں۔

بیرپال۔ آپ سے صفائی ہو گئی تو اب کسی کا غم نہیں ہے۔ اب مجھے یہیں سے رخصت کیجئے۔

وِنے۔ ایک روز کیلئے تو میرے مہمان ہو جائیے۔

بیرپال۔ ایشور نے چاہا تو جلد ہی آپ کے درشن ہوں گے۔ مجھ پر نظرِ عنایت رکھئے گا۔

وِنے۔ صوفیا سے میرا کچھ ذکر نہ کیجئے گا۔

بیرپال۔ جب تک وہ خود نہ چھیڑیں گی میں نہ کروں گا۔

وِنے۔ میری یہ گھبراہٹ یہ دیوانگی اس کا ذکر تو بھول کر بھی نہ کیجئے گا۔ میں نہ جانے کیا کیا بک رہا ہوں۔ اپنی زبان اور خیالات پر مجھے ذرا بھی قابو نہیں رہا۔ ہیجان سا ہو رہا ہوں۔ آپ اُن سے اتنا ہی کہہ دیجئے گا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں بولے۔ اس کا وعدہ کیجئے۔

بیرپال۔ اگر وہ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں گی۔ تو میں کچھ نہ کہوں گا۔

وِنے۔ میری خاطر سے اتنا ضرور کہہ دیجئے گا کہ آپ کا ذرا بھی ذکر نہ کرتے تھے۔

بیرپال۔ جھوٹ تو نہ بولوں گا۔

وِنے۔ جیسی تمہاری مرضی۔

(۳۱)

بھیرو کے گھر سے نکل کر سورداس اپنی جھونپڑی میں آ کر سوچنے لگا۔ کیا کروں کہ دفعتاً دیا گر آ گئے اور بولے ــــ سورداس آج تو لوگ تمہارے اوپر بہت گرم ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں اسے گھمنڈ ہو گیا ہے۔ تم اس نابالغ

کیوں پڑے ہو؟ کیوں نہیں میرے ساتھ کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلتے؟

سور داس۔ ہاں یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ چلو تو میں بھی نکل پڑوں۔

دیا گر۔ ہاں۔ چلو۔ تب تک میں بھی مندر کا کچھ ٹھکانا کروں۔ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے۔ جو میرے پیچھے یہاں دیا بتی کر دے۔ بھوگ لگانا تو دور رہا۔

سور داس۔ تمہیں مندر سے کبھی چھٹی نہ ملے گی۔

دیا گر۔ بھائی یہ بھی تو نہیں ہوتا کہ مندر کو یونہی بلا حفاظت چھوڑ کر چلا جاؤں۔ پھر نہ جانے کب لوٹوں۔ تب تک تو یہاں گھاس جم جائے گی۔

سور داس۔ تو جب تم آپ ہی ابھی اس مایا جال میں پھنسے ہوئے ہو تو مجھے کیونکر چھڑا سکو گے۔

دیا گر۔ نہیں جلد ہی چلوں گا۔ ذرا پوجا کے لئے پھول لیتا آؤں۔

دیا گر چلے گئے تو سور داس پھر سوچ میں پڑ گیا۔ سنسار کی بھی کیا لیلا ہے۔ کہ ہوم کرتے ہاتھ جلتے ہیں۔ میں تو نیکی کرنے گیا تھا اور اس کا یہ پھل ملا۔ محلہ والوں کو یقین آ گیا۔ بُری باتوں پر لوگوں کو کتنی جلد یقین آ جاتا ہے۔ مگر نیکی بدی کبھی چھپی نہیں رہتی۔ کبھی نہ کبھی تو اصلی بات معلوم ہی ہو جائے گی۔ ہار جیت تو زندگانی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کبھی جیتوں گا تو کبھی ہاروں گا۔ اس کی چنتا ہی کیا؟ ابھی کل بڑے بڑے لوگوں سے جیتا تھا۔ آج جیتے میں بھی ہار گیا۔ یہ تو کھیل میں ہوا ہی کرتا ہے۔ اب بیچاری سبھاگی کہاں جائے گی؟ محلہ والے تو اب اسے یہاں رہنے نہ دیں گے اور رہے گی کس کے سہارے پر؟ کوئی اپنا تو ہو۔ میکے میں بھی تو کوئی نہیں ہے۔ جوان عورت اکیلی کہیں رہ بھی نہیں سکتی۔ زمانہ ایسا بُرا آ گیا ہے۔ اس کی آبرو کیسے بچے گی؟ بھیرو کو کتنا چاہتی ہے۔ سمجھتی تھی کہ میں اُسے مارنے گیا ہوں۔ اسے ہوشیار رہنے کے لئے کتنا زور دے رہی تھی۔ وہ تو اتنا پریم کرتی ہے اور بھیرو کا کبھی منہ ہی نہیں سیدھا ہوتا۔ ابھاگنی ہے اور کیا۔ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اُس کے چرن دھو دھو کر پیتا۔ یہ بھیرو کو سب دیکھو اُس پر

تلوار ہی کھینچے رہتا ہے۔ میں کہیں چلا گیا تو اُس کا کوئی پوچھنے والا بھی نہ رہے گا۔ محلہ والے اُس کی چھیچھا لیدر ہوتے دیکھیں گے اور ہنسیں گے۔ کہیں نہ کہیں ڈوب مرے گی۔ کہاں تک صبر کرے گی۔ اس آنکھوں والے اندھے بھیرو کو تھوڑا بھی خیال نہیں ہے کہ میں اِسے نکال دوں گا تو کہاں جائے گی۔ کل کو مسلمان پاکستان ہو جائے گی۔ تو سارے نگر میں ہل چل مچ جائے گی پر ابھی اس کے آدمی کو کوئی سمجھانے والا نہیں ہے۔ کہیں بھرتی والوں کے ہاتھ پڑ گئی تو پتہ بھی نہ لگے گا کہ کہاں گئی۔ سبھی لوگ جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔ وہ یہی سوچتا ہُوا سڑک کی طرف چلا تھا کہ سبھاگی آ کر بولی — سورداس میں کہاں رہوں گی؟

سُور داس نے ظاہری بے رُخی سے کہا۔ میں کیا جانوں کہاں رہے گی۔ ابھی تو ہی تو بھیرو سے کہہ رہی تھی کہ لاٹھی لے کر جاؤ۔ تو کیا یہ سمجھتی تھی کہ میں بھیرو کو مارنے آیا ہوں؟

سُبھاگی۔ ہاں سُورداس۔ جھوٹ کیوں بولوں۔ مجھے وہ کھٹکا تو ہُوا تھا۔

سُورداس۔ جب تیری سمجھ میں میں اِتنا بُرا ہوں۔ تو پھر مجھ سے کیوں بولتی ہے؟ اگر وہ لاٹھی لے کر آتا اور مجھے مارنے لگتا تو تُو تماشا دیکھتی اور ہنستی کیوں؟ تجھ سے تو بھیرو ہی اچھا کہ لاٹھی پاس تھی لے کر نہیں آیا۔ جب تو نے مجھ سے بَیر ٹھان رکھا ہے تو میں تجھ سے کیوں نہ بیر ٹھانوں؟

سُبھاگی (روتی ہوئی)۔ سورداس تم بھی ایسا کہو گے تو یہاں کون ہے جس کی آڑ میں میں چھن بھر بھی بیٹھوں گی؟ اُس نے ابھی مارا ہے مگر پیٹ نہیں بھرا۔ کہہ رہا ہے کہ جا کر تھانے میں لکھائے دیتا ہوں۔ میرے کپڑے لتے سب باہر پھینک دیئے ہیں۔ اس جھونپڑی کے سوا اب میرا اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

سُورداس۔ مجھے بھی اپنے ساتھ محلّہ سے نکلوائے گی کیا؟

سُبھاگی۔ تم جہاں جاؤ گے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔

سُورداس۔ تب تو تُو مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رکھے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ اندھا اُسے بھگا کر لے گیا۔

سُبھاگی۔ تم تو بدنامی سے بچ جاؤ گے لیکن میری آبرو کیسے بچے گی؟ ہے کوئی محلہ میں ایسا جو کسی کی آبرو جاتے دیکھے تو اس کی بانہہ پکڑ لے؟ یہاں تو ایک ٹکڑا روٹی بھی مانگوں تو نہ ملے۔ تمہارے سوا اب میرا کوئی نہیں ہے۔ پہلے میں تمہیں آدمی سمجھتی تھی۔ اب دیوتا سمجھتی ہوں۔ چاہے تو رہنے دو نہیں تو کہہ دو کہیں منہ میں کالکھ لگا کر ڈوب مروں۔

سُورداس نے دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ سُبھاگی تو آپ سمجھدار ہے۔ جیسا جی میں آئے کر۔ مجھے تیرا کھلانا پہنانا بھاری نہیں ہے۔ ابھی شہر میں اتنا مان ہے کہ جس کے دروازے پر کھڑا ہو وہ ناہیں نہ کرے گا۔ لیکن میرا من کہتا ہے کہ تیرے یہاں رہنے سے ہمارا کلیان نہ ہوگا۔ ہم دونوں ہی بدنام ہو جائیں گے۔ میں تجھے اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ لیکن اندھا سنسار تو کسی کی نیت نہیں دیکھتا۔ ابھی تو نے دیکھا لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے رہے۔ پہلے بھی گالی اٹھ چکی ہے۔ جب تک تو کھلم کھلا میرے گھر میں رہے گی تب تو انرتھ ہی ہو جائے گا۔ لوگ گردن کاٹنے پر اُوتارو ہو جائیں گے۔ بتا کیا کروں؟

سُبھاگی۔ جو چاہے کرو۔ پر میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔

سُورداس۔ یہی تیری مرجی (مرضی) ہے تو یہی سہی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ کہیں چلا جاؤں۔ نہ آنکھوں دیکھوں گا نہ پیڑ ہوگی لیکن تیری بپت دیکھ کر اب جانے کا من نہیں ہوتا۔ آ۔ پڑی رہ۔ جیسی کچھ سر پر آئے گی دیکھی جائے گی تجھے منجدھار میں چھوڑ دینے سے بدنام ہونا اچھا ہے۔

یہ کہہ کر سُورداس بھیک مانگنے چلا گیا۔ سُبھاگی جھونپڑی میں آ بیٹھی۔ دیکھا تو اس مختصر گھر کی مختصر گرہستی ادھر اُدھر پھیلی پڑی تھی۔ کہیں لوٹیا اوندھی پڑی تھی۔ کہیں گھڑے لڑھکے ہوئے تھے۔ مہینوں سے اندر صفائی نہ ہوئی تھی۔

زمین پر منوں گرد جمی ہوئی تھی۔ پھوس کے چھپر میں مکڑیوں نے جالے لگا لئے تھے۔ ایک چڑیا کا گھونسلا بھی بن گیا تھا۔ سُبھاگی تمام دن جھونپڑے کی صفائی کرتی رہی۔ شام کو وہی گھر جو "بن گھرنی گھر بھوت کا ڈیرا" والی کہاوت کو مجسم دکھلا رہا تھا صاف ستھرا لپا پُتا نظر آتا تھا کہ اُسے دیکھ کر رہنے کے لئے دیوتاؤں کا بھی جی للچائے۔ بھیرو تو اپنی دوکان پر چلا گیا تھا۔ سبھاگی گھر جا کر اپنی گٹھڑی اٹھا لائی۔ سُورداس شام کو واپس آیا تو سبھاگی نے تھوڑا سا چربن اُسے جل پان (ناشتہ) کرنے کو دیا۔ لوٹیا میں پانی لا کر رکھ دیا اور اُسے آنچل سے ہوا کرنے لگی۔ سُورداس کو اپنی زندگی میں کبھی ایسا سُکھ نہ ملا تھا۔ گرہستی کے سُکھ کا اُسے پہلی مرتبہ تجربہ ہُوا۔ دن بھر سڑک کے کنارے لُو اور لپٹ میں جلنے کے بعد یہ سُکھ اُس کو بیکنٹھ کا سا سُکھ معلوم ہُوا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا ہو گئی۔ سوچنے لگا ۔۔ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ کاش یہ میری عورت ہوتی تو زندگی کتنے مزہ سے کٹتی۔ اب تو بھیرو نے اسے گھر سے نکال ہی دیا۔ میں رکھ لوں تو اس میں کون سی بُرائی ہے؟ اس سے کہوں کیسے۔ نہ جانے اپنے دل میں کیا خیال کرے۔ میں اندھا ہوں تو کیا آدمی نہیں ہوں۔ بُرا تو نہ مانے گی؟ مجھ سے اسے محبت نہ ہوتی تو میری اتنی سیوا کیوں کرتی؟

کل انسانوں کو بلکہ کل جانداروں کو محبت کی خواہش ہوتی ہے نفس پرست لوگوں کے لئے یہ نفس پرستی کا ذریعہ ہے اور سادگی پسندوں کے لئے قلبی تسکین کا۔

سُبھاگی نے سُورداس کی پوٹلی کھولی۔ تو اُس میں گیہوں کا آٹا نکلا۔ تھوڑے سے چاول کچھ چنے اور تین آنے کے پیسے۔ سُبھاگی بنئے کے یہاں سے دال لائی۔ اور روٹیاں بنا کر سُورداس کو کھلانے کے لئے بُلایا۔

سُورداس۔ متھوا کہاں ہے؟

سُبھاگی۔ کیا جانوں۔ کہیں کھیلتا ہوگا۔ دن میں ایک بار پانی پینے آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر چلا گیا۔

سُورداس۔ تجھ سے شرماتا ہوگا۔ دیکھ میں اُسے بُلائے لاتا ہوں۔
یہ کہہ کر سُورداس باہر جا کر مٹھوا کو پُکارنے لگا۔ مٹھوا اور دن جب جی چاہتا تھا گھر میں جا کر دانہ نکال لاتا اور بھنوا کر چباتا۔ آج سارا دن بھوکوں مرا۔ اِس وقت مندر میں پرشاد کے لالچ سے بیٹھا ہُوا تھا۔ آواز سُنتے ہی دوڑا۔ دونوں کھانے بیٹھے۔ سبھاگی نے سُورداس کے سامنے چاول اور روٹیاں رکھ دیں اور مٹھوا کے سامنے صرف چاول۔ آٹا بہت کم تھا۔ صرف دو روٹیاں بن سکی تھیں۔
سُورداس نے کہا مٹھوا۔ اور روٹی لوگے؟
مٹھوا۔ مجھے تو روٹی ملی ہی نہیں۔
سُورداس۔ تو مجھ سے لے لو۔ میں چاول ہی کھاؤں گا۔
یہ کہہ کر سُورداس نے دونوں روٹیاں مٹھوا کو دے دیں۔ سبھاگی خفا ہو کر مٹھوا سے بولی۔ دن بھر سانڈ کی طرح پھرتے ہو۔ کہیں مجوری کیوں نہیں کرتے؟ اسی چکی گھر میں کام کرو تو پانچ چھ آنے روز ملیں۔
سورداس۔ ابھی وہ کام کرنے کے لائق ہے؟ اسی عمر میں مجوری کرنے لگے گا تو کلیجہ ٹوٹ جائے گا۔
سُبھاگی۔ مجوروں کے لڑکوں کا کلیجہ اتنا نرم نہیں ہوتا۔ سبھی تو کام کرنے جاتے ہیں۔ کسی کا کلیجہ نہیں ٹوٹتا۔
سُورداس۔ جب اس کا جی چاہے گا آپ کام کرے گا۔
سُبھاگی۔ جیسے بنا ہاتھ پیر ہلائے کھانے کو مل جائے اس کی بلا کام کرے۔
سُورداس۔ اُدھر مجھے کون کسی رن دھن کا سوچ ہے۔ مانگ کر لاتا ہوں کھاتا ہوں۔ جب پُورکھ نہ چلے گا تب دیکھی جائے گی۔ اُس کی چنتا (فکر) ابھی سے کیوں کروں؟
سُبھاگی۔ میں اِسے کام پر بھیجوں گی۔ دیکھوں کیسے نہیں جاتا۔ یہ مُٹ مردی ہے کہ اندھا مانگے اور آنکھوں والے مسٹنڈے بیٹھے کھائیں سُنتے ہو

مٹھوا۔ کل سے کام کرنا پڑے گا۔

مٹھوا۔ تیرے کہنے سے نہ جاؤں گا۔ دادا کہیں تو جاؤں گا۔

سُبھاگی۔ موسل کی طرح گھومنا اچھا لگتا ہے۔ اتنا نہیں سُوجھتا کہ اندھا آدمی تو مانگ کر لاتا ہے اور میں چین سے کھاتا ہوں۔ جنم بھر لڑکے ہی بنے رہو گے۔

مٹھوا۔ تجھ سے کیا مطلب؟ میرا جی چاہے گا جاؤں گا۔ نہ جی چاہے گا نہ جاؤں گا۔

اسی طرح دونوں میں دیر تک حجت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مٹھوا جھلا کر چوکے پر سے اٹھ گیا۔ سُور داس نے بہت منایا پر وہ کھانے نہ بیٹھا۔ آخر سُور داس بھی آدھا ہی پیٹ کھا کر اُٹھ گیا۔

جب وہ لیٹا تو خانہ داری کی ایک دوسری تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ یہاں نہ وہ سکون تھا نہ وہ آرام نہ وہ خوشی کی اُمنگ۔ پہلے ہی روز یہ جھگڑا شروع ہوا۔ بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ تو آگے کون جانے کیا ہوگا۔ اُسے سُبھاگی کی وہ سخت پسندی نامناسب معلوم ہوتی تھی۔ جب تک میں کمانے کو تیار ہوں لڑکے پر کیوں گرہستی کا بوجھ ڈالوں؟ جب میں مر جاؤں گا تو اُس کے سر پر جیسی پڑے گی ویسی جھیلے گا۔

وہ ننھا سا پودا جو ایک حقیر تمنا کی صورت میں شام کے وقت اُس کے دل میں اُگا تھا اس آگ کی لپٹ سے جل گیا۔ جل کر خاکستر ہو گیا۔

سُبھاگی کو نئی فکر سوار ہوئی۔ مٹھوا کو کام پر کیسے لگاؤں؟ میں کچھ اس کی لونڈی نہیں ہوں کہ اس کے برتن دھوؤں۔ اُس کا کھانا پکاؤں اور وہ مٹر گشت کرے۔ مجھے بھی کوئی بیٹھا کر نہ کھلائے گا۔ میں کھاؤں ہی کیوں؟ جب سب کام کریں گے تو یہ کیوں چھیلا بنا گھومے گا۔

صبح جب وہ جھونپڑی سے گھڑا لے کر پانی بھرنے نکلی تو گھیسو کی ماں نے دیکھ کر سینہ پہ ہاتھ رکھ لیا اور بولی — کیوں ری۔ آج رات تو یہیں

رہی تھی کیا؟

شبھاگی نے کہا۔ ہاں رہی تو پھر ——

جمنی۔ اپنا گھر نہیں تھا؟

شبھاگی۔ اب لات کھانے کا بُوتہ نہیں ہے۔

جمنی۔ تو تُو دو چار سر کُٹا کر تب چین لے گی! اس اندھے کی بھی مت ماری گئی ہے کہ جان بوجھ کر سانپ کے منہ میں انگلی دیتا ہے۔ بھیڑو گلا کاٹ لینے والا آدمی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چلی جا گھر کو!

شبھاگی۔ اُس گھر میں تو اب پاؤں نہ رکھوں گی چاہے کوئی مار ڈالے۔ سُور داس میں اتنی دَیا تو ہے کہ ڈوبتے ہوئے کی بانہہ پکڑ لی۔ اور دوسرا یہاں کون ہے؟

جمنی۔ جس گھر میں کوئی مہریا (عورت) نہیں وہاں تیرا رہنا اچھا نہیں۔

شبھاگی۔ جانتی ہوں۔ پر کس کے گھر جاؤں؟ تمہارے گھر آؤں۔ رہنے دو گی؟ جو کچھ کرنے کو کہو گی کروں گی۔ گوبر پاتھوں گی۔ بھینسوں کو گھاس چارا دوں گی۔ پانی ڈالوں گی۔ تمہارا آٹا پیسوں گی۔ رکھو گی؟

جمنی۔ نا بابا۔ یہاں کون بیٹھے بٹھائے رار (جھگڑا) مول لے! اپنا کھلاؤں بھی اُس پر بدنامی بھی ہوں۔

شبھاگی۔ تو روج گالی مار کھایا کروں؟

جمنی۔ اپنا مرد ہے۔ مارتا ہی ہے تو کیا گھر چھوڑ کر کوئی نکل جاتا ہے؟

شبھاگی۔ کیوں بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کرتی ہو جمنا! مل گیا ہے بَیل۔ جس کل چاہتی ہو بیٹھاتی ہو۔ رات دن ڈنڈا لئے سر پر سوار رہتا تو دیکھتی کہ کیسے گھر میں رہتیں۔ ابھی اُس دن دودھ میں پانی ملانے کے لئے مارنے اُٹھا تھا۔ تو چادر لے کر میکے بھاگی جاتی تھیں۔ دوسروں کو اپدیس کرنا سہل ہے۔ جب اپنے سر پڑتی ہے تو آنکھیں کھلتی ہیں۔

یہ کہتی ہوئی سُبھاگی کنوئیں پر پانی بھرنے چلی گئی۔ یہاں بھی اس نے نکتہ چینوں کو ایسا ہی اکھڑ جواب دیا۔ پانی لاکر برتن دھوئے۔ چوکا لگایا اور سُور داس کو سڑک پر پہنچانے چلی گئی۔ اب تک وہ لاٹھی سے ٹٹولتا ہُوا اکیلے ہی جایا کرتا تھا مگر سبھاگی سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اندھا آدمی کہیں گر پڑے تو۔ لڑکے ہی دق کرتے ہیں۔ میں بیٹھی ہی تو ہوں۔ اُس سے پھر کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ یہ رائے قائم کر لی گئی کہ سُور داس نے اُسے اپنے گھر ڈال لیا۔ اب قیل و قال یا طعن تشنیع کی کہیں گنجائش نہ تھی۔ ہاں سُور داس سب کی نگاہوں میں سبک ہو گیا۔ لوگ کہتے ـــ روپے نہ لوٹا دیتا تو کیا کرتا؟ ڈرتا ہوگا کہ سبھاگی ایک دن بھیرو سے کہہ ہی دے گی۔ میں پہلے ہی سے کیوں نہ ہوشیار ہو جاؤں۔ مگر سبھاگی کیوں اپنے گھر سے روپے اُڑا لے گئی؟ واہ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ بھیرو اسے روپے پیسے نہیں دیتا۔ مالکن تو بڑھیا ہے۔ سوچا ہوگا کہ روپے اُڑا لوں۔ میرے پاس کچھ پونجی تو ہو ہی جائے گی۔ اپنے پاس کہاں رکھتی۔ سور داس کو بھلا آدمی سمجھ کر اُس کے پاس رکھ آئی ہوگی یا کون جانے دونوں میں پہلے ہی سے سانٹھ گانٹھ رہی ہو۔ سور داس نے روپے اٹھوا لئے ہوں پھر لوٹا آیا ہو کہ اس طرح میرا بھرم بنا رہے گا۔ اندھے پیٹ کے گھُنّے گہرے ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی دور کی سُوجھتی ہے۔

اس طرح کئی دنوں تک گدّے بازیاں ہُوا کیں مگر لوگوں کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ کسی معاملہ پر عرصہ تک رائے زنی کرتے رہیں نہ انہیں اتنی فرصت ہوتی ہے کہ ان باتوں میں سر کھپائیں۔ نہ اتنی عقل ہی کہ ان گتھیوں کو سلجھائیں۔ انسان فطرتاً عملی ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ چھان بین کی سکت کہاں؟ سُبھاگی سے بولنے چالنے اس کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے میں کسی کو اعتراض نہ رہا۔ نہ کوئی اُس سے کچھ پوچھتا۔ اور نہ اُس پر آوازے کستا۔ ہاں سُور داس کی عزت میں فرق آ گیا۔ پہلے محلّہ بھر میں اُس کی دھاک تھی۔ لوگوں کو اس پر اُس کی حیثیت سے کہیں زیادہ اعتبار تھا۔ اس کا نام ادب کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ اب اُس کا شمار بھی عام آدمیوں میں ہونے لگا۔ کوئی خصوصیت نہ رہی۔

لیکن بھیرو کے دل میں یہ کانٹا ہمیشہ کھٹکا کرتا تھا۔ وہ کسی طرح اس جیتی جاگتی
توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اتفاقاً دوکان پر بہت کم جاتا۔ افسروں سے شکایت بھی ہوئی کہ
یہ ٹھیکیدار دوکان نہیں کھولتا۔ تاڑی پینے والوں کو مایوس ہو کر واپس جانا پڑتا ہے۔
محکمہ آبکاری کے ملازموں نے بھیرو کو نکال دینے کی دھمکی بھی دی مگر اس نے کہا کہ مجھے
دوکان کی پرواہ نہیں ہے۔ آپ جسے چاہیں رکھ لیں لیکن وہاں کوئی دوسرا پاسی
نہ ملا اور افسروں نے ایک دوکان ٹوٹ جانے کے خیال سے کوئی سختی کرنا مناسب
نہ سمجھا۔

رفتہ رفتہ بھیرو کو سورداس ہی سے نہیں بلکہ سارے محلہ سے عداوت ہو گئی۔
اس کے خیال میں محلہ والوں کا یہ فرض تھا اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے۔ اور
سورداس کو کوئی ایسی سزا دیتے کہ وہ تمام عمر یاد رکھتا۔ "ایسے محلہ میں کوئی کیا
رہے جہاں انصاف اور بے انصافی دونوں ایک ہی بھاؤ بکیں۔ برے کام کرنے
والوں سے کوئی بولتا ہی نہیں۔ سورداس اکڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ چڑیل آنکھوں میں
کاجل لگائے پھرا کرتی ہے۔ کوئی ان دونوں کے منہ میں کالکھ نہیں لگاتا۔ ایسے گاؤں
میں تو آگ لگا دینی چاہئے۔" مگر کسی وجہ سے اس کی عملی قوت سست پڑ گئی تھی۔
وہ راستہ میں سبھاگی کو دیکھ لیتا تو کترا کر نکل جاتا۔ سورداس کو دیکھتا تو ہونٹ
چبا کر رہ جاتا۔ وار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ اب کبھی مندر میں بھجن گانے نہ جاتا۔
میلوں، تماشوں سے بھی اسے نفرت ہو گئی۔ نشہ کا چسکا خود بخود چھوٹ گیا۔ توہین
سے پیدا ہونے والا تیز درد دل میں برابر رہتا۔ اس نے سوچا تھا کہ سبھاگی منہ
میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جائے گی۔ میرے کلنک کا داغ مٹ جائے گا۔ مگر وہ ابھی
تک وہاں اس کی چھاتی پر مونگ ہی نہیں دل رہی تھی بلکہ اسی شخص کے ساتھ
عیش کر رہی تھی جو اس کا خاص مخالف تھا۔ سب سے زیادہ رنج اسے اس
بات کا تھا کہ محلہ کے لوگ ان دونوں کے ساتھ پہلا ہی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔
نہ کوئی انہیں ڈانٹتا تھا نہ پھٹکارتا تھا۔ اسے اپنی ذلت سامنے بیٹھی منہ

بڑھتی آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب اُسے گالی گلوچ سے تسکین نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اِس فکر میں تھا کہ ان دونوں کا کام تمام کر دوں۔ اس طرح ماروں کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں۔ پانی کی بوند بھی نہ ملے لیکن اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑاتا پر کہیں سے مدد ملنے کی اُمید نظر نہ آتی۔ محلہ میں ایسے چھوٹے کا کوئی آدمی نہ تھا۔ سوچتے سوچتے اُسے خیال آیا کہ اندھے نے چتاری کے راجہ صاحب کو بہت بدنام کیا تھا۔ کارخانہ والے صاحب کو بھی بدنام کرتا پھرتا تھا۔ بس انہیں لوگوں سے چل کر فریاد کروں۔ اندھے سے دل میں تو دونوں خار کھائے بیٹھے ہی ہوں گے۔ چھوٹے آدمی کے منہ لگنا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر چپ رہ گئے ہوں گے۔ بس جو سامنے کھڑا ہو جاؤں تو میری آڑ سے وہ ضرور نشانہ ماریں گے۔ بڑے آدمی ہیں۔ وہاں تک پہنچنا مشکل ہے لیکن جو کہیں میری پہنچ ہو گئی اور انہوں نے میری سُن لی تو پھر ان بچہ کی ایسی خبریں گے کہ سارا اندھاپن نکل جائے گا۔ (اندھے پن کے سوا وہاں اور رکھا ہی کیا تھا!)

کئی دن تک وہ اسی حیص بیص میں پڑا رہا۔ کہ ان لوگوں کے پاس کیسے پہنچوں۔ جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں اُلٹا مجھی کو مار بیٹھیں نکلوا دیں تو اور بھی بھد ہو۔ آخر ایک دن وہ دل مضبوط کر کے راجہ صاحب کے پاس گیا اور سائیس کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سائیس نے دیکھا تو کرخت لہجہ میں بولا۔ کون ہو؟ یہاں کیا اُچکوں کی طرح جھانک رہے ہو؟

بھیرو نے نہایت عاجزی سے کہا ــــ بھیّا۔ ڈانو منت۔ گریب دُکھی آدمی ہوں۔

سائیس۔ گریب دُکھی ہو تو کسی سیٹھ ساہوکار کے گھر جاتے۔ یہاں کیا رکھا ہے۔

بھیرو۔ گریب ہوں پر بھیک منگا نہیں ہوں۔ اجنت آبرو سبھی کی ہوتی ہے۔ تمہاری ہی برادری میں کوئی کسی کی بہو بیٹی لے کر نکل جائے تو کیا تم سے

پنچایت یوں ہی چھوڑ دے گی؟ کچھ نہ کچھ دنڈ تو دے ہی گی۔ پنچایت نہ دے گی تو عدالت کچہری سے تو کچھ ہوگا۔

سائیں ذات کا چمار تھا جہاں اس قسم کے ناگوار واقعے روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے برادری کو نشہ پانی کا سامان ملتا رہتا ہے۔ اس کے گھر میں دن یہی چرچا رہتی تھی اور ان باتوں سے اسے جتنی دلچسپی تھی اتنی اور کسی بات سے نہ ہو سکتی تھی۔ بولا آؤ بیٹھو۔ چلم پیو۔ کون بھائی ہو؟

بھیرو۔ باسی ہوں یہیں پانڈے پور میں رہتا ہوں۔

وہ سائیں کے پاس جا بیٹھا اور دونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں گویا کوئی وہاں کان لگائے ان کی باتیں سُن رہا ہو۔ بھیرو نے اپنی پوری داستان سنائی اور کمر سے ایک روپیہ نکال کر سائیں کے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ بھائی کوئی ایسی جگت نکالو کہ راجہ صاحب کے کانوں میں یہ بات پڑ جائے پھر تو میں اپنا سب حال آپ ہی کہہ لوں گا۔ تمہاری دیا سے بولنے چالنے میں ایسا بدھو نہیں ہوں۔ درد گا سے تو بھی ذرا ہی نہیں۔

سائیں کو نقرئی سکہ کے درشن نصیب ہوئے تو مگن ہوگیا۔ آج سبیرے سبیرے اچھی بوہنی ہوئی۔ بولا — میں راجہ صاحب سے تمہاری اطلاع کرائے دیتا ہوں۔ بلا دیں تو چلے جانا۔ راجہ صاحب کو گھمنڈ تو چھو ہی نہیں گیا۔ مگر دیکھنا بہت دیر نہ لگانا نہیں تو مالک چڑھ جائیں گے۔ بس جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہہ ڈالنا۔ بڑے آدمیوں کو بات چیت کرنے کی چھٹی نہیں رہتی۔ میری طرح نکھٹو ہی ہیں کہ دن بھر بیٹھے ہوئے گپیں لڑایا کریں۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ راجہ صاحب اس وقت حجامت بنوا رہے تھے جو اُن کا روز کا معمول تھا۔ سائیں نے پہنچ کر سلام کیا۔

راجہ۔ کیا کہتے ہو؟ میرے پاس طلب کے لئے مت آیا کرو۔

سائیں۔ نہیں حضور طلب کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ جو سُور داس پانڈے پور

میں رہتا ہے۔

راجہ۔ اچھا وہ بدمعاش اندھا۔

سائیس۔ ہاں حضور وہ ایک عورت کو نکال لے گیا ہے۔

راجہ۔ اچھا۔ [illegible] تو لوگ کہتے تھے کچھ بڑا بھلا آدمی ہے [illegible] سائیں [illegible]

سائیس۔ ہاں حضور اس عورت کا آدمی بھیرو دکھنے آیا ہے حکم ہو تو لاؤں۔

راجہ صاحب نے سر ہلا کر منظوری دے دی اور ایک لمحہ میں بھیرو دبکتا ہوا سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

راجہ۔ تمہاری عورت ہے؟

بھیرو۔ ہاں حضور ابھی کچھ دن پہلے تو میری ہی تھی۔

راجہ۔ پہلے سے کچھ آمد و رفت تھی؟

بھیرو۔ ہوگی سرکار۔ مجھے معلوم نہیں۔

راجہ۔ لے کر کہاں چلا گیا؟

بھیرو۔ کہیں گیا نہیں سرکار۔ اپنے گھر میں ہے۔

راجہ۔ بڑا ڈھیٹ ہے۔ محلہ والے کچھ نہیں بولتے؟

بھیرو۔ کوئی نہیں بولتا۔ حضور۔

راجہ۔ عورت کو مارتے بہت تھے؟

بھیرو۔ سرکار۔ عورت سے بھول چوک ہوتی ہے۔ تو کون نہیں مارتا؟

راجہ۔ بہت مارتے ہو کہ کم؟

بھیرو۔ حضور گسائیں یہ کچا [illegible] کہاں رہتا ہے؟

راجہ۔ کیسی عورت ہے؟ خوب صورت؟

بھیرو۔ ہاں حضور۔ دیکھنے سننے میں بُری نہیں، ہے۔

راجہ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خوب صورت عورت نے اندھے کو کیوں پسند کیا۔
ایسا تو نہیں ہُوا کہ تم نے دال میں نمک زیادہ ہو جانے پر عورت کو مار کر نکال دیا ہو اور

اندھے نے اُسے رکھ لیا ہو؟

بھیرو۔ سرکار۔ عورت میرے روپے چُرا کر سُور داس کو دے آئی بیچارے سُور داس
روپے لوٹ گیا۔ میں نے چکمہ دے کر پوچھا تو اُس نے چور کو بھی بتا دیا۔ اس بات پر مارتا
نہ تو کیا کرتا؟

راجہ۔ اور کچھ ہو پر اندھا ہے دل کا صاف۔

بھیرو۔ حضور نیت کا اچھا نہیں۔

اگرچہ مہندر کمار سنگھ بہت منصف مزاج تھے اور اپنے بُرے خیالوں کو ظاہر
کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے جیسا کہ شہرت لیبر انسان کو عموماً اپنی زبان پر
بطور قابو ہوتا ہے۔ مگر وہ سور داس سے اتنے جلے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھوں اتنی روحانی
تکلیفیں انہیں ملی تھیں کہ وہ اس وقت اپنے خیالات کو پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ بولے۔
"ابھی اُس نے یہاں مجھے اتنا بدنام کیا کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ کلارک
صاحب نے اُسے ذرا منہ کیا لگا لیا کہ وہ سر چڑھ گیا۔ یوں میں کسی غریب کو ستانا
نہیں چاہتا مگر یہ بھی نہیں دیکھ سکتا کہ وہ بھلے آدمیوں کے بال نوچے۔ اجلاس تو
میرا ہی ہے۔ تم اس پر دعوےٰ کر دو۔ گواہ تو مل جائیں گے نا؟"

بھیرو۔ حضور سارا محلہ جانتا ہے۔

راجہ۔ سب کو پیش کر دو۔ یہاں لوگ اُس کے مرید ہو گئے ہیں۔ سمجھتے ہیں یہ
کوئی دیوتا ہے۔ میں اُس کی قلعی کھول دینا چاہتا ہوں۔ اتنے دنوں کے بعد یہ موقع
میرے ہاتھ لگا ہے۔ میں نے اگر اب تک کسی سے نیچا دیکھا تو اسی اندھے سے۔
اُس پر نہ پولیس کا زور تھا۔ نہ عدالت کا۔ اُس کی بیکسی اور کمزوری اُس کی زرہ بکتر
بنی ہوئی تھی۔ یہ مقدمہ اُس کے لئے گہرا گڑھا ہوگا جس میں سے وہ نکل نہ سکے گا۔
مجھے اُس کی جانب سے اندیشہ تھا۔ مگر ایک بار جہاں پردہ کھلا کہ میں بے فکر ہو
جاؤں گا۔ زہر کے دانت ٹوٹ جانے پر سانپ سے کون ڈرتا ہے؟ ہو سکے تو جلد
ہی یہ مقدمہ دائر کر دو۔

کسی بڑے آدمی کو روتے دیکھ کر ہمیں اُس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اُسے ذی اقتدار سمجھ کر ہم تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی انسان ہے۔ ہم اُسے عام انسانی کمزوریوں سے بالا خیال کرتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے ایک حیرت کی چیز بن جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ وہ نہ جانے کیا کھاتا ہوگا۔ نہ جانے کیا پڑھتا ہوگا۔ نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ اس کے دل میں ہمیشہ اونچے اونچے خیالات آتے ہوں گے چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف تو اُس کا دھیان ہی نہ جاتا ہوگا۔ اسی حیرت کی پاکیزہ شکل ہی احترام ہے۔

بھیرو کو راجہ صاحب کے سامنے جاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا تھا لیکن اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ بھی ہمیں جیسے انسان ہیں۔ گویا اُسے آج ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ ذرا بے دھڑک ہو کر بولا۔ "حضور یہ تو اندھا بڑا گھمنڈی ہے۔ اپنے آگے تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ محلہ والے ذرا سور داس سور داس کہہ دیتے ہیں تو بس پھول اٹھتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہوں میں ہی ہوں۔ حضور اُس کی ایسی سزا دے دیں۔ کہ چکی پیستے پیستے دن جائیں۔ تب اُس کی عقل ٹھکانے ہو گی۔" راجہ صاحب نے تیور بدلے۔ دیکھا کہ یہ گنوار اب زیادہ بہکنے لگا۔ بولے — اچھا اب جاؤ۔

بھیرو دل میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے راجہ صاحب کو اپنی مٹھی میں کر لیا۔ اگر اُسے چلے جانے کا حکم نہ ہوا ہوتا تو ایک لمحہ میں اُس کا حضور آپ میں بدل جاتا۔ شام تک اُس کی باتوں کا سلسلہ نہ ختم ہوتا۔ وہ نہ جانے کتنی جھوٹی باتیں گھڑتا۔ غیبت کا انسان کی زبان پر کبھی اتنا قابو نہیں چلتا جتنا بڑے لوگوں کے سامنے۔ نہ جانے کیوں ہم اُن کی نظر نوازش کے اتنے متمنی ہوتے ہیں؟ ہم ایسے لوگوں پر بھی جن سے ہمیں ذرا بھی رنجش نہیں حملے کرنے لگتے ہیں۔ کوئی غرض نہ رکھتے ہوئے ہم اُن کی نگاہوں میں رسوخ پانا چاہتے ہیں۔ ان کا اعتماد حاصل کرنے کی ہمارے دل میں ایک بے اختیارانہ تحریک ہوتی ہے۔ ہماری زبان اس وقت قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔

بھیرو یہاں سے کچھ نادم ہو کر نکلا۔ مگر اُسے اب اِس بات میں شبہ نہ تھا کہ میری مرضی پوری ہو گئی۔ گھر جا کر اُس نے بجرنگی سے کہا — تمہیں گواہی دینی پڑے گی۔

نکل نہ جانا۔

بجرنگی۔ کیسی گواہی؟

بھیرو۔ یہی میرے معاملے کی۔ اس اندھے کی ہیکڑی اب نہیں دیکھی جاتی۔ اتنے دنوں تک صبر کئے بیٹھا رہا۔ کہ اب بھی وہ سبھاگی کو نکال دے۔ اس کا جہاں جی چاہے چلی جائے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جائے۔ پر دیکھتا ہوں۔ تو دن دونی اس کی پینگ بڑھتی جاتی ہے۔ اندھا چھیلا بنا جاتا ہے۔ مہینوں بدن پر پانی نہیں پڑتا تھا۔ اب ترت نہاتا ہے۔ وہ پانی لاتی ہے۔ اس کی دھوتی چھانٹتی ہے۔ اس کے سر میں تیل لگاتی ہے۔ یہ اندھیر نہیں دیکھا جاتا۔

بجرنگی۔ اندھیر تو ہے ہی۔ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ سورداس کو اتنا چھچھورا نہ سمجھتا تھا۔ پرمیں کہیں گواہی ساکھی کرنے نہ جاؤں گا۔

جمنی۔ کیوں کچہری میں کوئی تمہارے کان کاٹ لے گا؟

بجرنگی۔ اپنا سوہے نہیں جانتے۔

جمنی۔ اچھا تمہارا من ہے۔ بھیرو، تم گواہی لکھا دو۔ میں چل کر گواہی دوں گی۔ سانچ کو آنچ کیا؟

بجرنگی۔ (ہنس کر) تو کچہری جائے گی؟

جمنی۔ کیا کروں گی؟ جب مردوں کی وہاں جانے چوڑیاں میلی ہوتی ہیں۔ تو عورتیں ہی جائیں گی۔ کسی طرح اس کمین کے منہ میں کالکھ تو لگے۔

بجرنگی۔ بھیرو بات یہ ہے کہ سورداس نے بڑی جُرو دکی پر تم بھی تو بڑی راہ پر ہی چلتے تھے۔ کوئی اپنے گھر کے آدمی کو اتنی بیدردی سے نہیں مارتا۔ پھر تم نے مارا ہی نہیں مار کر نکال بھی دیا۔ جب لائٹے کے پکھیا نہ رہے گی تو وہ دوسروں کے کھیت میں پڑ کر ہی جائے گی۔ اس میں اس کا کیا دکھ؟

جمنی۔ تم انہیں بکنے دو بھیرو۔ میں تمہاری گواہی دوں گی۔

بجرنگی۔ تو سوچتی ہوگی۔ یہ دھکا دینے سے میں کچہری جاؤں گا۔ لو میں اپنا

بُدّھو نہیں ہوں۔ اور سچّی بات تو یہ ہے کہ سُود واپس لاکھ بُرا ہو۔ مگر اب بھی ہم سبوں سے اچھا ہے۔ روپیوں کی تھیلی لوٹا دینا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔

جمنی۔ بس چپ رہو۔ میں تمہیں خوب جانتی ہوں۔ تم بھی جا کر چار گال ہنس بول آنے ہونا۔ کیا اتنی یاری بھی نہ نبا ہو گے؟ سُبھاگی کو سجا ہو گئی تو تمہیں بھی تو مجبر (نظر) لڑانے کے لئے کوئی نہ رہے گا۔

بجرنگی یہ سُن کر تلملا اُٹھا (جمنی اسے راہ پر لانا جانتی تھی) بولا — منہ میں کیڑے پڑ جائیں گے۔

جمنی۔ تو پھر گواہی دینے کیوں کور دبتی ہے؟

بجرنگی۔ لکھا دو بھیرو میرا نام۔ یہ چڑیل مجھے جینے دے گی۔ میں اگر ہارتا ہوں تو اسی سے۔ میری پیٹھ میں اگر دھول لگاتی ہے تو یہی۔ نہیں تو یہاں کبھی کسی سے دب کر نہیں چلے۔ جاؤ۔ لکھا دو۔

بھیرو یہاں سے ٹھاکر دین کے پاس گیا اور وہی بات کہی۔

ٹھاکر دین نے کہا "ہاں ہاں۔ میں گواہی دینے کو تیار ہوں۔ میرا نام سب سے پہلے لکھا دو۔ اندھے کو دیکھ کر میری تو اب آنکھیں پھوٹتی ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ جرور (ضرور) کوئی جادو جانتا ہے۔ نہیں تو کیا سبھاگی اُس کے پیچھے یوں دوڑی دوڑی پھرتی۔"

بھیرو۔ چکی پیسیں گے تو بچہ کو معلوم ہو گا۔

ٹھاکر دین۔ نا بھیّا۔ اس کا اقبال بھاری ہے۔ وہ کبھی چکی نہ پیسے گا۔ وہاں سے بھی بے لاگ لوٹ آئے گا۔ ہاں گواہی دینا میرا دھرم ہے۔ وہ میں جرور کروں گا۔ جو آدمی جادو سے دوسروں کو اُن عمل کرے اُس کی گردن کاٹ لینی چاہیئے۔ نہ جانے بھگوان کیوں سنسار میں چوروں اور پاپیوں کو جنم دیتے ہیں۔ یہی سمجھ لو کہ جب سے میری چوری ہوئی کبھی نیند بھر نہیں سویا۔ رات وہی چنتا بنی رہتی ہے۔ یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں پھر نہ وہی نوبت آ جائے۔ تم تو ایک

حساب سے بچے (مزہ) میں رہے کہ روپے سب مل گئے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا۔

بھیرو۔ تو تمہاری گواہی پکی رہی۔

شاکردین۔ ہاں ایک بار نہیں۔ سو بار پکی۔ ارے میرا بس چلتا تو میں اسے زمین کھود کر گاڑ دیتا۔ یوں مجھ سے سیدھا کوئی نہیں ہے۔ لیکن بدمعاشوں کے حق میں مجھ سے ٹیڑھا بھی کوئی نہیں ہے۔ ان کو ڈنڈ دلانے کے لئے میں جھوٹی گواہی بھی دینے کو تیار ہوں۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ اس اندھے کو ہو کیا گیا۔ کہاں تو دھرم کرم کا اتنا بچار اور کہاں یہ برا کام۔۔

بھیرو یہاں سے جگدھر کے پاس گیا جو ابھی خوانچہ فروخت کر کے واپس آیا تھا اور دھوتی لئے نہانے جا رہا تھا۔

بھیرو۔ تم بھی میرے گواہ ہو نہ؟

جگدھر۔ تم ٹھک ناٹھک (حق ناحق) بیچارے سورداس پر مالمہ چلا رہے ہو۔ سورداس بے گناہ ہے۔

بھیرو۔ قسم کھاؤ گے۔

جگدھر۔ ہاں جو قسم کہو کھا جاؤں۔ تم نے سبھاگی کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ سورداس نے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ نہیں تو اب تک وہ نہ جانے کس گھاٹ لگی ہوتی۔ جوان عورت ہے۔ سندر ہے۔ اس کے سینکڑوں گاہک ہیں۔ سورداس نے تو اس کے ساتھ نیکی کی کہ کہیں بھٹکنے نہ دیا۔ اگر تم پھر اسے گھر میں لا کر رکھنا چاہو اور وہ اسے نہ آنے دے، تم سے لڑنے پر تیار ہو جائے تب میں کہوں گا کہ اس کا کسور ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے اسے سبھاگی کو سمجھاتے سنا ہے۔ وہ آتی نہیں تو بیچارہ کیا کرے؟

بھیرو سمجھ گیا کہ یہ لوٹا جل سے آسودہ ہونے والا دیوتا نہیں ہے۔ اسے کچھ بھینٹ دینی پڑے گی۔ اس کے لالچی سبھاؤ سے وہ واقف تھا۔ بولا۔ "بھائی۔ بالکل اچھا ہے۔ ایسی اُڑن گھاٹیاں نہ بتاؤ۔ پڑوسی کا ٹھک بہت ہوتا ہے۔

پر میں تم سے باہر نہیں ہوں۔ جو کچھ دس بیس کہو۔ حاضر ہے پر گواہی تمہیں دینی پڑے گی۔"

جگدھر۔ بھیرو۔ میں بہت نیچ ہوں۔ لیکن اتنا نہیں کہ جان بوجھ کر کسی بھلے مانس کو بے کسور پھنساؤں۔

بھیرو نے بگڑ کر کہا۔ "تو کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ہی نام کھدائی (خدائی) لکھ گئی ہے۔ جس بات کو سارا گاؤں کہے گا اُسے ایک تم نہ کہو گے تو کیا بگڑ جائے گا؟ ندی کے روکے آندھی نہیں رُک سکتی۔

جگدھر۔ تو بھائی اُسے جیں کر پی جاؤ۔ میں کب کہتا ہوں کہ میں اُسے بچا لوں گا۔ ہاں میں اُسے پیسنے میں تمہاری مدد نہ کروں گا۔

بھیرو تو اُدھر گیا اِدھر وہی خود غرض۔ لالچی۔ حاسد۔ بد مزاج جگدھر اُس کے گواہوں کو پھوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے سُورداس سے اتنی عقیدت نہیں تھی جتنا بھیرو سے حسد۔ بھیرو اگر کسی نیک کام میں بھی اُس سے مدد مانگتا تو بھی وہ اتنی ہی سرگرمی سے اُس کی مخالفت کرتا۔

اُس نے بجرنگی کے پاس جا کر کہا۔ "کیوں بجرنگی تم بھی بھیرو کی گواہی کر رہے ہو؟"

بجرنگی۔ ہاں جاتا تو ہوں۔

جگدھر۔ تم نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا ہے؟

بجرنگی۔ کیسی باتیں کرتے ہو؟ روج ہی دیکھتا ہوں۔ کوئی بات چھپی تھوڑے ہی ہے۔

جگدھر۔ کیا دیکھتے ہو یہی نہ کہ سبھاگی سُورداس کے جھونپڑے میں رہتی ہے؟ اگر کوئی ایک اناتھ (بے کس) عورت کا پالن کرے تو کوئی بُرائی ہے؟ اندھے آدمی کے جھوٹ کی سزا اپنا تو نہ کرو گے کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکا وہ اُس نے کر دکھایا۔ اتنا اُس سے اور بیر کرتے ہو۔ جانتے ہو۔ سُورداس اُسے گھر سے

نکال دے گا تو اُس کی کیا گت ہوگی ؟ محلّہ کی آبرو پتّی گھر کے مجوروں کے ہاتھ بکے گی۔ دیکھ لینا۔ میرا کہنا مانو۔ گواہی ساکھی کے پھیر میں نہ پڑو۔ بھلائی کے بدلے بُرائی ہو جائے گی۔ بھیرو تو سمجھا گی سے اس لئے جل رہا ہے کہ اُس نے اُس کے چُرائے ہوئے روپے سُور داس کو کیوں لوٹا دئے۔ بس ساری جلن اسی کی ہے۔ ہم بنا جانے بُوجھے کیوں کسی کی بُرائی کریں۔ ہاں گواہی دینے ہی جاتے ہو تو پہلے خوب پتہ لگا لو۔ کہ دونوں کیسے رہتے ہیں۔

بجرنگی ۔ (جمنی کی طرف اشارہ کرکے) اسی سے پوچھو۔ یہی سب کے مَن کی جانتی ہے۔ اسی نے مجھے مجبور کیا ہے۔

جمنی ۔ ہاں کیا تو ہے۔ کیا اب بھی دل کانپ رہا ہے ؟

جگدھر ۔ عدالت میں جاکر گواہی دینا کیا تم نے ہنسی سمجھ لی ہے ؟ گنگا جلی اٹھانی پڑتی ہے۔ تلسی دل لینا پڑتا ہے۔ بیٹے کے سَر پر ہاتھ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی سے تو بال بچے والے لوگ ڈرتے ہیں کہ اور کچھ۔

جمنی ۔ سچ کہو۔ یہ سب قسمیں بھی کھانی پڑتی ہیں ؟

جگدھر ۔ بِنا قسم کے تو گواہی لگتی ہی نہیں۔

جمنی ۔ تو بھیّا۔ باج آئی ایسی گواہی سے کان پکڑتی ہوں۔ چُولھے میں جائے سُور داس اور بھاڑ میں جائے بھیرو۔ کوئی بُرے دن کام نہ آئے گا۔ تم رہنے دو۔

بجرنگی ۔ سور داس کو لڑکپن سے دیکھ رہے ہیں۔ ایسی عادت تو اُس میں نہیں تھی۔

جگدھر ۔ نہ تھی نہ ہے اور نہ ہوگی۔ اس کی بُرائی نہیں کرتا پر اُسے لاکھ روپے بھی دو تو بُرائی میں ہاتھ نہ ڈالے گا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو گیا ہوا دھن پاکر چپکے سے رکھ لیتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ نہیں تو جاکر سب روپے دے آیا۔ اس کی سچائی تو اتنے ہی سے ہو جاتی ہے۔

بجرنگی کو چھوڑ کر جگدھر نے ٹھاکر دین کو گھیرا۔ وہ پوجا کرکے کھانا کھانے جا

رہا تھا۔ جگدھر کی آواز سُن کر بولا ۔۔۔ بیٹھو بھوجن کر کے آتا ہوں۔

جگدھر۔ میری بات سُن لو تو کھانے بیٹھو۔ کھانا کہیں بھاگا نہیں جاتا۔ تم بھی بھیرو کی گواہی دینے جا رہے ہو؟

ٹھاکردین۔ ہاں جاتا ہوں۔ بھیرو نے نہ کہا ہوتا تو آپ ہی جاتا۔ مجھ سے یہ رَسنیت (بُرا کام) نہیں دیکھا جاتا۔ جمانا دوسرا ہے۔ نہیں تو ابی ہوتی تو ایسے آدمی کا سر کاٹ لیا جاتا۔ کسی کی بہو بیٹی کو نکال لے جانا کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے؟

جگدھر۔ جانا پڑتا ہے۔ دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے تم بھی انتر جامی (عالم الغیب) ہو گئے ہو۔ پُوچھتا ہوں۔ کس بات کی گواہی دو گے؟

ٹھاکردین۔ کوئی لُکی چھپی بات ہے۔ سارا دیس تو جانتا ہے۔

جگدھر۔ سُورداس بڑا گبرو جوان ہے۔ اسی سے سُندری کا مَن اُس پر لوٹ پوٹ ہو گیا ہو گا۔ یا اُس کے گھر میں روپے پیسے گہنے جیور کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اسی سے عورت لالچ میں پڑ گئی ہو گی۔ بھگوان کو دیکھا نہیں پر اَکل سے تو پہچانا ہے۔ آہ کیا دیکھ کر سُبھاگی نے بھیرو کو چھوڑ دیا اور سُورداس کے گھر پڑ گئی؟

ٹھاکردین۔ کوئی کسی کے مَن کی بات کیا جانے اور عورت کے مَن کی بات تو بھگوان بھی نہیں جانتے۔ اس سے دیوتا لوگ تک تراہ تراہ کرتے ہیں۔ (پناہ مانگتے ہیں)۔

جگدھر۔ اچھا تو جاؤ پر کہے دیتا ہوں کہ اس کا پھل بھوگنا پڑے گا۔ کسی غریب پر جھوٹھا اپرادھ لگانے سے بڑا دوسرا پاپ نہیں ہوتا۔

ٹھاکردین۔ جھوٹھا اپرادھ ہے؟

جگدھر۔ جھوٹا ہے۔ سراسر جھوٹا۔ رتی بھر بھی سچ نہیں۔ بے بس کی وہ ہائے پڑے گی کہ عمر بھر یاد کرو گے۔ جو آدمی اپنا گیا ہوا دھن پا کر لوٹا دے۔ وہ اتنا نیچ نہیں ہو سکتا۔

ٹھاکردین۔ (ہنس کر) یہی تو اندھے کی چالاکی ہے۔ کیسی دُور کی سُوجھی!

ہے کہ جو سُنے چکر میں آ جائے۔

جگدھر۔ میں نے بتا دیا۔ آگے تم جانو تمہارا کام جانے۔ رکھو گے سبھاگی کو اپنے گھر میں؟ میں اسے سُورداس کے گھر سے لوائے لاتا ہوں۔ اگر پھر کبھی سُورداس کو اس سے باتیں کرتے دیکھنا تو جو چاہنا وہ کرنا۔ بولو۔ رکھو گے؟

ٹھاکر دین۔ میں کیوں رکھنے لگا؟

جگدھر۔ تو اگر مہادیو جی نے سنسار بھر کا بِس (زہر) ماتھے چڑھا لیا تو کیا بُرا کیا؟ جس کے لئے کہیں ٹھکانا نہیں تھا۔ اُسے سُورداس نے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اس نیکی کی اُسے یہ سزا ملنی چاہیئے؟ یہی نیاے ہے؟ اگر تم لوگوں کے دباؤ میں پڑ کر سُورداس نے سبھاگی کو گھر سے نکال دیا اور اُس کی آبرو بگڑی تو اس کا پاپ تمہارے سر بھی پڑے گا۔ یہ خوب یاد رکھنا۔

ٹھاکر دین شکی اور ڈرپوک تھا۔ پس و پیش میں پڑ گیا۔ جگدھر نے یہ بات تاڑ لی۔ اسی ڈھنگ کی دو چار باتیں اور کہیں۔ آخر ٹھاکر دین گواہی دینے سے انکار کرنے لگا۔ جگدھر کا حسد کسی سادھو کی نصیحت کا کام کر گیا۔ شام ہوتے ہوتے بھیرو کو معلوم ہو گیا کہ محلہ میں کوئی گواہ نہ ملے گا۔ دانت پیس کر رہ گیا۔ چراغ جل رہے تھے۔ بازار کی اور دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔ تاڑی کی دوکان کھلنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ گاہک جمع ہوتے جا رہے تھے۔ بڑھیا گزک کے لئے مٹر کی دال موٹ اور چرپھری پکوڑیاں بنا رہی تھی اور بھیرو دروازہ پر بیٹھا ہوا جگدھر کو، محلہ والوں کو اور ساری دُنیا کو صلواتیں سُنا رہا تھا۔ سب کے سب نامرد سے ہیں۔ آنکھ کے اندھے۔ جبھی تو یہ دُردسا ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں سُوکھا کیوں پڑتا ہے۔ پلیگ کیوں آتی ہے۔ ہیضہ کیوں پھیلتا ہے؟ جہاں ایسے ایسے بے ایمان۔ پاپی وشٹ بسیں گے۔ وہاں اور ہوگا ہی کیا؟ بھگوان اس دیس کو گارت کیوں نہیں کر دیتے۔ یہی اچرج (تعجب) ہے۔ خیر۔ جندگانی ہے تو ہم اور جگدھر اسی جگہ رہتے ہیں۔ دیکھی جائے گی۔

غصہ کے جوش میں اپنی نیکیاں بہت یاد آتی ہیں۔ بھیرو اُن احسانات کا بیان کرنے لگا۔ جو اُس نے جگدھر پر کئے تھے ـــــ اس کی گھر والی مر رہی تھی۔ کسی نے بتا دیا کہ تاجی تاڑی پیئے تو بچ جائے۔ منہ اندھیرے پیڑ پر چڑھتا تھا۔ اور تاجی تاڑی اُتار کر اُسے پلاتا تھا۔ کوئی پانچ روپے بھی دیتا تو اُتنے تڑکے پیڑ پہ نہ چڑھتا۔ مٹکوں تاڑی پلا دی ہوگی۔ تمباکو پینا ہوتا ہے تو یہیں آتا ہے۔ روپے پیسے کا کام لگتا ہے تو یہیں ہی کام آتا ہوں۔ اور میرے ساتھ یہ گھات! اچھا نا ہی ایسا ہے۔
جگدھر کا گھر ملا ہُوا تھا۔ یہ سب سُن رہا تھا اور منہ نہ کھولتا تھا۔ وہ سامنے سے وار کرنے میں نہیں۔ پیچھے سے وار کرنے میں طاق تھا۔

اتنے میں مِل کا ایک مستری نیم آستین پہنے کوئلے کی بھبوت لگائے اور کوئلہ ہی کا سا رنگ۔ ہاتھ میں ہتھوڑا لئے چمرودھا جوتا ڈالے آکر بولا ـــــ چلتے ہو دوکان پر کہ اسی جھنجھٹ میں پڑے رہوگے؟ دیر ہو رہی ہے ـــ ابھی صاحب کے بنگلہ پر جانا ہے۔

بھیرو۔ ابھی جاؤ۔ تمہیں دوکان کی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں ایسا جی جل رہا ہے۔ کہ گاؤں میں آگ لگا دوں۔

مستری۔ کیا ہے کیا؟ کس بات پر بگڑ رہے ہو؟ میں بھی تو سُنوں۔

بھیرو نے مختصراً ساری داستان سُنا دی اور گاؤں والوں کی کم دلی اور کمینہ پن کا دُکھڑا رونے لگا۔

مستری۔ گاؤں والوں کو مارو گولی۔ تمہیں کتنے گواہ چاہیئے۔ جتنے گواہ کہو دے دوں۔ ایک۔ دو۔ دس۔ بیس بھلے آدمی۔ پہلے ہی کیوں نہ کہا؟ آج ہی ٹھیک ٹھاک کئے دیتا ہوں۔ بس سبوں کو بھر بھر پیٹ پلا دینا۔

بھیرو کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا ـــــ تاڑی کی کون بات ہے۔ دوکان تمہاری ہے۔ جتنی چاہو پیو پر چُنے معتبر گواہ دلانا۔

مستری۔ ابھی کہو تو بالو لوگوں کو حاجر کر دوں۔ بس ایسی پلا دینا کہ

سب بہنیں سے گرتے پڑتے گھر پہنچیں۔

بھیرو۔ ابھی کہو تو اتنی پلا دوں کہ دو چار لاشیں اٹھ جائیں۔

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں دوکان پر پہنچے۔ وہاں بیس پچیس آدمی جو اسی کارخانہ کے ملازم تھے۔ بڑے شوق سے بھیرو کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بھیرو نے تو پہنچتے ہی تاڑی نکالنی شروع کی اور ادھر مستری نے کلہیوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔

ایک۔ موقع اچھا ہے۔ اندھے کے گھر سے نکل کر جائے گی کہاں؟ بھیرو اب اسے نہ رکھے گا۔

دوسرا۔ آخر ہمارے دل بہلاؤ کا بھی تو کوئی سامان ہونا چاہئے۔

تیسرا۔ بھگوان نے آپ ہی بھیج دیا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

ادھر یہ مشورے ہو رہے تھے۔ ادھر سبھاگی سورداس سے کہہ رہی تھی۔ "تمہارے اوپر دعوے ہو رہا ہے۔" سورداس نے گھبرا کر پوچھا — "کیسا دعوے؟"

سبھاگی۔ مجھے بھگا لانے کا۔ گواہ ٹھیک کئے جا رہے ہیں۔ گاؤں کا تو کوئی آدمی نہیں ملا۔ لیکن تیلی گھر کے بہت سے مجور تیار ہیں۔ مجھ سے ابھی جگدھر کہہ رہے تھے کہ پہلے گاؤں کے سب آدمی گواہی دینے جا رہے تھے۔

سورداس۔ پھر رک کیسے گئے؟

سبھاگی۔ جگدھر نے سب کو سمجھا بجھا کر روک لیا۔

سورداس۔ جگدھر بڑا بھلا مانس ہے۔ مجھ پر بڑی مہربانی کرتا رہتا ہے۔

سبھاگی۔ تو اب کیا ہوگا؟

سورداس۔ دعوے کرنے دو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تو یہی کہہ دینا کہ میں بھیرو کے ساتھ نہ رہوں گی۔ کوئی وجہ پوچھے تو صاف صاف کہہ دینا کہ مجھے بہت مارتا ہے۔

سبھاگی۔ مگر اس میں تمہاری کتنی بدنامی ہوگی۔

سُوُرداس۔ بدنامی کی چِنتا نہیں۔ جب تک وہ تجھے رکھنے کو راجی نہ ہوگا میں تجھے جانے ہی نہ دوں گا۔

سبھاگی۔ وہ راجی بھی ہوگا تو اُس کے گھر نہ جاؤں گی۔ وہ دل کا بڑا کھوٹا آدمی ہے۔ اُس کی کسی نہ کسی طرح ... لگائے گا۔ تمہارے گھر سے بھی چلی جاؤں گی۔

سُوُرداس۔ میرے گھر سے کیوں چلی جائے گی؟ میں تو تجھے نہیں نکالتا۔

سُبھاگی۔ میرے کارن تمہاری کتنی جگ ہنسائی ہوگی۔ محلّہ والوں کا تو مجھے کوئی ڈر نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ کسی کو تمہارے اوپر سُبھا (شبہ) نہ ہوگا۔ اور ہوگا بھی تو چھن بھر میں دُور ہو جائے گا۔ لیکن یہ پُتلی گھر کے اُجڈ مجورے تمہیں کیا جانیں۔ بھیرو کے یہاں سب کے سب تاڑی پیتے ہیں۔ وہ انہیں ملا کر تمہاری آبرو بگاڑ دے گا۔ میں یہاں نہ رہوں گی تو اُس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ بس کی گانٹھ تو مَیں ہی ہوں۔

سُوُرداس۔ جائے گی کہاں؟

سُبھاگی۔ جہاں اس کے مُنہ میں کالکھ لگا سکوں۔ جہاں اس کی چھاتی پر مونگ دل سکوں۔

سُوُرداس۔ اُس کے منہ میں کالکھ لگے گی تو میرے منہ میں پہلے ہی نہ لگ جائے گی۔ تو میری بہن ہی تو ہے۔

سُبھاگی۔ نہیں میں تمہاری کوئی نہیں ہوں۔ مجھے بہن بیٹی نہ بناؤ۔

سُوُرداس۔ میں کہے دیتا ہوں کہ اس گھر سے نہ جانا۔

سُبھاگی۔ میں اب تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں بدنام نہ کروں گی۔

سُوُرداس۔ مجھے بدنامی قبول ہے۔ لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ تو کہاں جائے گی۔ تب تک میں تجھے جانے ہی نہ دوں گا۔

بھیرو نے رات تو کسی طرح کاٹی۔ علے الصباح کچہری دوڑا۔ وہاں ابھی دروازے بند تھے۔ مہتر جھاڑو لگا رہے تھے۔ پس وہ ایک درخت کے نیچے دھیان لگا کر

بیٹھ گیا۔ نو بجے سے عملے بستے بغل میں دبائے ہوئے آنے لگے اور بھیرو دوڑ دوڑ کر انہیں سلام کرنے لگا۔ گیارہ بجے راجہ صاحب اجلاس پر تشریف لائے۔ اور بھیرو نے محرر سے لکھا کر اپنا استغاثہ دائر کر دیا۔ شام کو گھر واپس آیا تو سوچنے لگا۔ اب دیکھتا ہوں۔ کون مائی کا لال ان کی مدد کرتا ہے۔ دونوں کے منہ میں کالک لگوا کر یہاں سے نکال نہ دیا تو اپنے باپ کا نہیں۔

پانچویں دن سُوردا س اور سُبھاگی کے نام سمن آگیا۔ تاریخ پڑگئی۔ جیوں جیوں پیشی کا دن نزدیک آتا جاتا تھا سُبھاگی کے ہوش اُڑے جاتے تھے۔ وہ بار بار سُوردا س سے اُلجھتی۔ تمہیں یہ سب کرا رہے ہو۔ اپنی مٹی خراب کر رہے ہو اور اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ رہے ہو۔ مجھے چلا جانے دیا ہوتا تو کوئی تم سے کیوں بیَر ٹھانتا۔ وہاں بھری کچہری میں جانا سب کے سامنے کھڑی ہونا مجھے زہر ہی سا لگ رہا ہے۔ میں اُس کا منہ نہ دیکھوں گی چاہے عدالت مجھے مار ہی ڈالے۔

آخری پیشی کی مقررہ تاریخ آگئی۔ محلہ میں اس مقدمہ کی اتنی دھوم تھی کہ لوگوں نے اپنے اپنے کام بند کر دئے اور عدالت میں جا پہنچے۔ مِل کے مزدور سینکڑوں کی تعداد میں گئے۔ شہر میں سُوردا س کو کتنے ہی لوگ جان گئے تھے۔ اُن کی رائے میں سُوردا س بے گناہ تھا۔ ہزاروں آدمی تماشا دیکھنے کی غرض سے عدالت میں گئے۔ پربھو سیوک پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ رانی اندو اور اندر دت بھی مقدمہ پیش ہوتے ہوتے آپہنچے۔ عدالت میں یونہی کیا کم بھیڑ رہتی ہے اور پھر دیہاتی عورت کا آنا تو منڈوے میں دولہن کا آنا ہے۔ عدالت میں ایک بازار سا لگا ہُوا تھا۔ اجلاس پر دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تو چتاری کے راجہ صاحب تھے۔ دوسرے ایک مسلمان جنہوں نے یوروپ کی جنگِ عظیم میں رنگروٹ بھرتی کرنے میں سعیٔ بلیغ کی تھی۔ بھیرو کی طرف سے ایک وکیل بھی تھا۔

بھیرو کا بیان ہُوا۔ گواہوں کا بیان ہُوا۔ پھر وکیل نے دعوے کی تائید میں اُن سے اپنی مرضی کے موافق سوالات کئے۔ ازاں بعد سُوردا س کا بیان ہُوا۔ اس

نے کہا۔ میرے ساتھ اِدھر کچھ دنوں سے بھیرو کی گھر والی رہتی ہے۔ جب کسی کو کیا کھلاؤں پلاؤں گا۔ کھلانے پلانے والا بھگوان ہے۔ وہ میرے گھر میں رہتی ہے۔ اگر بھیرو اُسے رکھنا چاہے اور وہ رہے تو آج ہی چلی جائے۔ یہی تو میں چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں نے اُسے اپنے یہاں رکھا ہے۔ نہیں تو نہ جانے کہاں ہوتی۔

بھیرو کے وکیل نے مسکرا کر کہا۔ سُورداس تم بڑے فیّاض معلوم ہوتے ہو۔ لیکن نوجوان اور خوب صورت عورتوں کے ساتھ اکثر ایسی فیّاضیاں کی جاتی ہیں۔

سُورداس۔ اسی سے تو یہ معاملہ چلا ہے۔ میں نے کوئی برائی نہیں کی۔ ہاں دُنیا جو چاہے سمجھے۔ میں تو بھگوان کو جانتا ہوں۔ وہی سب کی کھری کھوٹی کا پرکھنے والا ہے۔ اگر بھیرو اُسے اپنے گھر نہ رکھے گا اور نہ سرکار ہی کوئی ایسی جگہ بتا دیگی۔ جہاں یہ عورت اپنی آبرو کے ساتھ رہ سکے تو میں اُسے اپنے گھر سے نکلنے نہ دوں گا۔ وہ نکلنا بھی چاہے گی تو نہ جانے دوں گا۔ اس نے تو جب سے اس مقدمے کی خبر سُنی ہے یہی کہا کرتی ہے کہ مجھے جانے دو پر میں اُسے جانے نہیں دیتا۔

وکیل۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں نے اُسے رکھ لیا ہے؟

سُورداس۔ ہاں رکھ لیا ہے۔ جیسے بھائی اپنی بہن کو رکھ لیتا ہے۔ یا باپ اپنی بیٹی کو رکھ لیتا ہے۔ اگر سرکار نے جبر جستی میرے گھر سے نکال دیا تو اُس کی آبرو کی جواب دہی اُسی کے سر ہوگی۔

سُبھاگی کا بیان ہُوا۔ بھیرو مجھے بیکسور مارتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ نہ رہوں گی۔ سُورداس بھلا آدمی ہے اس لئے اُس کے ساتھ رہتی ہوں۔ بھیرو یہ نہیں دیکھ سکتا۔ سُورداس کے گھر سے مجھے نکالا چاہتا ہے۔

وکیل۔ تو پہلے بھی سُورداس کے گھر آ جاتی تھی؟

سُبھاگی۔ جبھی اپنے گھر مار کھاتی تھی تبھی چلی جاتی تھی۔ [illegible] کے ڈر سے بھاگ جاتی تھی۔ وہ میرے ساتھ آ جاتا تھا جب سکار [illegible] کے گھر میں [illegible] تھی۔ اُس کی کوئی کہیں سی درگت نہیں ہوئی۔ عدالت کی اکسر تھی وہ بھی پوری نہ ہوئی

راجہ۔ بھیرو تم اپنی عورت رکھو گے؟
بھیرو۔ ہاں سرکار۔ رکھوں گا۔
راجہ۔ مارو گے تو نہیں۔
بھیرو۔ بُری چال نہ چلے گی تو کیوں ماروں گا؟
راجہ۔ سبھاگی، تو اپنے آدمی کے ہمراہ کیوں نہیں جاتی؟ وہ کہتا ہے نہ ماروں گا۔
سبھاگی۔ اُس پر مجھے بسواس نہیں ہے۔ آج ہی مار مار کر بے حال کر دے گا۔
وکیل۔ حضور معاملہ صاف ہے۔ اب مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ سُورداس پر جُرم ثابت ہو گیا۔
عدالت نے فیصلہ سُنا دیا۔ سُورداس پر دو سو روپیہ جُرمانہ اور جرمانہ نہ ادا کرنے پر چھ ماہ کی قید سخت۔ سُبھاگی پر سو روپیہ جُرمانہ اور جُرمانہ نہ دے سکنے پر تین ماہ کی قید سخت۔ روپے وصول ہوں تو بھیرو کو دئے جائیں۔
تماشائیوں میں اس فیصلہ پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔
ایک۔ مجھے تو سُورداس بے قصور معلوم ہوتا ہے۔
دوسرا۔ یہ سب راجہ صاحب کی کرامات ہے۔ سُورداس نے زمین کے بارہ میں انہیں بدنام کیا تھا نا؟ یہ اُسی کی کسر نکالی گئی ہے۔ یہ ہمارے معزز اور نیک نام لیڈروں کے کارنامے ہیں۔
تیسرا۔ عورت تو چریانک (شوخ) نہیں معلوم ہوتی۔
چوتھا۔ بھری عدالت میں باتیں کرتی ہے۔ چریانک نہیں تو اور کیا ہے؟
پانچواں۔ وہ تو یہی کہتی ہے کہ میں بھیرو کے پاس نہ رہوں گی۔
سُورداس۔ میری اپیل پنچوں سے ہو گی۔ ایک آدمی کے کہنے سے میں گنہگار نہیں ہو سکتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو۔ حاکم نے سزا دے دی۔ سزا کاٹ لوں گا پر پنچوں کا فیصلہ بھی سُن لینا چاہتا ہوں۔
یہ کہہ کر اُس نے تماشائیوں کی طرف رُخ کیا اور دردناک لہجہ میں بولا۔ دہائی

ہے پنچو۔ آپ اتنے آدمی جمع ہیں۔ آپ لوگوں نے بھیرو داس کے گواہوں کے بیان سنے۔ میرا اور سبھاگی کا بیان سنا۔ حاکم کا فیصلہ بھی سن لیا۔ اب آپ لوگوں سے میری بنتی (منودیا) عرض ہے کہ کیا آپ بھی مجھے اپرادھی (مجرم) سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کو بسواس ہو گیا کہ میں نے سبھاگی کو بہکایا اور اُسے اپنی عورت بنا کر رکھے ہوئے ہوں؟ اگر آپ کو بسواس ہو گیا ہے تو میں اسی میدان میں سر جھکا کر بیٹھتا ہوں۔ آپ سب لوگ مجھے پانچ پانچ لات ماریں۔ اگر میں لات کھاتے کھاتے مر بھی جاؤں تو مجھے دُکھ نہ ہو گا۔ ایسے پاپی کا یہی ڈنڈ ہے۔ قید سے کیا ہو گا؟ اور اگر آپ کی سمجھ میں میں بیکسور ہوں تو پکار کر کہہ دیجیے۔ کہ ہم تجھے بیکسور سمجھتے ہیں۔ پھر میں کڑی سے کڑی قید بھی ہنس کر کاٹ دوں گا۔

عدالت کے کمرہ میں سناٹا چھا گیا۔ راجہ صاحب۔ وکیل۔ عملے تماشائی لوگ سب کے سب متحیر ہو گئے۔ کسی کو ہوش نہ رہا کہ اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ سپاہی درجنوں تھے مگر بُت بنے کھڑے تھے۔ معاملہ نے ایک عجیب صورت اختیار کر لی تھی۔ جس کی عدالت کی تاریخ میں کوئی نظیر نہ تھی۔ دشمن نے ایسا چھپا ہوا وار کیا تھا کہ مخالف فوج کا تجویز شدہ پروگرام الٹ ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے راجہ صاحب سنبھلے۔ حکم دیا۔ اسے باہر لے جاؤ۔ سپاہیوں نے دونوں ملزموں کو گھیر لیا اور عدالت کے باہر لے چلے۔ ہزاروں تماشائی پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔

کچھ دور چل کر سُورداس زمین پر بیٹھ گیا اور بولا — میں پنچوں کا حکم سُن کر ہی آگے بڑھوں گا!

عدالت کے باہر عدالت کی توہین کا خوف نہ تھا۔ کئی ہزار لوگوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا۔ تم بے قصور ہو۔ ہم سب تمہیں بے قصور سمجھتے ہیں۔

اندر دت۔ عدالت بے ایمان ہے۔

کئی ہزار آوازوں نے مکرر کہا ہاں عدالت بے ایمان ہے!

اندر دت۔ عدالت نہیں ہے۔ غریبوں کی قربان گاہ ہے!

کئی نئے زاویوں سے ایک گونج پیدا ہوئی۔ امیروں کے ہاتھ میں ظلم کا آلہ ہے۔
سپاہیوں نے دیکھا کہ ہر لحظہ بھیڑ بڑھتی جاتی ہے اور لوگ مشتعل ہوتے جاتے ہیں۔
تو انہوں نے لپک کر ایک ٹیکسی والے کو پکڑا اور بیردو ملزموں کو اس میں بٹھا کر روانہ ہو گئے۔ لوگوں نے کچھ دور تک تو گاڑی کا پیچھا کیا۔ اس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔

ادھر بھیرو اپنے گواہوں کے ساتھ گھر چلا تو راستہ میں عدالت کے اردلی نے گھیرا۔ اُسے دو روپے نکال کر دئے۔ دوکان میں پہنچتے ہی مٹکے کھل گئے اور تاڑی کا دور چلنے لگا۔ بڑھیا پکوڑیاں اور پکانے لگی۔

ایک بولا۔ بھیرو۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ تم بھی بیٹھو۔ پیو اور پلاؤ ہم تم برابر کر بیٹھیں۔

دوسرا آج اتنی پیوں گا کہ چاہے یہیں ڈھیر ہو جاؤں۔ بھیرو یہ کلھڑ بھر بھر کیا دیتے ہو۔ ہانڈی ہی بڑھا دو۔

بھیرو۔ ابھی مٹکے میں منہ ڈال دو۔ ہانڈی کلھڑ کی کیا لمبا طہے! آج مگن کا سر پھٹا ہے۔

تیسرا۔ دونوں حراست میں پڑے رو رہے ہوں گے۔ مگر بھئی سوردا اس کو سچا ہو گئی تو کیا وہ ہے بے کستور۔

بھیرو۔ آ گئے تم بھی اس کے دھوکے میں۔ اسی سوانگ کی تو وہ روٹی کھاتا ہے دیکھو بات کی بات میں کیسا ہجا سینوں آدمیوں کا من پھیر دیا۔

چوتھا۔ اُسے کسی دیوتا کا اشٹ ہے۔

بھیرو۔ اشٹ تو تب۔ جب جانیں کہ جیل سے نکل آئے۔

پہلا۔ میں بد کر کہتا ہوں۔ وہ کل ضرور جیل سے نکل آئے گا۔

دوسرا۔ بڑھیا۔ پکوڑیاں لا!

تیسرا۔ اسے بہت مرچیں تو مر جائے گا۔ ہے کوئی گھر میں رونے والا؟

بوتا۔ کچھ گانا ہو جائے تاکہ ڈھول مجیرا۔

سب نے ڈھول مجیرا سنبھالا اور کھڑے ہو کر گانے لگے۔ "چھتیسی کہا تینا جھمکا دے۔"

تھوڑی دیر میں ایک بڈھا بستر کا اٹھ کر ناچنے لگا۔ بڑھیا سے اب نہ رہا گیا اُس نے بھی گھونگٹ نکال لیا اور ناچنے لگی۔ نیچ ذاتوں میں گانا ... میں داخل ہے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ بڈھا اور بڑھیا دونوں فحش طریقہ پہ کمر ہلا کر تھرکنے لگے۔ اُن کے اعضاء کی لچک تعجب انگیز تھی۔

بھیرو۔ محلہ والے سمجھتے تھے کہ مجھے گواہ ہی نہ ملیں گے۔

ایک۔ سب گیدڑ ہیں گیدڑ

بھیرو۔ چلو۔ ذرا سبوں کے منہ میں کالکھ لگا آئیں۔

سب کے سب چلا اٹھے۔ ہاں ہاں۔ ناچ ہوتا چلے۔

ایک لمحہ میں جلوس چلا۔ سب کے سب ناچنے گانے ڈھول بجا ... تنتا پیٹتے۔ ہو حق کرتے اڑکھڑاتے ہوئے روانہ ہوئے۔ پہلے بجرنگی کا گھر ملا۔ یہاں سب رُک گئے اور سب نے یوں گایا:۔

"گوالن کی گئی ہرانی تب دودھ میں ڈالے پانی!"

رات زیادہ ہو چکی تھی۔ بجرنگی کے دروازے بند تھے۔ لوگ یہاں سے ٹھاکر دین کے دروازہ پر گئے۔ پھر سب نے گایا۔

"تمولن کے نیار سیلے یاروں سے بجر ملاوے۔"

ٹھاکر دین کھانا کھا رہا تھا ... ف کے مارے باہر نہ نکلا۔ جلوس آگے بڑھا۔ تو سورداس کی جھونپڑی ملی۔ بھیرو بولا۔ بس یہیں ...

"ڈھول ڈھیلی پڑ گئی"

"سینکو سینکو۔ جھونپڑے میں سے پھوس لے لو"

ایک آدمی نے تھوڑا سا پھوس نکالا۔ دوسرے نے اور زیادہ نکالا تیسرے

نے ایک بوجھ کھینچ لیا۔ پھر کیا تھا۔ نشہ کی ترنگ میں تو تھے ہی۔ ایک نے جلتا ہوا پھوس جھونپڑے میں ڈال دیا اور بولا "ہولی ہے ہولی ہے" کئی آدمیوں نے کہا۔۔۔
[illegible]۔ ہولی ہے!"
[illegible]۔ یارو۔ یہ تم لوگوں نے برا کیا۔ بھاگ چلو نہیں تو دھر لیے جاؤ گے۔
[illegible] نشہ میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سب کے سب رفو چکر ہو گئے۔
[illegible] زیادہ تیز ہوئی تو محلہ کے لوگ دوڑ پڑے لیکن پھوس کی آگ [illegible] کی تھی۔ جھونپڑا جل رہا تھا اور لوگ کھڑے ہوئے رنج اور غصہ سے یوں باتیں کر رہے تھے:
ٹھاکر دین۔ میں تو بھوجن پر بیٹھا تبھی سبوں کو آتے دیکھا۔
بجرنگی۔ ایسا جی چاہتا ہے کہ جا کر بھیرو کو مارتے مارتے بے دم کر دوں۔
جگدھر۔ جب تک ایک دفعہ اچھی طرح مار نہ کھا جائے گا۔ اس کے سر سے بھوت نہ اترے گا۔
بجرنگی۔ ہاں اب یہی ہو گا۔ گھیسوا۔ ذرا لاٹھی تو نکال لا۔ آج دو چار کھون ہو جائیں گے۔ تبھی یہ آگ بجھے گی۔
جمنی۔ تمہیں کیا پڑی ہے۔ چپ کر بیٹھو۔ جو جیسا کرے گا۔ ویسا پھل آپ بھگوان سے پاوے گا۔
بجرنگی۔ بھگوان چاہے پھل دیں یا نہ دیں پر میں اب تو نہیں مانتا۔ جیسے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔
جگدھر۔ آگ لگنے کی بات ہی ہے۔ ایسے پاپی کا تو سر کاٹ لینا بھی پاپ نہیں ہے۔
ٹھاکر دین۔ جگدھر آگ پر تیل چھڑکنا اچھی بات نہیں ہے۔ اگر تم کو بھیرو سے بیر ہے تو آپ جا کر اس سے کیوں نہیں للکارتے؟ دوسروں کو کیوں اکساتے ہو؟ یہی چاہتے ہو کہ دونوں لڑیں مریں اور میں تماشا دیکھوں۔ جو بڑے نیچ۔

جگدھر۔ اگر کوئی بات کہنا اکسانا ہے تو چپ رہوں گا۔

ٹھاکر دین۔ ہاں چپ رہنا ہی اچھا ہے۔ تم بھی جاکر سوؤ۔ بجرنگی بھگوان آپ پاپی کو ڈھونڈ دیں گے۔ انہوں نے توراون جیسے پرتاپی راجہ کو نہ چھوڑا۔ یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ یہ اندھیر اُن سے بھی نہ دیکھا جائے گا۔

بجرنگی۔ ارے گھمنڈ کے پاگل سا ہو گیا ہے۔ چلو جگدھر ذرا اِن سبوں سے دو دو باتیں کریں۔

جگدھر۔ نا بھیّا۔ مجھے ساتھ نہ لے جاؤ۔ کون جانے۔ وہاں مار پیٹ ہو جائے تو سارا الزام میرے سر جائے کہ اسی نے لڑا دیا۔ میں تو آپ جھگڑے سے کوسوں دُور رہتا ہوں۔

اتنے میں مٹھوا دوڑا ہوا آیا۔ بجرنگی نے پوچھا۔ کہاں سو یا تھا رے؟

مٹھو۔ پنڈا جی کے دالان میں تو۔ ارے یہ تو میری جھونپڑی جل رہی ہے! کس نے آگ لگائی؟

ٹھاکر دین۔ اتنی دیر میں جاتے ہو۔ سُن نہیں رہے ہو۔ گانا بجانا ہو رہا ہے۔

مٹھو۔ بھیرو نے لگائی ہے کیا؟ اچھا بچا۔ سمجھوں گا۔

جب لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ گئے تو مٹھو آہستہ آہستہ بھیرو کی دوکان کی طرف گیا۔ محفل برخاست ہو چکی تھی۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جاڑے کی رات۔ تیاک نہ کھٹکتا تھا۔ دوکان کے دروازہ پر اوپلے جل رہے تھے۔ تاڑی خانوں میں آگ کبھی نہیں بجھتی۔ پارسی مجاور بھی اتنی خبر داری سے آگ کی حفاظت نہ کرتا ہوگا۔ مٹھو نے ایک جلتا ہوا اوپلا اُٹھایا اور دوکان کے چھپر پر پھینک دیا۔ چھپر میں آگ لگ گئی تو مٹھو بگٹٹ بھاگا اور پنڈا جی کے دالان میں منہ ڈھانپ کر سو رہا گویا اُسے کچھ خبر نہیں۔ ذرا دیر میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ سارا محلہ روشن ہو گیا۔ چڑیاں درختوں پر سے اُڑ اُڑ کر بھاگنے لگیں۔ پیڑوں کی ڈالیاں جلنے لگیں۔ تالاب کا پانی سنہرا ہو گیا۔ اور بانسوں کی گانٹھیں زور زور سے چٹخنے لگیں۔ نصف گھنٹہ تک لنکا داہ

کا تماشا ہوتا رہا مگر وہاں اس کا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ دوکان آبادی سے فاصلہ پہ تھی۔ بھیرو نشہ میں بے خبر پڑا تھا۔ بڑھیا نا چتے ناچتے تھک گئی تھی۔ اور کون تھا جو اس وقت آگ بجھانے جاتا؟ آگ نے بلا کسی روک ٹوک کے اپنا کام ختم کیا۔ مٹکے ٹوٹ گئے۔ تاڑی بہہ گئی۔ جب ذرا آگ ٹھنڈی ہوئی۔ تو کئی کتوں نے چاکر اپنا ڈیرا جما لیا۔

علی الصباح بھیرو اُٹھا تو دوکان سامنے نظر آئی۔ دوکان اور اُس کے گھر کے درمیان دو فرلانگ کا فاصلہ تھا مگر کوئی درخت نہ ہونے کے سبب دوکان صاف نظر آتی تھی۔ اُس کو تعجب ہوا کہ دوکان کہاں گئی۔ ذرا اور آگے بڑھا تو راکھ کا ڈھیر دکھائی دیا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دوڑا۔ دوکان میں تاڑی کے علاوہ بکری کے روپے بھی تھے۔ ڈھول مجیرا بھی وہیں رکھا تھا۔ ہر چیز جل کر خاک ہو گئی۔ محلہ والے اُدھر تالاب میں منہ ہاتھ دھونے جایا کرتے تھے۔ سب آ پہنچے۔ دوکان سڑک پر تھی۔ راہ گیر بھی کھڑے ہو گئے۔ میلہ لگ گیا۔

بھیرو نے رو کر کہا۔ میں تو مٹی میں مل گیا۔

ٹھاکر دین۔ بھگوان کی لیلا ہے۔ اُدھر دہ تماسا دکھایا۔ اِدھر یہ تماسا دکھایا۔ جیسے ہو مہاراج۔

بجرنگی۔ کسی مستری کی سرارت ہوگی۔ کیوں بھیرو کسی سے عداوت تو نہ تھی؟

بھیرو۔ عداوت تو سارے محلے سے ہے۔ کس سے نہیں ہے؟ میں جانتا ہوں جس کی یہ بدمعاشی ہے۔ بندھوا نہ دیا تو کہنا۔ ابھی ایک کو لیا ہے۔ اب دوسرے کی باری ہے۔

جگدھر دل ہی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ نزدیک نہ آیا کہ کہیں بھیرو کچھ کہہ دے۔ تو بات بڑھ جائے۔ ایسی دلی مسرت اُسے اپنی زندگی میں کبھی نہ نصیب ہوئی تھی۔

اتنے میں مل کے کئی مزدور آ گئے۔ کالا مستری بولا۔ بھائی کوئی مانے یا نہ مانے۔

میں تو یہی کہوں گا کہ اندھے کو کسی کا اِشٹ ہے۔

ٹھاکر دین۔ اِشٹ کیوں نہیں ہے۔ میں برابر یہی کہتا آتا ہوں۔ اُس سے جس نے بَیر ٹھانا اُس نے نیچا دیکھا۔

بھیرو۔ اُس کے اِشٹ کو میں جانتا ہوں۔ بڑا نقشہ وار آجائیں تو بتا دوں کون اِشٹ ہے۔

بجرنگی۔ جل کر بولا۔ اپنی بیر کیسی سُوجھ رہی ہے۔ کیا وہ جھونپڑا نہ تھا جس میں پہلے آگ لگی۔ اینٹ کا جواب پتھر ملتا ہی ہے۔ جو کسی کے لئے گڑھا کھودے گا اُس کے لئے کنواں تیار ہے۔ کیا اُس جھونپڑے میں آگ لگاتے وقت سمجھے تھے کہ سُورداس کا کوئی ہے ہی نہیں؟

بھیرو۔ اُس کے جھونپڑے میں مَیں نے آگ لگائی؟

بجرنگی۔ اور کس نے لگائی؟

بھیرو۔ جھوٹے ہو۔

ٹھاکر دین۔ کیوں سیدھے چوری کرتے ہو؟ تم نے لگائی یا تمہارے کسی یار نے لگائی۔ ایک ہی بات ہے۔ بھگوان نے اُس کا بدلہ چکا دیا تو روتے کیوں ہو؟

بھیرو۔ سب کسی سے سمجھوں گا۔

ٹھاکر دین۔ یہاں کوئی تیرا دَبیل نہیں ہے۔

بھیرو ہونٹ چباتا ہوا چلا گیا۔ انسانی فطرت کتنی پیچیدہ ہے۔ ہم دوسروں کا نقصان کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتے مگر دوسروں کے ہاتھوں ہمیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو ہمارا خون اُبلنے لگتا ہے۔

(۳۲)

سُورداس کے مقدمہ کا فیصلہ سُننے کے بعد اندر دَت چلے تو راستے میں پربھو سیوک سے ملاقات ہو گئی۔ باتیں ہونے لگیں۔

اندر دت ۔ تمہارا کیا حال ہے؟ سُورداس بے قصور ہے یا نہیں؟
پربھو سیوک ۔ بالکل بے قصور۔ میں تو آج اُس کی پاک نفسی کا قائل ہو گیا۔ فیصلہ سُنانے کے وقت تک مجھے یقین تھا کہ اندھے نے ضرور اس عورت کو بہکایا ہے مگر اُس کے آخری الفاظ نے جادو کا سا کام کیا۔ میرا ارادہ ہے کہ اُس کے متعلق ایک نظم لکھوں۔

اندر دت ۔ صرف نظم لکھ ڈالنے سے کام نہ چلے گا۔ راجہ صاحب کو زک دینی ہوگی۔ انہیں اس بات سے مطمئن نہ ہونے دینا چاہئے کہ میں نے اندھے سے چکی پسوائی۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ اندھا روپے کہاں سے لائے گا۔ دونوں پر تین سو روپیہ جرمانہ ہُوا ہے۔ ہمیں کسی طرح جرمانہ آج ہی ادا کر دینا چاہئے۔ سُورداس جیل سے نکلے۔ تو سارے شہر میں اُس کا جلوس نکالنا چاہئے۔ اُس کے لئے دو سو کی اور ضرورت ہوگی۔ کل پانچ سو ہوں تو کام چل جائے گا۔ بولو۔ کیا دیتے ہو؟
پربھو سیوک ۔ جو مناسب سمجھو۔ لکھ لو۔
اندر دت ۔ تم پچاس روپے بغیر کسی دقت کے دے سکتے ہو۔
پربھو سیوک ۔ اور تم نے اپنے نام کتنا لکھا ہے؟
اندر دت ۔ میری حیثیت دس روپے سے زیادہ دینے کی نہیں۔ رانی جانھوی سے سو روپے لے لوں گا۔ کنور صاحب زیادہ نہیں تو دس دیں ہی گے۔ جو کچھ بھی کمی رہ جائے گی وہ دوسروں سے مانگ کر پوری کر لی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر گنگولی سب روپے خود ہی دے دیں۔ کسی سے کچھ مانگنا ہی نہ پڑے۔
پربھو سیوک ۔ سُورداس کے محلہ والوں سے بھی کچھ مل جائے گا۔
اندر دت ۔ اُسے سارا شہر جانتا ہے۔ اُس کے نام پر دو چار ہزار روپے مل سکتے ہیں۔ مگر میں اس چھوٹی سی رقم کے لئے کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔
یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آگے بڑھے کہ دفعتاً اندو اپنی فٹن پر آتی ہوئی دکھائی دی۔ اندر دت کو دیکھ کر رُک گئی اور بولی۔ تم کب لوٹے؟ میرے یہاں

نہیں آئے۔

اندر دت۔ آپ آسمان پر ہیں۔ میں زمین پر ہوں۔ کیا باتیں ہیں؟

اندو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔

اندردت فرش پر جا بیٹھا۔ پربھوسیوک نے جیب سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور چپکے سے اندردت کے ہاتھ میں رکھ کر کلب کو چل دیئے۔

اندر۔ اپنے دوستوں سے بھی کہنا۔

پربھوسیوک۔ نہیں بھئی میں اس کام کا نہیں ہوں۔ مجھے مانگنا نہیں آتا۔ کوئی دیتا بھی ہوگا تو میری صورت دیکھ کر مٹھی بند کرے گا۔

اندردت۔ (اندو سے) آج تو یہاں خوب تماشا ہوا۔

اندو۔ مجھے تو ناٹک کا سا لطف۔ سُورداس کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟

اندر۔ مجھے تو وہ سادہ سچا اور صاف دل معلوم ہوتا ہے۔

اندو۔ بس بس یہی میرا بھی خیال ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ اُس کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ فیصلہ سناتے وقت تک میں اُسے قصوروار سمجھتی تھی۔ مگر اُس کی اپیل نے میرے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی۔ میں اب تک اُسے مکار۔ فریبی۔ رنگا ہوا سیار سمجھتی تھی۔ ان دنوں اُس نے ہم لوگوں کو کتنا بدنام کیا۔ جبھی سے مجھے اُس سے نفرت ہوگئی تھی۔ میں اُسے مزہ چکھانا چاہتی تھی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ میں نے اُس کا چال چلن سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ اپنی دُھن کا پکا نڈر بے لوث اور سچا آدمی ہے۔ کسی سے دبنا نہیں جانتا۔

اندردت۔ تو اس ہمدردی کا کچھ عملی اظہار بھی کیجئے گا۔ ہم لوگ آپس میں چندہ کر کے جرمانہ ادا کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ بھی اس کار خیر میں مدد دیں گی؟

اندو نے مسکرا کر کہا میں زبانی ہمدردی کا اظہار ہی کافی سمجھتی ہوں۔

اندردت۔ آپ ایسا کریں گی تو میرا یہ خیال پختہ ہو جائے گا کہ ہمارے رئیسوں میں اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ ہمارے رؤسا ہر ایک چھوٹے بڑے کام میں حکام کی مدد

کرتے رہتے ہیں اسی لئے عوام کا اُن پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ وہ انہیں اپنا دوست نہیں دشمن سمجھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا شمار بھی انہیں رؤسا میں ہو۔ کم از کم میں نے آپ کو اب تک اُن رؤسا سے الگ سمجھا ہے۔

اندو نے متانت سے کہا۔ اندردت۔ میں ایسا یقین کر رہی ہوں۔ اس کا سبب تمہیں معلوم ہے۔ راجہ صاحب سُنیں گے تو انہیں کتنا رنج ہوگا۔ میں اُن سے چھپا کر کوئی کام نہیں کرنا چاہتی۔

اندردت۔ راجہ صاحب سے اس بارہ میں مجھ سے ابھی گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اُن کے خیالات بھی ہمارے خیالات کے مشابہہ ہوں گے۔ انہوں نے اُس وقت قانونی فیصلہ کیا ہے۔ سچا فیصلہ تو اُن کے دل نے کیا ہوگا۔ شاید اُن کی طرح عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر میں بھی وہی فیصلہ کرتا جو اُنہوں نے کیا۔ لیکن وہ میرے دل کا فیصلہ نہیں بلکہ صرف قانون کا فیصلہ ہوتا۔ مجھے اُن سے اتنی بے تکلفی نہیں ہے ورنہ اُن سے بھی کچھ نہ کچھ لے ہی لیتا۔ اُن کے لئے بھلائی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اندو۔ ممکن ہے۔ راجہ صاحب کے متعلق تمہارا قیاس درست ہو۔ میں آج اُن سے دریافت کروں گی۔

اندردت۔ دریافت کیجئے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اتنی آسانی سے نہ کھلیں گے۔

اندو۔ تمہیں اندیشہ ہے اور مجھے یقین ہے۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ ہمارے دل جذبات مشابہہ حالتوں میں مشابہہ ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو انتظار کی تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ یہ لیجئے۔ یہ میرا ناچیز ہدیہ ہے۔

یہ کہہ کر اندو نے ایک ساورن نکال کر اندردت کو دے دیا۔

اندردت۔ اسے لیتے ہوئے مجھے اندیشہ ہوتا ہے۔

اندو۔ کس بات کا؟

اندردت۔ کہ کہیں راجہ صاحب کے خیالات کچھ اور ہی ہوں۔
اندو نے غرور سے سر اونچا کر کے کہا "اس کی کچھ پرواہ نہیں۔
اندردت۔ ہاں آپ نے اس وقت رانیوں سی بات کہی۔ یہ ساورن سوراس کی اخلاقی فتح کا نشان ہے۔ آپ کا دلی شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ ابھی بہت چکر لگانا ہے۔ جرمانے کے علاوہ اور جو کچھ مل جائے۔ اسے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔
اندردت اُٹھ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ اندو نے جیب سے دوسرا ساورن نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ یہ لو۔ شاید اس سے تمہارے چکر میں کچھ کمی ہو جائے۔
اندردت نے ساورن جیب میں رکھا اور خوش خوش روانہ ہوئے لیکن اندو کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں راجہ صاحب واقعی سوراس کو قصوروار سمجھتے ہوں تو مجھے ضرور آڑے ہاتھوں لیں گے۔ خیر ہو گا۔ میں اتنا دبنا بھی نہیں چاہتی۔ میرا کام ہے اچھے کاموں میں اُن سے دبنا۔ اگر وہ بدنیتی سے رعایا پر ظلم کرنے لگیں تو مجھے اُن سے اختلاف کرنے کا پورا حق ہے۔ بُرے کاموں میں دبنا تو انسان کے درجہ سے گر جانا ہے۔ میں پہلے انسان ہوں اور پیچھے بیوی۔ ماں۔ بہن یا بیٹی۔
اندو اپنی خیالات میں محو تھی کہ مسٹر جان سیوک مع مسز سیوک کے مل گئے۔ جان سیوک نے ٹوپ اُتارا۔ مسز سیوک بولیں۔ ہم لوگ تو آپ ہی کی طرف جا رہے تھے۔ اِدھر کئی روز سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ جی لگا ہوا تھا اچھا ہوا۔ راستہ ہی میں مل گئیں۔
اندو۔ جی نہیں۔ میں راستہ میں نہیں ملی۔ یہ دیکھئے جاتی ہوں۔ آپ جہاں جاتی ہوں وہاں جائیے۔
جان سیوک۔ میں تو ہمیشہ (COMPROMISE) سمجھوتہ پسند کرتا ہوں۔ یہ کنگ پارک ہے۔ آئیے بینچ بھی ہے گو لیمپ بھی جا بیٹھیں۔

اندو۔ یہ آپ کے (COMPROMISE) کمپرومائیز بغیر جانبداری نہیں ہے لیکن خیر۔

پارک میں تینوں آدمی اُترے اور کرسیوں پر جا بیٹھے۔ اندو نے پوچھا صوفیا کا کوئی خط آیا تھا؟

مسز سیوک۔ میں سمجھ لیا کہ وہ مر گئی۔ مسٹر کلارک جیسا آدمی اُسے نہ ملے گا۔ جب تک یہاں رہی حیلہ حوالہ کرتی رہی۔ وہاں جاکر باغیوں سے مل بیٹھی۔ نہ جانے اس کی تقدیر میں کیا ہے۔ کلارک سے رشتہ نہ قائم ہونے کا غم مجھے ہمیشہ رلاتا رہے گا۔

جان سیوک۔ میں تم سے ہزار بار کہہ چکا وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ وہ زن و شوئی کی زندگی کے لئے بنائی ہی نہیں گئی۔ وہ معیار پسند ہے اور معیار پسند ہمیشہ خوشی کے خواب ہی دیکھا کرتا ہے۔ اُسے خوشی ملتی نہیں۔ اگر وہ شادی کرے گی بھی تو کنور ونے سنگھ سے۔

مسز سیوک۔ تم میرے سامنے کنور ونے سنگھ کا نام نہ لیا کرو۔ معاف کیجئے رانی اندو مجھے ایسی بے جوڑ شادیاں کبھی پسند نہیں۔

جان سیوک۔ ایسی بے جوڑ شادیاں کبھی کبھی ہو ہی جاتی ہیں۔

مسز سیوک۔ میں تم سے کہے دیتی ہوں اور رانی اندو آپ گواہ رہیے گا کہ صوفیا کی شادی کبھی ونے سنگھ سے نہ ہوگی۔

جان سیوک۔ آپ کا اس معاملہ میں کیا خیال ہے۔ رانی اندو؟ دل کی بات کہئے گا۔

اندو۔ میں خیال کرتی ہوں کہ لیڈی سیوک کا قیاس صحیح ہے۔ ونے کو صوفیا سے کتنی ہی محبت ہو مگر وہ ماتا جی کی اتنی دل شکنی نہ کر سکیں گے۔ ماتا جی جیسی دکھی عورت اس وقت دنیا میں نہ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انہیں زندگی میں اب کوئی اُمید ہی نہیں رہی۔ گم سم رہتی ہیں۔ مگر کسی نے بھول کر بھی

رضا کا تذکرہ چھیڑ دیا تو غصہ سے اُن کے تیوروں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ اپنے کمرے سے ونے کی تصویر الگ کرا دی ہے۔ اُن کے کمرہ کا دروازہ بھی بند کر دیا ہے۔ نہ کبھی آپ اُس میں جاتی ہیں۔ نہ اور کسی کو جانے دیتی ہیں اور مس صوفیا کا نام لینا تو انہیں چٹکی کاٹ لینے کے برابر ہے۔ پتاجی کو بھی اب رضاکاروں کی جماعت سے کوئی محبت نہیں رہی۔ قومی کاموں سے انہیں کچھ نفرت سی ہو گئی ہے۔ آہا۔ آج بہت اچھی ساعت سے گھر سے چلی تھی۔ وہ ڈاکٹر گنگولی چلے آ رہے ہیں۔ کہئے ڈاکٹر صاحب ملہ سے کب لوٹے۔

گنگولی۔ سردی پڑنے لگی۔ اب وہاں سے سب کوئی کا کوچ ہو گیا۔ ہم تو ابھی آپ کی ماتاجی کے پاس گیا تھا۔ کنور ونے سنگھ کے حال پر اُن کو بڑا دُکھ ہے۔

جان سیوک۔ اب کے تو آپ نے کونسل میں دھوم مچا دی۔

گنگولی۔ اگر وہاں کی تقریر کرنا۔ سوالات کرنا۔ بحث کرنا کام ہے تو آپ ہمارا جتنی بڑائی کرنا چاہتا ہے کریں۔ پر ہم تو اُسے کام نہیں سمجھتا۔ یہ تو پانی پیٹنا ہے۔ کام اُس کو کہنا چاہیے جس سے دیش اور جاتی کا اُپکار ہو۔ ایسا تو ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ ہمارا تو اب وہاں جی نہیں لگتا۔ پہلے تو سب آدمی ایک نہیں ہوتا۔ اور کبھی ہو بھی گیا تو گورنمنٹ ہمارا تجویز خارج کر دیتا ہے۔ ہمارا محنت کھراب ہو جاتا ہے۔ یہ تو لڑکوں کا کھیل ہے۔ ہم کو نئے قانون سے بڑا اُمید تھا۔ پر تین چار سال کام کر کے دیکھ لیا کہ اُس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم جہاں تب تھا وہیں اب بھی ہے۔ ملٹری کا کھرچ بڑھتا جاتا ہے۔ اس پر کوئی عذر کرے۔ تو سرکار بولتا ہے۔ آپ کو ایسا بات نہیں کہنا چاہیے۔ بجٹ بنانے لگتا ہے۔ تو ہر ایک (item کی) مد میں دو چار لاکھ جیادہ لکھ دیتا ہے۔ ہم کونسل میں جب بہت زور دیتا ہے تو ہمارا بات رکھنے کے لیے وہی بچا ہوا روپیہ نکال دیتا ہے۔ ممبر کھوش سے پھول جاتا ہے۔ ہم جیت گیا ہم جیت گیا۔ پوچھو تم کیا جیت

گیا؟ تم کیا جیتے گا؟ تمہارے پاس جیتنے کا سادھن (ذریعہ) ہی نہیں ہے۔ تم کچھ
جیت سکتا ہے؟ کبھی ہمارے بہت بل دینے پر کفایت کیا جاتا ہے تو ہمارے ہی
بھائیوں کا نکسان ہوتا ہے۔ جیسے اب کی ہم نے پولیس کی مدد میں پانچ لاکھ کاٹ
دیا۔ مگر یہ کمائی بڑے بڑے حاکموں کے بھتے یا طلب میں نہیں کیا گیا۔ بچارہ چوکی دار۔
کانسٹیبل، تھانہ دار کا طلب گھٹائے۔ جگہ توڑے گا۔ اس سے اب کپھایت کا بات
کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ اس سے ہمارے ہی بھائیوں کا گردن کٹتا ہے۔ سارا کونسل
جور دیتا رہا کہ بنگال کے باڑھ کے ستائے ہوئے آدمیوں کی مدد کو بیس لاکھ منجور کیا
جائے۔ سارا کونسل کہتا رہا کہ کلارک کا اودے پور سے بدلی کر دیا جائے، پر سرکار
نے نہیں مانا۔ کونسل کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک پتی تک نہیں توڑ سکتا۔ جو آدمی کونسل کو
بنا سکتا ہے وہی اس کو بگاڑ بھی سکتا ہے۔ بھگوان جلاتا ہے تو بھگوان ہی مارتا
ہے۔ کونسل کو سرکار بناتا ہے اور وہ سرکار کی مٹھی میں ہے۔ جب دیس کے لوگ
کونسل بنا دیں گے تب اس سے دیس کا کلیان (بھلا) ہوگا۔ یہ سب جانتا ہے
پر کچھ نہ کرنے سے تو کچھ کرتے رہنا اچھا ہے۔ مرنا بھی مرنا ہے اور کھاٹ پر پڑے
رہنا بھی مرنا ہے۔ لیکن ایک حالت میں کوئی امید نہیں رہتا۔ دوسری حالت میں کچھ
امید رہتا ہے۔ بس اتنا ہی پھرک ہے اور کچھ نہیں۔

اندو نے چھیڑ کر پوچھا۔ جب آپ جانتے ہیں کہ وہاں جانا بیفائدہ ہے
تو کیوں جاتے ہیں؟ کیا آپ باہر رہ کر کچھ کر نہیں سکتے؟

گنگولی۔ (ہنس کر) وہی بات تو ہے۔ آندو رانی۔ ہم کھاٹ پر پڑا ہے۔
ہل نہیں سکتا۔ بات نہیں کر سکتا کھا نہیں سکتا۔ لیکن بابا جمراج کو دیکھ کر
ہم تو آنسو بہائے گا۔ رو دے گا کہ مہاراج کچھ دن اور رہنے دو۔ ہمارا چندا گانو
کونسل میں بیت گیا۔ اب ہم کو کوئی دوسرا رستہ نہیں دکھائی دیتا۔

اندو۔ میں تو ایسی زندگی سے مر جانا بہتر سمجھوں۔ کم سے کم یہ تو امید ہوگی
کہ شاید آنے والی زندگی اس سے اچھی ہو۔

گنگولی۔ (ہنس کر) ہم کو کوئی کہہ دے کہ مَر کر تم پھر ایسی دیس میں آئے گا۔ اور پھر کونسل میں جا سکے گا تو ہم جمراج سے بولے گا۔ بابا جلدی کر! پر ایسا تو کہتا نہیں۔

جان سیوک۔ میرا ارادہ ہے کہ نئے چناؤ میں ایوان تجارت کی طرف سے کھڑا ہو جاؤں۔

گنگولی۔ آپ کس پارٹی میں رہے گا؟

جان سیوک۔ میری تو نہ کوئی پارٹی ہے اور نہ ہوگی۔ میں اسی ارادہ اور مقصد سے جاؤں گا کہ ملکی تجارت کی حفاظت کر سکوں۔ میں کوشش کروں گا۔ کہ غیر ملکی اشیاء پر بھاری ٹیکس عاید کیا جائے۔ اس طریقہ پر کام کئے بغیر ہماری تجارت کو کبھی فروغ نہ ہوگا۔

گنگولی۔ انگلینڈ کو کیا کرے گا؟

جان سیوک۔ اُس کے ساتھ بھی غیر ملکوں کا سا برتاؤ ہونا چاہئے۔ میں تجارتی غلامی کا سخت مخالف ہوں۔

گنگولی۔ (گھڑی دیکھ کر) بہت اچھا بات ہے۔ آپ کھڑا ہو۔ ابھی ہم کو یہاں سے اکیلا جانا پڑتا ہے۔ تب دو آدمی ساتھ ساتھ جائے گا۔ اچھا اب جانا ہے۔ کئی لوگوں سے ملنا ہے۔

ڈاکٹر گنگولی کے بعد جان سیوک نے بھی گھر کی راہ لی۔

اندو مکان پر پہنچی تو راجہ صاحب بولے۔ تم کہاں رہ گئیں؟

اندو۔ راستہ میں ڈاکٹر گنگولی اور مسٹر جان سیوک مل گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔

مہیندر۔ گنگولی کو ساتھ کیوں نہ لائیں؟

اندو۔ جلدی میں تھے۔ آج تو اس اندھے نے کمال کر دیا۔

مہیندر۔ ایک ہی مکار ہے۔ جو اس کے مزاج سے واقف نہ ہوگا ضرور دھوکے میں آ گیا ہوگا۔ اپنی بیگناہی کا اعلان کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی طریقہ دھیان

ہی میں نہیں آسکتا۔ اسے معجزہ کہنا چاہئے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ انسانی فطرت سے خوب واقف ہے۔ انسپکٹر ہو کر بھی آج اُس نے کتنے ہی پڑھے لکھے لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ یہاں لوگ اس کا جرمانہ ادا کرنے کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ سنا ہے جلوس بھی نکالنا چاہتے ہیں۔ مگر میرا تو یقین واثق ہے کہ اس نے اس عورت کو بہکایا اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے زیادہ سخت سزا کیوں نہ دی۔

اندرو۔ تو آپ نے چندہ بھی نہ دیا ہوگا؟

مہیندر۔ کبھی کبھی تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ چندہ کیسے دیتا؟ اپنے منہ میں آپ طمانچہ مارتا؟

اندرو۔ لیکن میں نے تو دیا ہے۔ مجھے . . . .

مہیندر۔ اگر تم نے دیا ہے تو بُرا کیا ہے۔

اندرو۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ . . . . . .

مہیندر۔ فضول باتیں نہ بناؤ۔ اپنا نام پوشیدہ رکھنے کو تو کہہ دیا ہے؟

اندرو۔ نہیں میں نے کچھ نہیں کہا۔

مہیندر۔ تو تم سے زیادہ بیوقوف آدمی دُنیا میں نہ ہوگا۔ تم نے اندردت کو روپے دئے ہوں گے۔ اندردت یوں تو بہت ہی منکسر المزاج اور غریب دوست نوجوان ہے اور میں اس کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ لیکن اس موقع پر دوسروں سے چندہ وصول کرنے کے لئے وہ تمہارا نام "تمثیلاً" پیش کرتا پھرے گا۔ ذرا دل میں سوچو۔ لوگ کیا سمجھیں گے؟ افسوس! اگر میں اس وقت دیوار سے سر نہیں ٹکرا لیتا تو سمجھو لو کہ بڑے ضبط سے کام لے رہا ہوں۔ تمہارے ہاتھوں مجھے ہمیشہ ذِلّت ہی ملی اور تمہارا یہ کام تو میرے ماتھے پر کلنک کا وہ نشان ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔

یہ کہہ کر مہیندر کمار کرسی پر لیٹ گئے اور چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیوار سے سر ٹکرانے میں چاہے انتہائی ضبط سے کام لیا ہو یا نہ لیا ہو مگر اندرو نے اپنے دلی جذبات کے دبانے میں انتہائی ضبط سے ضرور کام لیا۔ جی میں آتا تھا۔

کہہ دوں کہ میں آپ کی غلام نہیں ہوں۔ مجھے یہ بات ممکن ہی نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی ایسا انسان بھی ہو سکتا ہے جس کے دل پر ایسی دردناک اپیل کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ اُس نے چاہا کہ کمرے سے چلی جاؤں اور بیدرد قسمت کو جس نے میرے سکون میں خلل ڈالنے کا اجارہ سا لے لیا ہے۔ پیروں تلے کچل ڈالوں اور دکھا دوں کہ ضبط و تحمل سے قسمت کے سخت ترین حملوں کی مدافعت کی جا سکتی ہے لیکن جوں ہی وہ دروازہ کی طرف چلی۔ مہیندر کمار پھر تن کر بیٹھ گئے اور بولے۔ جاتی کہاں ہو؟ کیا میری صورت سے بھی نفرت ہو گئی؟ میں تم سے بہت صفائی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی خود رائی سے کیوں کام کرتی ہو؟ میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ جن باتوں کا تعلق مجھ سے ہو وہ مجھ سے پوچھے بغیر نہ کی جایا کریں۔ ہاں اپنے ذاتی معاملوں میں تم خود مختار ہو۔ مگر تمہارے اوپر میری منت و سماجت کا کوئی اثر کیوں نہیں ہوتا؟ کیا تم نے قسم کھائی ہے کہ مجھے بدنام کر کے میری عزت کو خاک میں ملا کر میرے وقار کو پیروں سے کچل کر ہی دم لوگی؟

اندو نے گڑگڑا کر کہا۔ ایشور کے لئے اس وقت مجھے کچھ کہنے پر مجبور نہ کیجئے۔ مجھ سے غلطی ہوئی یا نہیں۔ اُس پر میں کچھ بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں مانے لیتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی اور ضرور ہوئی۔ میں اس کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اب بھی آپ کی طبیعت نہ آسودہ ہوئی ہو تو لیجئے بیٹھی جاتی ہوں۔ آپ جتنی دیر تک اور جو کچھ جی چاہے کہیں۔ میں سر نہ اُٹھاؤں گی۔

مگر غصہ نہایت بیدرد ہوتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرا ایک ایک لفظ نشانہ پر بیٹھتا ہے یا نہیں۔ وہ خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی طاقت لامحدود ہے۔ ایسا کوئی مہلک سے مہلک ہتھیار نہیں ہے جس سے بڑھ کر مہلک ہتھیار اس کے اسلحہ خانہ میں نہ ہوں۔ لیکن خاموشی وہ منتر ہے جس کے آگے اُس کی تمام طاقت زائل ہو جاتی ہے۔ خاموشی اس کے لئے ناقابلِ فتح ہے۔

مہیندر کمار چڑ کر بولے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے بکواس کا روگ
ہو گیا ہے اور کبھی کبھی اس کا دورہ ہو جایا کرتا ہے!

اندو۔ یہ آپ خود کہتے ہیں۔

اندو سے غلطی ہوئی کہ وہ اپنی بات کو نبھا نہ سکی۔ غصہ کو ایک تازیانہ اور ملا۔
مہیندر نے آنکھیں نکال کر کہا۔ یہ میں نہیں کہتا۔ تم کہتی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟
میں تم سے تحقیق کرنے کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ تم کیوں بار بار وہی کام کرتی ہو جن
سے میری بدنامی اور تضحیک ہو۔ میری عزت و آبرو خاک میں مل جائے۔ میں کسی کو
منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں؟ میں جانتا ہوں۔ تم ضد سے ایسا نہیں کرتیں۔ میں
یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ تم میری مرضی کے مطابق چلنے کی کوشش بھی کرتی ہو لیکن
پھر بھی جو سہو ہو جاتا ہے اس کا کیا سبب ہے؟ کیا یہ بات تو نہیں کہ اگلے
جنم میں ہم اور تم ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ یا تقدیر نے میری تمام آرزوؤں
اور حوصلوں کو برباد کرنے کے لئے تمہیں میرے دامن سے وابستہ کر دیا ہو؟ میں
اکثر اسی سوچ میں پڑا رہتا ہوں۔ پر بھید نہیں کھلتا۔

اندو۔ مجھے علم غیب جاننے کا دعوے تو نہیں۔ ہاں اگر آپ کی مرضی ہو۔
تو میں جا کر اندر دت کو تاکید کر دوں کہ میرا نام نہ ظاہر ہونے پائے۔

مہیندر۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو! تمہیں یہ سوچنا چاہئے تھا کہ
یہ چندہ کس نیت سے جمع کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد ہے میرے انصاف
کی تحقیر کرنا۔ میری نیکنامی کی جڑ کھودنا۔ اگر میں اپنے ملازم کو سخت سست
کہوں اور تم اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرو تو میں اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا
ہوں کہ تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو۔ چندہ تو خیر ہو گا ہی۔ مجھے اس کے روکنے
کا اختیار نہیں ہے۔ جب تمہارے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے تو دوسروں کا
کیا کہنا۔ لیکن میں جلوس کبھی نہ نکلنے دوں گا۔ میں اسے اپنے حکم سے بند کر دوں گا
اور اگر لوگوں کو زیادہ آمادہ دیکھوں گا تو فوجی امداد لینے میں بھی دریغ نہ

نہ کروں گا۔

اندو۔ آپ جو چاہیں کریں۔ مجھ سے یہ سب باتیں کیوں کہتے ہیں؟

مہیندر۔ تم سے اس لئے کہتا ہوں۔ کہ تم بھی اس اندھے کے عقیدتمندوں میں ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تم نے اس سے گرو منتر لینے کا ارادہ نہیں کر لیا ہے؟ آخر زیادہ اس بھگت کے چیلے اونچی ذاتوں میں بھی تو ہیں۔

اندو۔ میں گرو منتر کو نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتی اور شاید کبھی وہ منتر نہ لونگی۔ مگر ہاں۔ آپ جا ہے جتنا برا سمجھیں مگر بد قسمتی سے مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ سورداس بے قصور ہے۔ اگر یہی اس سے عقیدت نہ کرنا ہے تو میں ضرور عقیدتمند ہوں۔

مہیندر۔ تم کل جلوس میں نہ جاؤ گی؟

اندو۔ جانا تو چاہتی تھی۔ پر اب آپ کی خاطر سے نہ جاؤں گی۔ اپنے سر پر ہمیشہ ننگی تلوار لٹکتے نہیں دیکھ سکتی۔

مہیندر۔ اچھی بات ہے۔ اس کے لئے میں تمہارا بیحد ممنون ہوں۔

اندو اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ گئی۔ وہ بہت [illegible] زدہ خاطر ہو رہی تھی۔ وہ دیر تک راجہ صاحب کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ پھر آپ ہی بولی۔ بھگوان یہ زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ یا تو تم اُن کے دل کو زیادہ فراخ بناؤ یا مجھے دنیا سے اٹھا لو۔ اندردت اس وقت نہ جانے کہاں ہو گا۔ کیوں نہ اُس کے پاس رقعہ بھیج دوں کہ خبردار۔ میرا نام ظاہر نہ ہونے پاوے۔ میں نے اُن سے ناحق کہہ دیا کہ چندہ دیا۔ کیا جانتی تھی کہ یہ گل کھلے گا۔

اس نے فوراً گھنٹی بجائی۔ نوکر اندر آکر کھڑا ہو گیا۔ اندو نے رقعہ لکھا۔ ڈیر اندر۔ میرے چندہ کو کسی پر ظاہر نہ کرنا ورنہ مجھے رنج ہو گا۔ مجھے مجبور ہو کر یہ الفاظ لکھنے پڑے ہیں۔

پھر رقعہ نوکر کو دے کر بولی۔ اندردت بابو کا مکان جانتا ہے؟

نوکر۔ ہوئی تو کہوں سہرے ساں نا؟ پوچھ لیبے۔

اندو۔ شہر میں تو شاید عمر بھر اُن کے گھر کا پتہ نہ لگے۔
نوکر۔ اب بھیکو کو دبن بتا تو ہم لگا دب۔ تگی نا کاہی۔
اندو۔ تانگہ لے لینا۔ کام جلدی کا ہے۔
نوکر۔ ہمار گوڑ تانگہ سے کم تھوڑے ہیں۔ کاہم کو تو تانگا سُر سے کم چلت ہے؟
اندو۔ بازار چوک سے ہوتے ہوئے میرے گھر تک جانا ہیں بس وے وہ تمہیں میرے گھر ہی پر ملیں گے۔ اندر رت کو دیکھا ہے۔ پہچانتا ہے نا؟
نوکر۔ جب کا ایک بیر دیکھ لیئی وہی کا جلم بھر نہ بھولی۔ اندر بابو کا تو سیکرن بیر دیکھا ہے۔
اندو۔ کسی کو یہ خطمت دکھانا۔
نوکر۔ کوؤ دیکھی کیسن، پہلے وہکی آنکھی نہ پھوڑ دارب۔
اندو نے رقعہ دیا۔ نوکر لے کر چلا گیا۔ وہ پھر لیٹ گئی اور وہیں باتیں سوچنے لگی۔ میری یہ ذلت انہی کے سبب ہو رہی ہے۔ اندر اپنے دل میں کیا سوچے گا؟ یہی نہ کہ راجہ صاحب نے اِسے ڈانٹا ہوگا۔ گویا میں لونڈی ہوں۔ جب چاہتے ہیں ڈانٹ بتا دیتے ہیں۔ مجھے کوئی کام کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ انہیں اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ میں اُن کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہوں۔ کتنی ذلت ہے؟
یہ سوچتے وہ تیزی سے اُٹھی۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ ونڈی آکر کھڑی ہوئی۔
اندو لونڈی سے۔ دیکھ بھیکا چلا تو نہیں گیا۔ میں نے اُسے ایک رقعہ دیا ہے جا کر مانگ لا۔ اب نہ بھیجوں گی۔ چلا گیا ہو تو کسی کو سائیکل پر دوڑا دینا۔ چوک کی طرف مل جائے گا۔
لونڈی چلی گئی اور ذرا دیر میں بھیکا کو لئے ہوئے آپہنچی۔ بھیکا بولا۔ جو چھن بھر اور دیر ہوت جات تو ہم گھر ماں نا ملت۔

اندو۔ کام تو تم نے جرمانہ کا کیا ہے کہ اتنا ضروری خط اور تم گھر میں پڑے رہے لیکن اس وقت یہی اچھا ہوا معرقعہ اب نہ جائے گا۔ مجھے دو۔

اُن سے رقعہ لے کر جلک کر ڈالا پھر آج کا روزنامہ کھول کر دیکھنے لگی۔ پہلی ہی سُرخی تھی " شاستری جی کی معرکتہ الآرا تقریر"۔ اندو نے اخبار کو نیچے ڈال دیا۔ اور کہنے لگی۔ یہ مباشے تو شیطان سے زیادہ مشہور ہو گئے۔ جہاں دیکھو شاستری جی! ایسے آدمیوں کی قابلیت کی خواہ کتنی تعریف کی جائے مگر اُس کی توقیر نہیں کی جا سکتی۔ شاستری کا نام آتے ہی مجھے ان کی یاد آجاتی ہے۔ جو آدمی ذرا ذرا سے اختلافات پر بھی سَر ہو جائے۔ دال میں ذرا سا نمک زیادہ ہو جانے پر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ جیسے دوسروں کے دلی جذبات کا ذرا بھی لحاظ نہ ہو جسے ذرا بھی خیال نہ ہو کہ میری باتوں سے کسی کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ بھی کوئی آدمی ہے! ہو سکتا ہے کہ کل کو کہنے لگیں۔ اپنے پتا سے ملنے نہ جاؤ۔ گویا میں ان کے ہاتھوں بک گئی ہوں۔

دوسرے روز علی الصباح اُس نے گاڑی تیار کرائی اور دوشالا اوڑھ کر گھر سے نکلی۔ مہیندر کمار باغ میں ٹہل رہے تھے۔ یہ اُن کا ہر روز کا معمول تھا۔ اندو کو جاتے دیکھا تو پوچھا۔ اتنے سویرے کہاں؟ اندو نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جاتی ہوں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے۔ اندر دت سے روپے واپس لینے۔

مہیندر۔ اندو۔ سچ کہتا ہوں تم مجھے پاگل بنا دو گی۔

اندو۔ آپ مجھے کٹھ پتلیوں کی طرح نچانا چاہتے ہیں۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔

یکایک اندر دت سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ اندو ان کی طرف لپک کر چلی اور پھاٹک پر پہنچ کر بولی۔ اندر دت۔ سچ کہنا تم نے کا سے میرے چندے کا ذکر تو نہیں کیا؟

اندر سہم سا گیا جیسے کوئی شخص دوکاندار کو پیسے کی جگہ روپے دے آئے۔ بولا۔ "آپ نے مجھے منع تو نہیں کیا تھا؟"

اندو۔ تم جھوٹے ہو۔ میں نے منع کیا تھا۔

اندر دت۔ اندو رانی۔ مجھے تو یاد ہے کہ آپ نے منع نہیں کیا تھا۔ ہاں مجھے خود ہی عقل سے کام لینا چاہئے تھا۔ اتنی غلطی ضرور میری ہے۔

اندو۔ (آہستہ سے) تم مہیندر سے اتنا کہہ سکتے ہو کہ میں نے ان کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا؟ مجھ پر تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ میں روحانی عذاب میں مبتلا ہوں۔

یہ کہتے کہتے اندو کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اندر دت موقع تاڑ گیا بولا۔ ہاں کہہ دوں گا۔ آپ کی خاطر سے۔

ایک لمحہ میں اندر راجہ صاحب کے پاس جا پہنچا۔ اندو گھر چلی گئی۔

مہیندر کمار نے پوچھا۔ کہئے کہئے۔ اس وقت آپ نے کیسے تکلیف کی؟

اندر دت۔ مجھے تو تکلیف نہیں ہوئی۔ آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ اگرچہ خلاف قاعدہ ہے مگر میری آپ سے التجا ہے کہ سور داس اور سبھاگی کا جرمانہ آپ ہی وقت مجھ سے لے لیں۔ اور ان دونوں کی رہائی کا حکم دے دیں۔ کچہری ابھی دیر میں کھلے گی۔ میں اسے آپ کی خاص عنایت سمجھوں گا۔

مہیندر کمار۔ ہاں خلاف قاعدہ تو ہے لیکن تمہارا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ روپے منیم کو دے دو۔ میں رہائی کا حکم لکھے دیتا ہوں۔ کتنے روپے جمع کئے؟

اندر دت۔ بس شام کو خاص خاص آدمیوں کے پاس گیا تھا۔ کوئی پانچ سو روپے ہو گئے۔

مہیندر کمار۔ تب تو تم اس فن میں ماہر ہو۔ اندو رانی کا نام دیکھ کر نہ دینے والوں نے بھی دئے ہوں گے۔

اندر دت۔ میں اندو رانی کے نام کی اس سے زیادہ عزت کرتا ہوں۔ اگر ان کا نام دکھاتا تو پانچ سو روپے نہ لاتا۔ پانچ ہزار لاتا۔

مہیندر کمار۔ اگر یہ سچ ہے تو تم نے میری آبرو رکھ لی۔

اندر دت۔ مجھے آپ سے ایک التجا اور کرنی ہے۔ کچھ لوگ سور داس کو عزت کے ساتھ اُس کے گھر پہنچانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے دو چار سو لوگ جمع ہو جائیں۔ میں آپ سے اُس کی اجازت چاہتا ہوں۔

مہیندر کمار۔ جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بدامنی واقع ہونے کا احتمال ہے۔

اندر دت۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پتّا تک نہ ہلے گا۔

مہیندر کمار۔ یہ غیر ممکن ہے۔

اندر دت۔ میں اس کی ضمانت دے سکتا ہوں۔

مہیندر کمار۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

اندر دت سمجھ گیا کہ راجہ صاحب سے اب زیادہ اصرار کرنا بیفائدہ ہے۔ جاکر منیم کو روپے دئے اور تانگہ کی طرف چلا۔ دفعتاً راجہ صاحب نے پوچھا — جلوس تو نہ نکلے گا نہ؟

اندر دت۔ نکلے گا۔ میں روکنا چاہوں تو بھی رک نہیں سکتا۔

اندر دت وہاں سے اپنے دوستوں کو خبر دینے چلے۔ جلوس کا انتظام کرنے میں گھنٹوں کی دیر ہوگئی۔ ادھر اُن کے جاتے ہی راجہ صاحب نے جیل کے داروغہ کو ٹیلیفون کردیا کہ سور داس اور سبھاگی چھوڑ دئے جائیں اور انہیں بند گاڑی میں بٹھا کر اُن کے گھر پہنچا دیا جاوے۔ جب اندر دت سواری باجے وغیرہ لئے ہوئے جیل پہنچے۔ تو معلوم ہوا کہ پنجرا خالی ہے۔ چڑیاں اُڑ گئیں۔ وہ کف افسوس مل کر رہ گئے۔ انہیں پاؤں پانڈے پور کو چلے۔ دیکھا تو سور داس ایک نیم کے نیچے راکھ کے ڈھیر کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ایک طرف سبھاگی سر جھکائے کھڑی ہے۔ اندر دت کو دیکھتے ہی جگدھر اور دیگر اشخاص ادھر اُدھر سے آکر جمع ہوگئے۔

اندر دت۔ سور داس تم نے بڑی جلدی کی۔ وہاں لوگ تمہارا جلوس

نکالنے کی تیاریاں کئے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب نے بازی مار لی۔ اب بتاؤ ان روپیوں کا کیا کیا جائے جو جلوس کے لئے جمع کئے گئے تھے؟

سوُرداس۔ اچھا ہی ہُوا کہ میں یہاں چپکے سے آ گیا۔ نہیں تو شہر بھر میں گھومنا پڑتا۔ جلوس بڑے بڑے آدمیوں کا نکلتا ہے کہ اندھے بھکاریوں کا؟ آپ لوگوں نے جریبانہ دے کر چھڑا دیا یہی کون کم پُن کیا۔

اندر دت۔ اچھا بتاؤ یہ روپے کیا کئے جائیں۔ تمہیں دے دوں؟

سوُرداس۔ کتنے روپے ہوں گے؟

اندر دت۔ کوئی تین سو ہوں گے۔

سوُرداس۔ بہت ہیں۔ اتنے میں بھیرو کی دوکان مجے میں بن جائے گی۔

جگدھر کو بُرا معلوم ہُوا۔ بولا۔ پہلے اپنے جھونپڑے کی تو فکر کرو۔

سوُرداس۔ میں اسی پیپل کے نیچے پڑ رہا کروں گا یا پنڈا جی کے دالان میں۔

جگدھر۔ جس کی دوکان جلی ہے وہ بنوائے گا۔ تمہیں کیا چنتا ہے؟

سوُرداس۔ جلی تو ہے میرے کارن۔

جگدھر۔ تمہارا گھر بھی تو جلا ہے۔

سوُرداس۔ یہ بھی بنے گا مگر پیچھے سے۔ دوکان نہ بنی تو بھیرو کو کتنا گھاٹا ہوگا۔ میری بھیک تو ایک دن بھی بند نہ ہوگی۔

جگدھر۔ بہت سرا ہنے سے بھی آدمی کا مَن بگڑ جاتا ہے۔ تمہاری بھگل منسی کا لوگ بکھان کرنے لگے تو اب تم سوچتے ہوگے کہ ایسا کام کروں جس میں اور بڑائی ہو۔ اس طرح دوسروں کی نالی پر ناچنا نہ چاہئے۔

اندر دت۔ سوُرداس تم ان لوگوں کو بکنے دو۔ تم گیانی ہو۔ یہ روپے تمہارے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ جو جی میں آوے کرنا۔

اندر دت چلا گیا تو سبھاگی نے سوُرداس سے کہا۔ اس کی دوکان بنوانے کا نام نہ لینا۔

سُورداس۔ میرے گھر سے پہلے اس کی دوکان جلے گی۔ بدنامی سر پر کون
لے کر سُورداس نے بھیرو کا گھر جلوا دیا؟ میرے مَن میں یہ بات سما گئی ہے کہ تمہیں
میں سے کسی نے اُس کی دوکان جلائی۔

سُبھاگی۔ اُس سے کتنے ہی دبو پر وہ تمہارا دُشمن ہی بنا رہے گا۔ کُتّے
کی پُونچھ کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔

سُورداس۔ تم دونوں پھر ایک ہو جاؤ گے تب تجھ سے پُوچھوں گا۔

سُبھاگی۔ بھگوان مار ڈالیں پر اُس کا منہ نہ دکھاویں۔

سُورداس۔ میں کہے دیتا ہوں تو ایک دن بھیرو کے گھر کی دیبی بنے گی۔

سورداس روپے لئے ہوئے بھیرو کے گھر کی طرف چلا۔ بھیرو رپٹ کرنے کو جانا
تو چاہتا تھا پر ڈرتا تھا کہ کہیں سُورداس کے جھونپڑے کی بات چلی تو کیا جواب
دوں گا۔ بار بار ارادہ کر کے رُک جاتا تھا۔ اتنے میں سُورداس کو سامنے آتے دیکھا
تو بھکا بکا رہ گیا۔ تعجب سے بولا۔ ارے کیا جرمانہ دے آیا کیا؟

بُڑھیا بولی۔ بیٹا۔ اِسے ضرور کسی دیوتا کا اِشٹ ہے نہیں تو وہاں سے کیسے
بھاگ آتا؟

سُورداس نے بڑھ کر کہا۔ بھیرو میں ایشور کو ساکھی دے کر کہتا ہوں۔
مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تمہاری دوکان کس نے جلائی۔ تم مجھے چاہے جتنا نیچ
سمجھو پر میری جانکاری میں یہ بات کبھی نہ ہونے پاتی۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں۔
کہ یہ کسی میرے ہِتو (خیر خواہ) کا کام ہے۔

بھیرو۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم چھوٹ کیسے آئے؟ مجھے تو یہی بڑا اَچرج ہے۔

سُورداس۔ بھگوان کی اِچھا۔ شہر کے کچھ دھرماتما لوگوں نے آپس میں
چندہ کر کے میرا جرمانہ بھی دے دیا۔ اور کوئی تین سو روپے جو بچ رہے ہیں مجھے
دے گئے ہیں۔ میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ یہ روپے لے کر اپنی دوکان بنواؤ جس
میں تمہارا ہرج نہ ہو۔ میں سب روپے لے آیا ہوں۔

بھیرو ششدر ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی آدمی آسمان سے موتیوں کی بارش ہوتی ہوئی دیکھے۔ اُسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ ان کو لوں یا نہیں۔ ان میں کوئی بھید تو نہیں ہے۔ ان میں کوئی زہریلا کیڑا تو نہیں چھپا ہے۔ کہیں اُن کے لینے سے مجھ پر کوئی آفت تو نہ آئے گی؟ اُس کے دل میں سوال پیدا ہُوا کہ اندھا سچ مچ مجھے روپے دینے کو لایا ہے یا مجھے طعنہ دے رہا ہے۔ ذرا اس کا دل ٹٹولنا چاہئے۔ بولا — تم اپنے روپے رکھو۔ یہاں کوئی روپوں کے بھوکے نہیں ہیں۔ پیاسوں مرتے بھی ہوں تو دشمن کے ہاتھ سے پانی نہ پئیں۔

سورداس۔ بھیرو تمہاری دشمنی کیسی؟ میں تو کسی کو اپنا دشمن نہیں دیکھتا۔ چار دن کی جند گانی کے لئے کیا کسی سے دشمنی کی جائے! تم نے میرے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا اور سمجھتا کہ تم میری گھر والی کو بہکائے لئے جاتے ہو تو میں بھی یہی کرتا جو تم نے کیا۔ اپنی آبرو کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ جسے اپنی آبرو پیاری نہ ہو اُس کی گنتی آدمیوں میں نہیں۔ جانوروں میں ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے تمہارے ہی لئے یہ روپے لئے ہیں نہیں تو میرے لئے تو جیتر جھیا بہت تھی۔ میں جانتا ہوں کہ ابھی تمہیں میرے اوپر شبھا ہو رہا ہے پر کبھی نہ کبھی تمہارا مَن میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ یہ روپے لو اور بھگوان کا نام لے کر دوکان بنوانے میں ہاتھ لگا دو۔ تم بڑے ہو گے تو جس بھگوان نے اتنی سہاتیا دی ہے وہی بھگوان اور بھی سہائیتا دیں گے۔

بھیرو کو ان الفاظ میں ہمدردی اور شرافت کی جھلک دکھائی دی۔ سچائی اعتبار کو پیدا کر دیتی ہے۔ نرم ہو کر بولا۔ آؤ بیٹھو۔ چلم پیو۔ کچھ باتیں ہوں تو سمجھ میں آئے۔ تمہارے مَن کا بھید نہیں کھُلتا۔ دشمن کے ساتھ تو کوئی بھلائی نہیں کرتا۔ تم میرے ساتھ کیوں اتنی مہربانی کرتے ہو؟

سورداس۔ تم نے میرے ساتھ کون سی دشمنی کی؟ تم نے وہی کیا جو تمہارا دھرم تھا۔ میں رات بھر والان میں بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہو۔

میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی تو مجھے معلوم ہُوا کہ تم میرے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کر رہے ہو۔ یہی تمہارا دھرم ہے۔ عورت کے پیچھے تو کھُون ہو جاتا ہے۔ تم نے نالِس ہی کردی تو کون بُرا کام کیا۔ بس اب تم سے میری یہی بنتی ہے کہ جس طرح کل کچہری عدالت میں پنچوں نے مجھے بے کسور کہہ دیا۔ اسی طرح تم بھی میری طرف سے اپنا مَن صاف کر لو۔ میری اس سے بھی اَدھِک (زیادہ) دُرگت ہو اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی گھات کیا ہو۔ ہاں! مجھ سے ایک ہی بات نہیں ہو سکتی۔ میں سبھاگی کو اپنے گھر سے نکال نہیں سکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کوئی آڑ نہ رہے گی۔ تو نہ جانے اُس کی کیا دَشا ہو۔ میرے یہاں رہے گی۔ تو کون جانے کبھی تم ہی اُسے رکھ لو۔

بھیرو کا کدورت بھرا دل اِس باطنی صفائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آج پہلی مرتبہ اُسے سُورداس کی نیک نیتی کا یقین ہو گیا۔ سوچا۔ اگر اس کا دل صاف نہ ہوتا تو مجھ سے ایسی باتیں کیوں کرتا؟ میرا کوئی ڈر تو اِسے ہے ہی نہیں۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا کر چکا۔ اس کے ساتھ تو سارا شہر ہے۔ سبھوں نے جرمانہ ادا کر دیا۔ اوپر کئی سو روپے اور دے گئے۔ محلّہ میں بھی اس کی دھاک پھر بیٹھ گئی۔ چاہے تو بات کی بات میں مجھے بگاڑ سکتا ہے۔ نیت صاف نہیں ہوتی تو اب سبھاگی کے ساتھ آرام سے رہتا۔ اندھا ہے۔ اپاہج ہے۔ بھیکھ مانگتا ہے۔ پر اُس کی کتنی مرجاد ہے۔ بڑے بڑے آدمی اُس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ میں کتنا کمینہ نیچ آدمی ہوں کہ پیسے کے لئے رات دن دَغا پھریب کرتا رہتا ہوں۔ کون سا پاپ ہے جو میں نے نہیں کیا۔ اس بیچارے کا گھر جلایا۔ ایک بار نہیں دوبارہ اس کے روپے اُٹھا لے گیا۔ یہ میرے ساتھ نیکی ہی کرتا چلا آتا ہے۔ سبھاگی کے بارہ میں مجھے شک ہی شک تھا۔ اگر کچھ نیت بد ہوتی تو اس کا ہاتھ کس نے پکڑا تھا۔ سبھاگی کو کھُلے کھُلانے رکھ لیتا۔ اب تو عدالت کچہری کا بھی ڈر نہیں رہا۔ یہ سوچتا ہُوا وہ سُورداس کے پاس آکر بولا۔ سُورداس اب تک میں نے

تمہارے ساتھ جو کچھ بھلائی برائی کی اُسے معاف کرو۔ آج سے اگر تمہارے ساتھ کوئی
بُرائی کروں تو بھگوان مجھ سے سمجھیں۔ یہ روپے مجھے مت دو۔ میرے پاس روپے
ہیں۔ دوکان بنوالوں گا۔ سبھاگی پر بھی اب مجھے کوئی شک نہیں رہا۔ میں بھگوان کو
بیچ میں ڈال کر کہتا ہوں کہ اب میں کبھی اُسے کوئی کڑوی بات تک نہ کہوں گا۔ میں
اب تک دھوکے میں پڑا ہوا تھا۔ سبھاگی کو میرے یہاں آنے پر راضی کر دو۔ وہ تمہاری
بات کو ناہیں نہ کرے گی۔

سُور داس۔ سدا جی ہی ہے۔ بس اُسے یہی ڈر ہے کہ تم پھر مارنے پیٹنے لگو گے۔

بھیرو۔ نہیں سُور داس۔ اب میں اُسے بھی پہچان گیا۔ میں اُس کے لائق نہیں
تھا۔ اُس کا بیاہ تو کسی دھرماتما آدمی سے ہونا چاہئے تھا۔ (آہستہ) آج تم سے کہتا
ہوں، پہلی بار بھی میں نے ہی تمہارے گھر میں آگ لگائی تھی اور تمہارے روپے
چُرائے تھے۔

سُور داس۔ ان باتوں کو بھول جاؤ بھیرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔ دُنیا میں
کون ہے جو کہے کہ میں گنگا جل ہوں۔ جب بڑے بڑے سادھو سنیاسی مایا موہ
میں پھنسے ہوئے ہیں تو ہماری تمہاری کیا بات ہے۔ ہماری بڑی بھول یہی ہے کہ
کھیل کو کھیل کی طرح نہیں کھیلتے۔ کھیل میں دھاندلی کر کے کوئی جیت ہی جائے تو
کیا ہاتھ آئے گا۔ کھیلنا تو اس طرح چاہئے کہ نگاہ جیت پر رہے پر ہار سے گھبرائے
نہیں۔ ایمان کو نہ چھوڑے۔ جیت کر اتنا نہ اترائے کہ اب کبھی ہار ہو گی ہی نہیں۔
یہ ہار جیت تو زندگانی کے ساتھ ہی ہے۔ ہاں ایک صلاح کی بات کہتا ہوں۔ تم
تاڑی کی دوکان چھوڑ کر کوئی دوسرا روزگار کیوں نہیں کرتے؟

بھیرو۔ جو کہو وہ کروں۔ وہ روزگار ہے کھراب۔ رات دن جُواری۔
چور۔ بدماس آدمیوں ہی کا ساتھ رہتا ہے۔ انہیں کی باتیں سُنو۔ انہیں
کے ڈھنگ سیکھو۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اسی روزگار نے مجھے چوپٹ کیا۔
بتاؤ کیا کروں؟

سُورداس ۔ لکڑی کا روجگار کیوں نہیں کر لیتے ؟ بُرا نہیں ہے ۔ آج کل یہاں پردیسی بہت آئیں گے ۔ بکری بھی اچھی ہوگی ۔ جہاں تاڑی کی دوکان تھی ۔ وہیں ایک باڑہ بنوا دو اور ان روپوں سے لکڑی کا کام کرنا شروع کر دو ۔

بھیرو ۔ بہت اچھی بات ہے ۔ مگر یہ روپے اپنے ہی پاس رکھو ۔ میرے من کا کیا ٹھکانا ۔ روپے پا کر کوئی اور بُرائی نہ کر بیٹھوں ۔ میرے جیسے آدمی کو تو کبھی آدھے پیٹ کے سوا بھوجن نہ ملنا چاہئے ۔ پیسے ہاتھ میں آئے اور سِنگ سوار ہوئی ۔

سُورداس ۔ میرے گھر نہ دوار ۔ رکھوں گا کہاں ؟

بھیرو ۔ اس سے تم اپنا گھر بنوا لو ۔

سُورداس ۔ تمہیں لکڑی کی دوکان سے نپچا ہو تو بنوا دینا ۔

بھیرو ۔ سُبھاگی کو سمجھا دو ۔

سُورداس ۔ سمجھا دوں گا ۔

سُورداس چلا گیا ۔ بھیرو گھر میں گیا تو بڑھیا بولی ۔ تجھے میل کرنے آیا تھا نا ؟

بھیرو ۔ ہاں کیوں نہ میل کرے گا ۔ میں بڑا لاٹ ہوں نا ۔ بڑھاپے میں تجھے اور کچھ نہیں سوجھتا ۔ یہ آدمی نہیں سادھو ہے ۔

(۲۳)

فیکٹری (کارخانہ) قریب قریب تیار ہو گئی تھی ۔ اب مشینیں گڑنے لگیں ۔ پہلے تو مزدور مستری وغیرہ عموماً مِل کے برآمدوں ہی میں رہتے تھے ۔ وہیں پیڑوں کے نیچے کھانا پکاتے اور سوتے تھے ۔ لیکن جب ان کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ۔ تو محلہ میں مکان لے لے کر رہنے لگے ۔ پانڈے پور چھوٹی سی بستی تو تھی ہی ۔ وہاں اتنے مکانات کہاں تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محلہ والے کرایہ کی لالچ سے پردیسیوں کو اپنے اپنے گھروں میں ٹھہرانے لگے ۔ کوئی پردہ کی دیوار کھنچوا لیتا تھا کوئی خود چھوٹا سا چھپّر بنا کر اس میں رہنے لگتا اور مکان کرایہ داروں کو دے دیتا ۔ بھیرو نے لکڑی کی

دوکان کھول لی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہنے لگا۔ اور اپنا رہائشی مکان کرایہ پر اُٹھا دیا۔ ٹھاکر دین نے اپنی دوکان کے سامنے ایک ٹٹی لگا کر گزر کرنا شروع کیا۔ اُس کے گھر میں ایک اور سیرا آ جمے۔ جگدھر سب سے زیادہ لالچی تھا۔ اُس نے سارا مکان اٹھا دیا اور اب ایک پھوس کے چھپر میں نباہ کرنے لگا۔ نایک رام کے برآمدہ میں تو روز ایک بارات ٹھہرتی تھی۔ لالچ نے لوگوں کو یہاں تک گھیرا کہ بجرنگی نے بھی مکان کا ایک حصہ اٹھا دیا۔ ہاں سُورداس نے کسی کو نہیں ٹھہرایا۔ وہ اپنے نئے مکان میں جو رانی اندو کے مخفی عطیہ سے بنا تھا سبھاگی کے ساتھ رہتا تھا۔ سبھاگی ابھی تک بھیرو کے ساتھ رہنے میں راضی نہ ہوئی تھی۔ ہاں بھیرو کی آمد و رفت اب سُورداس کے گھر میں زیادہ تر رہتی تھی۔

کارخانہ میں ابھی مشینیں نہ گڑی تھیں۔ مگر اس کی وسعت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ سُورداس کی بقیہ پانچ بیگھے زمین بھی اسی قاعدے کے مطابق مل کے تصرف میں آ گئی۔ سُورداس نے سُنا تو ہاتھ مل کر رہ گیا۔ پچھتانے لگا کہ جان صاحب ہی سے کیوں نہ سودا کر لیا۔ پانچ ہزار دیتے تھے۔ اب بہت ملیں گے تو دو چار سو مل جائیں گے۔ اب کسی قسم کی تحریک کرنا اُسے بیفائدہ معلوم ہوتا تھا۔ جب پہلے ہی کچھ نہ کر سکا تو اب کیا کر لوں گا۔ پہلے ہی یہ اندیشہ تھا وہ دُرست نہ نکلا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سُورداس ایک درخت کے نیچے بیٹھا جھپکیاں لے رہا تھا۔ کہ تحصیل کے ایک چپڑاسی نے آ کر اُسے پکارا اور ایک سرکاری پروانہ دیا۔ سُورداس سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو زمین ہی کا کچھ جھگڑا ہے۔ پروانہ لئے ہوئے مل میں آیا کہ کسی بابو سے پڑھوا لے۔ مگر کچہری کی خوشخط تحریر مل کے بابوؤں سے کیا پڑھی جاتی۔ کوئی کچھ نہ بتلا سکا۔ مجبوراً واپس آ رہا تھا۔ کہ پربھو سیوک نے دیکھ لیا۔ فوراً اپنے کمرہ میں بُلا لیا اور پروانہ کو دیکھا۔ لکھا ہُوا تھا۔ اپنی زمین کے معاوضہ کے ایک ہزار روپے تحصیل میں آ کر لے جاؤ۔

سُورداس۔ کُل ایک ہزار ہے ؟

پربھوسیوک۔ ہاں اتنا ہی تو لکھا ہے۔

سُورداس۔ تو میں روپے لینے نہ جاؤں گا۔ صاحب نے پانچ ہزار دیتے کہے تھے اُس کے ایک ہی ہزار رہ گئے۔ گھوس گھاس میں سو پچاس روپے اور اُٹھ جائیں گے۔ سرکار کا کھجانا کھالی ہے۔ بھر جائے گا

پربھوسیوک۔ روپے نہ لوگے تو ضبط ہو جائیں گے۔ یہاں تو سرکار اسی تاک میں رہتی ہے کہ کسی طرح رعایا کا دھن اُڑا لے۔ کچھ ٹیکس کے بہانے سے کچھ روزگار کے بہانے سے کچھ کسی بہانہ سے ہضم کر لیتی ہے۔

سورداس۔ گریبوں کی ہچھیا لیتی ہے تو بابا ہزار بھاؤ سے دام نہ دینا چاہئے تھا ایک تو جبر جبتی دھرتی لے لی اُس پر منمانا دام دے دیا۔ یہ کوئی نیائے نہیں ہے۔

پربھوسیوک۔ سرکار یہاں نیائے کرنے نہیں آئی ہے۔ بھائی راج کرنے آئی ہے۔ نیائے کرنے سے اُسے کچھ ملتا ہے؟ کوئی وقت وہ تھا جب نیائے کو راج کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ وقت نہیں ہے۔ اب تجارت کا راج ہے اور جو اس راج کو منظور نہ کرے۔ اس کے لئے ستاروں کا نشانہ مارنے والی توپیں ہیں۔ تم کیا کر سکتے ہو؟ دیوانی میں مقدمہ دائر کروگے؟ وہاں بھی سرکار ہی کے نوکر چاکر انصاف کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

سُورداس۔ میں کچھ نہ لوں گا۔ جب راجہ ہی دھرم کرنے لگا تو پرجا کہاں تک جان بچاتی پھرے گی؟

پربھوسیوک۔ اس سے فائدہ کیا؟ ایک ہزار ملتے ہیں لے لو۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی بھلی۔

یکایک اندردت آپہنچے اور بولے۔ پربھو۔ آج ڈیرا کوچ ہے۔ راجپوتانہ جا رہا ہوں۔

پربھوسیوک۔ فضول جاتے ہو۔ ایک تو ایسی سخت گرمی دوسرے وہاں

کی حالت اب بہت نازک ہو رہی ہے۔ ناحق کہیں پھنس پھنسا جاؤ گے۔

اندر دت۔ میں ایک بار ونے سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُن کے مزاج اخلاق اور اصول میں اتنا تغیر بلکہ انقلاب کیسے واقع ہو گیا۔

پربھو سیوک۔ ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے سمجھ میں پڑنے والا آدمی تو نہیں ہے۔ میں تو اس کا دل و جان سے معتقد ہوں۔ اگر وہ منحرف ہوتے تو میں سمجھ جاؤں گا کہ مذہب ذراسی کا دنیا سے فقدان ہو گیا۔

اندر دت۔ یہ نہ کہو پربھو۔ انسانی فطرت ایک معمہ ہے۔ اس کا جاننا نہایت دشوار ہے مجھے تو ونے کی کایا پلٹ پر اتنا غصہ آتا ہے کہ پاؤں تو گولی مار دوں۔ ہاں اطمینان تو اسی بات کا ہے کہ اُن کے نکل جانے کا اس جماعت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ تمہیں تو معلوم ہے۔ ہم لوگوں نے بنگال میں مصیبت زدوں کو قرار واقعی مدد دینے کی کتنی زبردست کوشش کی ہے۔ کئی کئی دنوں تک تو ہم لوگوں کو ایک دانہ تک میسر نہ ہوتا تھا۔

سورداس۔ بھیا کون لوگ اس طرح غریبوں کا پالن کرتے ہیں؟

اندر دت۔ ارے سورداس۔ تم یہاں گوشہ میں کھڑے ہو۔ میں نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں۔ کہو سب خیریت ہے نا؟

سورداس۔ سب بھگوان کی دَایا ہے۔ تم ابھی کن آدمیوں کی بات کر رہے تھے؟

اندر دت۔ اپنے ہی ساتھیوں کی۔ کنور بھرت سنگھ نے کچھ نوجوانوں کو جمع کر کے ایک ٹولی بنا دی ہے۔ اور اس کے خرچ کے لئے تھوڑی سی زمین بھی دان کر دی ہے۔ آج کل ہم لوگ کوئی سو آدمی ہیں۔ دیش کی حتے المقدور خدمت کرنا ہی ہم لوگوں کا خاص فرض ہے۔ اس وقت ہم میں سے کچھ لوگ تو راجپوتانہ کو گئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ پنجاب کو۔ جہاں سرکاری فوج نے رعایا پر گولیاں چلا دی ہیں۔

سُور داس ۔ بھیّا یہ تو بڑے پُن کا کام ہے ۔ ایسے مہاتماؤں کے تو درشن کرنا چاہیے تو بھیّا تم لوگ چندے بھی اُگاہتے ہو گے؟

اندردت ۔ ہاں جس کی مرضی ہوتی ہے چندہ بھی دے دیتا ہے لیکن ہم لوگ خود نہیں مانگتے پھرتے ۔

سُور داس ۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں تو آپ مجھے رکھیں گے؟ یہاں پڑے پڑے اپنا پیٹ پالتا ہوں ۔ آپ کے ساتھ رہوں گا تو آدمی ہو جاؤں گا ۔

اندردت نے پربھوسیوک سے انگریزی میں کہا ۔ کتنا بھولا آدمی ہے ۔ خدمت اور ایثار کا مجسم نمونہ ہونے پر بھی غرور چھو تک نہیں گیا ۔ اپنے نیک کاموں کی کچھ قدر ہی نہیں سمجھتا ۔ پر اپکار اب اس کے لئے کوئی اختیاری فعل نہیں رہا ۔ وہ اس کی عادت ہی میں داخل ہو گیا ہے ۔

سُور داس نے پھر کہا ۔ اور کچھ تو نہ کر سکوں گا ۔ اپڑھ گنوار ٹھہرا ۔ پر جس کے سرہانے بٹھا دیجئے گا پنکھا جھلتا رہوں گا ۔ پیٹھ پر جو کچھ لاد دیجئے گا لئے پھروں گا ۔

اندردت ۔ تم معمولاً جو کچھ کرتے ہو وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ جیسے ہم لوگ کبھی کبھی خاص موقعوں پر کرتے ہیں ۔ دشمن کے ساتھ نیکی کرنا مریضوں کی تیمارداری سے کسی طرح کم نہیں بلکہ زیادہ اچھا ہے ۔

سُور داس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا جیسے کسی شاعر نے کسی سخن فہم سے داد پائی ہو ۔ بولا ۔۔۔ بھیّا ہماری کیا بات چلاتے ہو؟ جو آدمی پیٹ پالنے کے لئے بھیک مانگے گا وہ پُن دھرم کیا کرے گا؟ بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں ۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر آپ کا حکم ہو تو مجھے ماوجہ (معاوضہ) کے جو روپے ملے ہیں انہیں آپ کی سنگت کے بھینٹ کر دوں؟

اندردت کیسے روپے ۔

پربھوسیوک ۔ اس کی داستان بڑی طویل ہے ۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ پاپا نے راجہ مہیندر کمار کی مدد سے اُس کی جو زمین لے لی تھی اُس کا ایک ہزار روپیہ معاوضہ

اسے مروا گیا ہے۔ یہ بل اسی لوٹ کے مال پر پل رہی ہے۔

اندروت۔ تم نے اپنے پاپا کو منع نہیں کیا؟

پربھوسیوک۔ قسم خدا کی میں اور صوفی دونوں ہی نے پاپا کو بہت روکا۔ پر تم اُن کی عادت جانتے ہی ہو۔ کوئی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ تو کسی کی نہیں سُنتے۔

اندروت۔ میں تو اچھے باپ سے لڑ جاتا۔ بل بنتی بھاڑ میں جاتی۔ ایسی حالت میں تمہارا کم از کم یہ فرض تھا کہ بل سے بالکل علیحدہ رہتے۔ باپ کا حکم ماننا بیٹے کا فرض ہے۔ یہ میں جانتا ہوں لیکن جب باپ بے انصافی کرنے لگے تو بیٹا اُس کی تقلید کرنے کے لئے مجبور نہیں۔ تمہاری نظموں کے تو ایک ایک لفظ سے اخلاقی جوہر ٹپکتا ہے ایسی پرواز کرتے ہو کہ ہریشچندر اور حسین بھی مات ہو جائیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری ساری طاقت لفظوں کی بندش ہی میں صرف ہو جاتی ہے۔ عمل کے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ واقعی بات تو یہ ہے کہ تم اپنے کلام کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ بس زبان ہی کے شیر ہو۔ سُورداس ہم لوگ تم جیسے غریبوں سے چندہ نہیں لیتے۔ ہمارے داتا امیر لوگ ہیں۔

سُورداس۔ بھیا تم نہ لوگے تو کوئی چور لے جائے گا۔ میرے پاس روپوں کا کام ہی کیا ہے؟ تمہاری دیا سے پیٹ بھر اناج مل ہی جاتا ہے۔ رہنے کو جھونپڑی بن ہی گئی ہے۔ اور کیا چاہئے؟ کسی اچھے کام میں لگ جانا اس سے کہیں اچھا ہے۔ کہ چور اُٹھا لے جائیں۔ میرے اوپر اتنی دیا کرو۔

اندروت۔ اگر دینا ہی چاہتے ہو۔ تو کوئی کنواں کُھدوا دو۔ بہت دنوں تک تمہارا نام رہے گا۔

سُورداس۔ بھیا مجھے نام کی بھوک نہیں ہے۔ بہانے مت کرو۔ یہ روپے لے کر اپنی سنگت میں دے دو۔ میرے سر سے بوجھ ٹل جائے گا۔

پربھوسیوک۔ (انگریزی میں) دوست اس کے روپے لے لو ورنہ اسے چین نہ آئے گا۔ اس فیاضی کو فرشتوں کی فیاضی کہنا اس کی تحقیر کرنا ہے۔ میرا تو

تخیل بھی وہاں تک نہیں پہنچا۔ ویسے ایسے لوگ بھی دنیا میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اپنے بھرے ہوئے تھال میں سے ایک نوالہ اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ تو دوسرے روز اخباروں میں اپنا نام دیکھنے کو دوڑتے ہیں۔ اڈیٹر اگر اس خبر کو جلی حروف میں نہ شائع کرے تو اسے گولی مار دیں۔ یہ دنیا مقدس ہستی ہے!

اندر دت۔ سورداس اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں روپے لے لوں گا مگر اس شرط پر کہ تمہیں جب کبھی کوئی ضرورت ہو تمہیں فوراً مطلع کرو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی ہی تمہاری کٹی ایک تیرتھ کا مقام ہو جائے گی اور لوگ تمہارے درشن کو آیا کریں گے۔

سورداس۔ تو میں آج روپے لاؤں گا۔

اندر دت۔ اکیلے نہ جانا۔ ورنہ کچہری کے گرگے تمہیں بہت دق کریں گے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔

سورداس۔ اب ایک بنتی (عرض) آپ سے بھی ہے صاحب۔ آپ پتلی گھر کے مجوروں کے لئے گھر کیوں نہیں بنوا دیتے۔ ساری بستی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور روز اودھم مچاتے رہتے ہیں۔ ہمارے محلہ میں کسی نے عورتوں کو نہیں چھیڑا تھا۔ نہ کبھی اتنے دھڑلے سے جوا ہوا۔ نہ سرابیوں کا ایسا ہلڑ رہا۔ جب تک مجور لوگ یہاں کام پر نہیں آجاتے۔ عورتیں گھروں سے پانی بھرنے نہیں نکلتیں۔ رات کو اتنا سور ہوتا ہے کہ نیند نہیں آتی۔ کسی کو سمجھاؤ تو لڑنے پر اتارو (آمادہ) ہو جاتا ہے۔

یہ کہہ کر سورداس چپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میں نے بات کو بہت بڑھا کر تو نہیں کہا۔ اندر دت نے پربھو سیوک کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بھئی یہ تو اچھی بات نہیں۔ اپنے پاپا سے کہو۔ اس کا جلد بندوبست کریں۔ نہ جانے تمہارے وہ اصول کیا ہو گئے؟ بیٹھے بٹھائے یہ ساری برائیاں دیکھ رہے ہو اور کچھ کرتے دھرتے نہیں۔

پربھو سیوک۔ مجھے تو یک دم اس کام سے نفرت ہے۔ میں نہ اسے

پسند کرتا ہوں۔ نہ اس کے قابل ہوں۔ میری زندگی کا مسرت انگیز بہشت تو یہی ہے کہ کسی پہاڑی کے دامن میں ایک چشمہ کے کنارہ پر چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر پڑا رہوں۔ نہ دنیا کی فکر ہو نہ عاقبت کی۔ نہ اپنے نام کو کوئی رونے والا ہو نہ ہنسنے والا۔ یہی میری زندگی کی معراج ہے۔ مگر اُس معراج پر پہنچنے کے لئے جس باقاعدگی اور کوشش کی ضرورت ہے اس سے محروم ہوں خیر یہ بات تو یہ ہے کہ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ میرا تو یہاں آنا نہ آنا دونوں برابر ہیں۔ صرف پاپا کے لحاظ سے چلا آتا ہوں۔ وقت کا زیادہ حصّہ یہی سوچنے میں صرف کرتا ہوں کہ اس قید سے کیونکر نجات ملے۔ آج ہی پاپا سے کہوں گا۔

اندردت۔ ہاں آج ہی کہنا۔ تمہیں تامل ہو تو میں کہہ دوں۔

پربھوسیوک۔ نہیں جی۔ اس میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ اس سے تو میرا ننگ اور جسم جائے گا۔ پاپا کو خیال ہوگا کہ اب اس کا جی لگنے لگا۔ کچھ اس نے کہا تو اُن کا تو مجھ سے یہی رونا ہے۔ کہ میں کسی بات میں بولتا ہی نہیں۔

اندردت یہاں سے چلے تو سُورداس بہت دُور تک اُن کے ساتھ اسی خدمت جماعت کی باتیں پوچھتا ہوا چلا گیا۔ جب اندردت نے بہت اصرار کیا تو لوٹا۔ اندردت وہیں سڑک پر کھڑا ہوا اُس نحیف عاجز انسان کو ہوا کے جھونکوں سے لڑکھڑاتے اور درختوں کے سایہ میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ شاید یہ تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ کہ یہ انسان ہے یا فرشتہ!

(۳۴)

پربھوسیوک نے گھر آتے ہی مکانوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ جان سیوک یہ سُن کر بہت خوش ہوئے کہ اب اس نے کارخانہ کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ بولے ۔۔۔ ہاں مکانوں کا بننا بہت ضروری ہے۔ انجنیر سے کہو ایک نقشہ بنائیں۔ میں انتظامی کمیٹی کے سامنے اس تجویز کو پیش کروں گا۔ قلیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ

مکانات بنوانے کی ضرورت نہیں لمبی لمبی بارکیں بنوا دی جائیں تاکہ ایک ایک کمرہ میں دس بارہ مزدور رہ سکیں۔

پرکھو سیوک۔ لیکن بہت سے قلی ایسے بھی تو ہوں گے جو بال بچوں کے ساتھ رہنا چاہیں گے۔

مسز سیوک۔ قلیوں کے بال بچوں کو وہاں جگہ دی جائے گی تو ایک شہر آباد ہو جائے گا۔ نہیں، اُن سے کام لینا کہ انہیں آباد کرنا ہے جیسے فوج کے سپاہی رہتے ہیں اُسی طرح قلی لوگ بھی رہیں گے۔ ایک چھوٹا سا چرچ ضرور ہونا چاہیئے۔ پادری کے لئے ایک مکان کا ہونا بھی ضروری ہے۔

ایشور سیوک۔ خدا تجھے سلامت رکھے بیٹی۔ تیری یہ رائے مجھے بہت پسند آئی۔ قلیوں کے لئے روحانی غذا جسمانی غذا سے کم ضروری نہیں۔ خداوند یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا۔ کتنی عمدہ تجویز ہے۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ دن کب آئے گا جب قلیوں کے دل مسیح کے کلام پاک سے آسودہ ہو جائیں گے۔

جان سیوک۔ لیکن تو خیال کیجئے کہ میں اس مذہبی تحریک کی تجویز کو کمیٹی کے سامنے کیوں کر رکھ سکوں گا؟ میں اس کا مختار کل تو نہیں ہوں۔ دیگر ممبران کمیٹی نے مخالفت کی تو اُس کا کیا جواب دوں گا۔ میرے سوا کمیٹی میں اور کوئی عیسائی نہیں ہے۔ میں اس تجویز کو کمیٹی کے روبرو ہرگز نہ رکھوں گا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس تجویز میں کتنی مذہبی جانبداری ہے۔

مسز سیوک۔ جب کوئی مذہبی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو تم خواہ مخواہ اس میں اعتراض کرتے ہو۔ ہندو قلی تو جلد ہی کسی درخت کے نیچے دو چار اینٹ پتھر رکھ کر انہیں پوجنا شروع کر دیں گے۔ مسلمان لوگ بھی کھلے میدان میں نماز پڑھ لیں گے۔ تو پھر چرچ سے کسی کو کیا خصومت ہو سکتی ہے۔

ایشور سیوک۔ خداوند یسوع مجھ پر اپنی برکتوں کی بارش کر! بائبل مقدس کی بشارتیں تو ہر شخص کے لئے راحت بخش ہیں۔ ان کی اشاعت میں کسی کو کچھ

اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کچھ اعتراض ہو بھی تو تم اس دلیل سے اُسے رد کر سکتے ہیں۔ بادشاہ کا مذہب بھی مذہبوں کا بادشاہ ہے۔ آخر سرکار نے مذہبی اشاعت کا محکمہ کھولا ہے تو کون اعتراض کر سکتا ہے اور کرے بھی تو کون اُسے سنتا ہے؟ میں آج ہی اس معاملہ کو چرچ میں پیش کروں گا اور حکام کو مجبور کروں گا کہ وہ کمپنی پر دباؤ ڈالیں۔ مگر یہ تمہارا کام ہے میرا نہیں۔ تمہیں خود ان باتوں کا خیال ہونا چاہئے۔ نہ ہوئے مسٹر کلارک اس وقت!

مسز سیوک۔ وہ ہوتے تو پھر کوئی دقت ہی نہ ہوتی۔

جان سیوک۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس تجویز کو کیسے پیش کروں گا۔ اگر کمپنی کوئی مندر یا مسجد بنوانے کی تجویز کرتی تو میں بھی چرچ کی تعمیر پر زور دیتا۔ لیکن جب تک اور لوگ پیش قدمی نہ کریں میں کچھ نہیں کر سکتا اور نہ کرنا مناسب ہی سمجھتا ہوں۔

ایشور سیوک۔ ہم اوروں کے پیچھے پیچھے کیوں چلیں؟ ہمارے ہاتھوں میں چراغ ہے۔ کندھے پر لاٹھی ہے۔ کمر میں تلوار ہے۔ پیروں میں طاقت ہے۔ ہم کیوں نہ آگے چلیں؟ کیوں دوسروں کا منہ تاکیں؟

مسٹر جان سیوک نے اپنے والد سے زیادہ بحث مباحثہ فضول سمجھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ آدھی رات تک پربھو سیوک کے ساتھ بیٹھے ہوئے مختلف طریقوں پر نقشے بناتے اور بگاڑتے رہے۔ کدھر کی زمین لی جائے۔ کتنی زمین کافی ہوگی۔ کتنا صرفہ ہوگا۔ کتنے مکان بنیں گے۔ پربھو سیوک "ہاں ہاں" کرتا جاتا تھا۔ ان باتوں میں جی نہ لگتا تھا۔ کبھی اخبار دیکھنے لگتا۔ کبھی کوئی کتاب اُٹھا کے پلٹنے لگتا۔ کبھی اُٹھ کر برآمدہ میں چلا جاتا۔ لیکن انہماک باریک بین نہیں ہوتا۔ مقرر اپنی تقریر کے جوش میں یہ کب دیکھتا ہے کہ سامعین میں کتنوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ پربھو سیوک کو اس وقت ایک نیا عنوان سوجھا تھا اور اُس پر نظم لکھنے کے لئے وہ بیتاب ہو رہا تھا۔ نئی نئی تشبیہیں نئی نئی بندشیں

کسی چشمہ پر بہہ کر آنے والے پھولوں کی طرح اُس کے دماغ میں دوڑتی چلی آرہی تھیں۔ وہ اُن کو جمع کرنے کے لئے بیقرار تھا کیونکہ وہ ایک بار آکر۔ ایک بار اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتی ہیں۔ بارہ بجے تک وہ اسی پریشانی میں مبتلا رہا۔ نہ بیٹھے بنتا تھا۔ نہ اُٹھتے۔ یہاں تک کہ اُسے جھپکیاں آنے لگیں۔ جان سیوک نے بھی اب آرام کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن جب پربھو سیوک پلنگ پر گیا تو نیند روٹھ چکی تھی۔ کچھ دیر تک تو اُس نے اُسے منانے کی کوشش کی۔ پھر لیمپ کے سامنے بیٹھ کر اسی عنوان پر نظم لکھنے لگا۔ ایک لمحہ بعد وہ کسی دوسری ہی دنیا میں تھا۔ وہ ویہاتیوں کی طرح صرافہ میں پہنچ کر اُس کی چمک دمک پر فریفتہ نہ ہو جاتا تھا۔ اگر اُس دنیا کی ہر چیز مزین معطر۔ دلکش اور خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مگر کتنی ہی چیزوں کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر صرف سُنہرا پرت چڑھا ہُوا ہے۔ اصل میں وہ یا تو پُرانی ہے یا مصنوعی۔ ہاں جب اُسے واقعی کوئی نیا جواہر مِل جاتا تھا تو اُس کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا۔ صنّاع اپنی صنعت کا بہترین نقّاد ہوتا ہے۔ پربھو سیوک کے تخیل نے کبھی اتنی بلند پروازی نہ دکھائی تھی۔ ایک ایک شعر لکھ کر وہ اُسے گا گا کر پڑھتا اور جھومتا۔ جب نظم ختم ہو گئی تو وہ سوچنے لگا۔ دیکھوں شعرائے وقت اسے کتنا پسند کرتے ہیں۔ اڈیٹروں کی تعریف کی تو کوئی وقعت نہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سخن فہم ہوں۔ کسی نئے ناآشنا شاعر کی بُڑھیا سے بڑھیا نظم قبول نہ کریں گے۔ مگر پُرانے شعراء کی سڑی گلی۔ گھٹیا اور بھرتی والی نظمیں بھی منظور کرلیں گے۔ شعراء کا یہ حال کہ وہ سخن فہم ہوتے ہوئے بھی کنجوس ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹے موٹے تُک بندوں کی چاہے تعریف کردیں مگر جسے اپنا مخالف سمجھتے ہیں اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ کنور صاحب تو ضرور پھڑک جائیں گے۔ کاش ونے سنگھ یہاں ہوتے تو میری قلم چُوم لیتے۔ کل کنور صاحب سے کہوں گا کہ میرے کلام کا مجموعہ شائع کرا دیجئے۔ زمانہ حال کے نئے طرز والے شعراء میں تو کسی کو مجھ سے مقابلہ کرنے کا دعوے ہو نہیں سکتا اور پُرانے طرز کے شعراء سے میرا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

میرے اور ان کے تخیل کے دائرے جُدا جُدا ہیں۔ اُن کے یہاں زبان کی دلکشی ہے۔ عروض کی کوئی غلطی نہیں۔ کھوجنے پر بھی کوئی نقص نہ ملے گا۔ لیکن مضمون آفرینی کا نام ہی نہیں۔ اصلیت کا کہیں پتہ نہیں۔ وہی پرانی زمینیں ہیں۔ وہی پامال مضامین خیالات کی تازگی عموماً نظر نہیں آتی۔ دس بیس اشعار پڑھئے پر کہیں ایک بات ملتی ہے۔ یہاں تک کہ تشبیہیں بھی وہی پرانی جو پُرانے شاعروں نے باندھ رکھی ہیں۔ میری زبان اتنی شُستہ نہ ہو لیکن بھرتی کے لئے تو میں نے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ ایسا لکھنے سے فائدہ کیا؟

صبح وہ منہ ہاتھ دھوکر، وہ نظم کو جیب میں رکھکر بلا ناشتہ کئے ہوئے گھر سے چلا۔ تو جان سیوک نے پوچھا۔ کیا ناشتہ نہ کروگے۔ اتنے سویرے کہاں جاتے ہو؟

پربھو سیوک نے بے رُخی سے جواب دیا۔ ذرا کنور صاحب کی طرف جا رہا ہوں۔

جان سیوک۔ تو اُن سے کل کی تجویز کے متعلق گفتگو کرنا۔ اگر وہ متفق ہو جائیں۔ تو پھر کسی کو مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہو۔

مسز سیوک۔ وہی چرچ کے بارہ میں نا؟

جان سیوک۔ جی نہیں۔ تمہیں اپنے چرچ ہی کی پڑی ہوئی ہے۔ میں نے تجویز کیا ہے کہ پانڈے پور کی بستی خالی کرالی جائے اور وہیں قلیوں کے مکانات تعمیر کرائے جائیں۔ اس سے بہتر وہاں کوئی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔

پربھو سیوک۔ رات کو تو آپ نے اس بستی کے لینے کا تذکرہ نہ کیا تھا۔

جان سیوک۔ نہیں آؤ۔ ذرا یہ نقشہ دیکھو۔ بستی کے باہر کی طرف کافی زمین نہیں ہے۔ ایک طرف سرکاری پاگل خانہ ہے۔ دوسری طرف رائے صاحب کا باغ۔ تیسری طرف ہماری مِل۔ بستی کے سوا اور جگہ ہی کہاں ہے؟ اور پھر بستی ہی کون سی بڑی مشکل سے پندرہ بیس یا زیادہ سے زیادہ تیس گھر ہوں گے۔ اُن کا معاوضہ دے کر زمین لینے کی کیوں نہ کوشش کی جائے؟

پربھو سیوک۔ اگر بستی کو اُجاڑ کر مزدوروں کے لئے مکانات بنوانے ہیں۔

تو رہنے ہی دیجئے۔ کسی نہ کسی طرح گزر تو ہو ہی رہا ہے۔

جان سیوک۔ اگر ایسی بستیوں کی حفاظت کا خیال کیا گیا ہوتا تو آج یہاں ایک بنگلہ بھی نہ نظر آتا۔ یہ بنگلے اُس میں نہیں بنے ہیں۔

پربھو سیوک۔ مجھے ایسے بنگلے سے جھونپڑا ہی پسند ہے۔ جس کے لئے کئی غریبوں کے گھر گرانے پڑیں۔ میں کنور صاحب سے اس بارہ میں کچھ نہ کہوں گا۔ آپ خود کہئے گا۔

جان سیوک۔ یہ تمہاری پست ہمتی ہے۔ میں اسے قناعت اور رحم کہہ کر تمہیں دھوکے میں نہ ڈالوں گا۔ تم زندگی کی آسائشیں تو چاہتے ہو لیکن اُن آسائشوں کے لئے جن ذرائع کی ضرورت ہے اُن سے دُور بھاگتے ہو۔ ہم نے تمہیں عملی طریقہ پر کبھی دولت و اقتدار سے متنفر ہوتے نہیں دیکھا۔ تم اچھے سے اچھا مکان اچھے سے اچھا کھانا۔ اچھے سے اچھا کپڑا چاہتے ہو لیکن بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہی چاہتے ہو کہ تمہارے میں کوئی شہد اور شربت ٹپکا دے۔

پربھو سیوک۔ رسم و رواج سے مجبور ہو کر انسان کو اکثر اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنا پڑتا ہے۔

جان سیوک۔ جب آسائشوں کے لئے تم رسم و رواج سے مجبور ہو جاتے ہو تو آسائشوں کے وسائل کے لئے کیوں اُنہیں باتوں سے مجبور نہیں ہوتے؟ تم دل اور زبان سے موجودہ طرزِ معاشرت کی کتنی ہی بُرائی کیوں نہ کرو۔ مجھے ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا۔ تم اس بارہ میں کچھ دو۔ نظمیں لکھو۔ مضامین تیار کرو۔ میں خوش ہو کر انہیں پڑھوں گا اور تمہاری تعریف کروں گا۔ لیکن عملی دائرہ میں آکر اُن خیالات کو اُسی طرح بھول جاؤ جیسے اچھے سے اچھا سوٹ پہن کر موٹر پر سیر کرتے وقت تم قناعت ایثار اور نفس کشی کے اصولوں کو بھول جاتے ہو۔

پربھو سیوک اور کتنے ہی آسائش پسندوں کی طرح اصولاً جمہوریت کے قائل تھے۔ جن حالات میں اُن کی پرورش ہوئی تھی۔ جن طریقوں سے اُن کی دماغی اور روحانی تربیت ہوئی تھی اُن سے آزاد ہو جانے کے لئے جس اخلاقی جرأت کی ضرورت

طاقت کی ضرورت ہے اس سے وہ محروم تھے۔ وہ خیالی دائرہ میں ایثار کے جذبات کو جگہ
دے کر خوش ہوتے تھے اور اُن پر فخر کرتے تھے۔ اُنہیں شاید کبھی سُوجھا ہی نہ تھا کہ اِن
جذبات کو عملی جامہ بھی پہنایا جا سکتا ہے۔ وہ باقاعدگی کے اتنے پابند نہ تھے کہ اپنی
آسائشوں کو اُن جذبات پر قربان کر دیتے۔ جمہوریت اُن کے لئے تفریح کا ایک مسئلہ
تھا اور لبس۔ آج تک کبھی کسی نے اُن کے طرزِ عمل کی تنقید نہ کی تھی۔ کسی نے انہیں طنز کا
نشانہ نہ بنایا تھا۔ اور دوستوں پر اپنی آزاد خیالی کی دھاک جمانے کے لئے اُن کے ویسے
خیالات ہی کافی تھے۔ کنور بھرت سنگھ کے ترکِ تعلق اور ایثار کا اُن پر اس لئے اثر
نہ ہوتا تھا کہ وہ اُن کو زیادہ اونچے درجہ کا انسان سمجھتے تھے۔ اشرفیوں کی تفیلی تحمل
کی ہو یا کھدر کی زیادہ فرق نہیں۔ والد کی زبان سے یہ طنز سُن کر ایسا تلملا اُٹھے۔
گویا تازیانہ لگایا گیا ہو۔ آگ چاہے پھُوس کو نہ جلا سکے۔ آہنی کیل چاہے مٹی میں نہ سما
سکے۔ کانچ چاہے پتھر کی چوٹ سے نہ ٹوٹ سکے۔ طنز شاید ہی کبھی دل کو تحریک کرنے
اُس میں خنجیں اور اُسے چوٹ پہنچانے میں ناکامیاب ہوتا ہو۔ خصوصاً جب وہ
اُس آدمی کی زبان سے نکلے جو ہماری زندگی کو بنا یا بگاڑ سکتا ہو۔ پربھو سیوک
کو گویا کالی ناگن نے ڈس لیا جس کے کاٹے کو لہر بھی نہیں آتی۔ اُن کی سوئی ہوئی غیرت
جاگ اُٹھی۔ اُنہیں اپنی پستی کا علم ہُوا۔ کنور صاحب کے یہاں جانے کو تیار رکھتے ۔
گاڑی تیار کرائی تھی۔ مگر وہاں نہ گئے۔ آکر اپنے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ وہ آبدیدہ ہو
گئے۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں اتنے دنوں تک مغالطہ میں پڑا رہا بلکہ اس خیال سے
کہ والد کو میرا رہنا شاق گزرتا ہے۔ " ان باتوں کے سُننے پر اب میرے لئے ڈوب
مرنے کی بات ہوگی۔ اگر میں اُن پر اپنی زندگی کا بار ڈالوں۔ مجھے خود اپنی معاش کا مسئلہ
حل کرنا چاہئے۔ اُنہیں کیا معلوم نہیں تھا کہ میں رسم و رواج سے مجبور ہو کر ہی اس
عیش پسندی میں پڑا ہُوا ہوں؟ ایسی حالت میں مجھے اُن کا طعنہ دینا سراسر بے
انصافی ہے۔ اتنے دنوں تک نقلی زندگی بسر کرنے کے بعد اب میرے لئے یکایک
اپنا طرزِ معاشرت تبدیل کرنا غیر ممکن ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ میرے دل میں ایسے

خیالات پیدا ہوئے۔ ان خیالات کے ہوتے ہوئے میں کم از کم اوروں کی طرح خود غرض اور لالچی تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں بیفائدہ اس قدر افسوس کر رہا ہوں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیئے۔ کہ پاپا نے وہ کام کر دیا جو ارادہ اور اصول سے ممکن نہ ہوا تھا۔ اب مجھے ان سے کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ انہیں شاید میرے چلے جانے سے رنج بھی نہ ہوگا۔ انہیں خوب معلوم ہو گیا ہے۔ میری ذات سے اُن کی دولت پرستی آسودہ نہیں ہو سکتی۔ آج یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ بس یہی ٹھیک ہے چل کر کنور صاحب سے کہتا ہوں کہ مجھے بھی رضا کاروں میں شامل کر لیجئے۔ کچھ دنوں تک اس زندگی کا لطف بھی حاصل کروں۔ دیکھوں مجھ میں اور بھی کسی کام کی قابلیت ہے یا صرف نظم ہی لکھ سکتا ہوں۔ اب کوہستانی چوٹیوں کی سیر کروں گا۔ دیہاتوں میں گھوموں گا۔ قدرتی مناظر کو دیکھوں گا۔ روز نیا دانہ نیا پانی نئی تفریح نئے منظر اس سے زیادہ مسرت خیز اور کون زندگی ہو سکتی ہے؟ تکلیف بھی ہوگی۔ دھوپ ہے۔ بارش ہے۔ سردی ہے۔ خوف ناک جانور ہیں۔ مگر تکلیفوں سے تو میں کبھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ الجھن تو مجھے خانہ داری کے جھنجھٹوں سے ہوتی ہے۔ یہاں کتنی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ روٹیوں کے لئے دوسروں کی غلامی اپنی خواہش کو دوسروں کا محتاج بنا دیا! نوکر اپنے آقا کو دیکھ کر کیسا دبک جاتا ہے۔ اس کے چہرہ پر کتنا انکسار کتنا خوف چھا جاتا ہے۔ میں اپنی آزادی کی اب سے زیادہ قدر کرنا سیکھوں گا۔"

دوپہر کو جب گھر کے سب لوگ پنکھوں کے نیچے آرام سے سوئے تو پیر پربھو سیوک نے چپکے نکل کر کنور صاحب کے گھر کا راستہ لیا۔ پہلے تو جی میں آیا کہ کپڑے اتار دوں اور صرف ایک کرتہ پہن کر چلا جاؤں۔ مگر ایسے پھٹے جاموں گھر سے کبھی نہ نکلا تھا۔ کپڑے بدل ڈالنے کے لئے شاید خیالات بدل ڈالنے سے زیادہ اخلاقی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے صرف اپنی نظموں کے بیاض لے لی اور چل کھڑا ہوا۔ گھر چھوڑنے سے ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ ذرا بھی پشیمانی نہ تھی۔ ایسا خوش تھا جیسے قید سے چھوٹا ہو۔ "آپ لوگوں کو اپنی دولت مبارک ہو۔ پاپا نے مجھے بالکل بے غیرت، بے حس اور آرام پسند

سمجھ رکھا ہے۔ جیسے تو ذرا سی بات پر اُبل پڑے۔ اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں بالکل مُردہ نہیں ہوں۔"

کنور صاحب دوپہر کو سونے کے عادی نہ تھے۔ فرش پر لیٹے کچھ سوچ رہے تھے۔ پربھو سیوک جا کر بیٹھ گئے۔ کنور صاحب نے کچھ نہ پوچھا۔ کیسے آئے کیوں اُداس ہو۔ نصف گھنٹہ تک بیٹھے رہنے کے بعد بھی پربھو سیوک کو اُن سے اپنے بارہ میں کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ کوئی تمہید نہ سُوجھتی تھی۔ "کنور صاحب آج سُم گُم کیوں ہیں؟ کیا میری صورت سے نالاں تو نہیں ہو گئے۔ کہ کچھ حاجت لے کر آیا ہے؟ یوں تو مجھے دیکھتے ہی خوش ہو جاتے تھے۔ دوڑ کر سینہ سے لگاتے تھے۔ آج مخاطب ہی نہیں ہوتے۔ دوسروں کا منہ تاکنے کی یہی سزا ہے۔ میں بھی گھر سے چلا تو ٹھیک دوپہر کو۔ جب چڑیاں تک گھونسلوں سے نہیں نکلتیں۔ آنا تھا تو شام کو آتا۔ اس جلتی ہوئی دھوپ میں کوئی غرض کا باؤلا ہی گھر سے نکل سکتا ہے۔ خیر یہ پہلا تجربہ ہے۔" وہ مایوس ہو کر چلنے کے لئے اُٹھے کہ بھرت سنگھ بولے۔ کیوں کیوں جلدی کیا ہے؟ کیا اس لئے کہ میں نے باتیں نہیں کیں؟ باتوں کی کمی نہیں ہے۔ اتنی باتیں تم سے کرنی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شروع کیسے کروں۔ تمہاری رائے میں ونے سنگھ نے ریاست کا پلہ پکڑنے میں غلطی کی؟

پربھو سیوک نے پس و پیش میں پڑ کر کہا۔ اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے۔

کنور۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے بُرا کیا۔ اُس کی ماں کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ تو اتنی برہم ہیں کہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے جو روش اختیار کی ہے اُس پر شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شاید ان حالتوں میں میں بھی یہی کرتا۔ صوفیا سے اُسے محبت نہ ہوتی تو بھی اس موقع پر رعایا نے جو بغاوت کی وہ اُس کے جمہوریت کے اصولوں کو متزلزل کر دینے کے لئے کافی تھی۔ مگر جب یہ مسلمہ ہے کہ صوفیا کی محبت اُس کی رگ رگ میں سرایت کر

گئی ہے تو اُس کا طرزِ عمل صرف قابلِ عفو نہیں بلکہ قابلِ ستائش ہے۔ وہ مذہب تو محض جماعتی ہے جس کی مدد سے اپنی برادری کے باہر شادی کرنا ممنوع ہو کیونکہ اس سے اُسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مذہب اور معرفت دونوں مترادف ہیں اور اس نقطۂ خیال سے دُنیا میں صرف ایک مذہب ہے۔ ہندو، مسلمان۔ عیسائی۔ یہودی۔ بُدھ یہ مذہب نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف اغراض والی گروہ بندیاں ہیں جن سے نقصان کے سوا آج تک کسی کو نہیں پہنچا۔ اگر وہ نے اتنا خوش نصیب ہو کہ صوفیا سے رشتۂ عقد قائم کر سکے، تو کم از کم مجھے ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا۔

پربھو سیوک۔ مگر آپ جانتے ہیں اس معاملہ میں رانی صاحبہ جس قدر سخت ہیں اُتنا ہی میری ماما بھی ہیں۔

کنور۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ دونوں کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ یہ دونوں انمول جواہر مذہب کے ہاتھوں مٹی میں مل جائیں گے۔

پربھو سیوک۔ میں تو خود ان جھگڑوں سے اُتنا تنگ آگیا ہوں کہ میں نے گھر سے الگ ہو جانے کا مصمم قصد کر لیا ہے۔ گھر کی مذہبی آب و ہوا معاشرتی قیود سے میری روح کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ گھر سے نکل جانے کے سوا اب مجھے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ مجھے تجارت سے پیشتر ہی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور اب اتنے دنوں کے تجربہ کے بعد تو مجھے اس سے نفرت ہی ہو گئی ہے۔

کنور۔ لیکن تجارت تو کسی تہذیب کا سب سے بڑا جزو ہے۔ تمہیں اُس سے کیوں اس قدر نفرت ہے؟

پربھو سیوک۔ اس لئے کہ تجارت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے جتنی خود غرضی اور مردم آزاری کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ مجھ میں اتنا انہماک ہی نہیں ہے۔ میں فطرتاً تنہائی پسند واقع ہوا ہوں۔ اور زندگی کی کشمکش میں اُس سے زیادہ نہیں پڑنا چاہتا جتنا میرے فن کی تکمیل اور اس میں واقفیت کا رنگ لانے کے لئے کافی ہو۔ شعراء بالعموم تنہائی پسند ہی ہوا کئے ہیں مگر اس سے

ان کی شاعری میں کوئی نقصان نہیں آنے پایا ممکن تھا کہ وہ زندگی کا وسیع اور کافی تجربہ حاصل کر کے اپنے کلام کو زیادہ دلچسپ بنا سکتے لیکن اس کے ساتھ یہ اندیشہ بھی تھا کہ زندگی کی کشمکش میں پڑ جانے سے اُن کے تخیل میں کمی واقع ہو جاتی۔ ہومر اندھا تھا۔ سور بھی اندھا تھا۔ ملٹن بھی اندھا تھا۔ مگر یہ سبھی آسمان کے روشن ستارے ہیں۔ والمیک اور تلسی جیسے شہرۂ آفاق شعراء دُنیا سے الگ گنیوں میں بسنے والے لوگ تھے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کی گوشہ نشینی سے اُن کے کلام میں نقص آ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ میرے خیالات کیسے ہوں گے۔ مگر اُس وقت دولت پرستی سے بیزار ہو رہا ہوں۔

کنور۔ تم تو اتنے بیزار کبھی نہ تھے۔ آخر بات کیا ہے؟

پربھوسیوک نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ اب تک عملی زندگی کے رموز سے واقف نہ تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ واقعی حالت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔ تجارت کچھ نہیں ہے۔ اگر مردم آزاری نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک انسانوں کو جانور سمجھنا اور اُن سے اُسی طریقہ پر برتاؤ کرنا اس کا اصل اصول ہے۔ جو یہ نہیں کر سکتا وہ کامیاب تاجر نہیں ہو سکتا۔ کارخانہ ابھی بن کر تیار نہیں ہوا اور توسیع اراضی کی ضرورت پیدا ہو گئی۔ مستری اور کاریگروں کے رہنے کے لیے بستی میں رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ مزدوروں کی تعداد بڑھے گی تو وہاں گذر بھی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے پاپا کی رائے ہے کہ اُسی قانونی دفعہ کے مطابق پانڈے پور پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔ راجہ مہیندر کمار کی پاپا سے دوستی ہے۔ اور موجودہ حاکم ضلع مسٹر سیناپت رئیسوں سے اتنا ہی ربط ضبط رکھتے ہیں۔ جتنا مسٹر کلارک اُن سے دور رہتے تھے۔ پاپا کی تجویز بلا کسی دقت کے منظور ہو جائے گی اور محلہ والے جبراً نکال دئے جائیں گے۔ مجھ سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ میں اسے روک نہیں سکتا مگر اتنا تو کر سکتا ہوں کہ اُس سے بالکل الگ رہوں۔

کنور۔ تمہارے خیال میں کمپنی کو نفع ہوگا؟

پربھوسیوک۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ہی سال ۲۵ فیصدی نفع ہوگا۔

کنور۔ تو کیا تم نے کارخانہ سے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا؟

پربھوسیوک۔ ہاں پورا فیصلہ کرلیا۔

کنور۔ تمہارے پاپا کام سنبھال سکیں گے؟

پربھوسیوک۔ پاپا تو اس قسم کے نصف درجن کارخانوں کو سنبھال سکتے ہیں۔ [illegible] عجیب قابلیت ہے۔ زمین کی تجویز بہت جلد انتظامیہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوگی [illegible] آپ سے یہ خاص التجا ہے کہ آپ اُسے منظور نہ ہونے دیں۔

کنور۔ (مسکرا کر) بڈھا آدمی اتنی آسانی سے نئی تعلیم نہیں حاصل کرسکتا۔ بوڑھا طوطا رام رام کہنا نہیں سیکھتا۔ مجھے تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔ کہ بستی والوں کو معاوضہ دے کر زمین لے لی جاوے۔ ہاں معاوضہ مناسب ہونا چاہیئے۔ جب تم کارخانہ سے الگ ہی ہو رہے ہو تو تمہیں ان جھگڑوں سے کیا واسطہ؟ یہ تو دنیا کے دھندے ہیں۔ ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

پربھوسیوک۔ تو آپ اس تجویز کی مخالفت نہ کریں گے؟

کنور۔ میں کسی ایسی تجویز کی مخالفت نہ کروں گا جس سے کارخانہ کا نقصان ہو۔ کارخانہ سے میری غرض کا تعلق ہے۔ میں اس کی ترقی میں روکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ ہاں تمہارا وہاں سے نکل آنا میری سیوا سمتی کے لئے مبارک فال ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ سمتی کے منیجر ڈاکٹر گنگولی ہیں مگر کچھ تو سن رسیدہ ہونے کے سبب اور کچھ کونسل کے کاموں میں زیادہ مصروف رہنے کے باعث وہ اس بار سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ تم اس بار کو اپنے کندھوں پر لو۔ سمتی کی کشتی اس وقت منجدھار میں ہے۔ ونے کی روش نے اُسے اس خوفناک حالت میں ڈال دیا ہے۔ تمہیں ایشور نے علم عقل حوصلہ سب کچھ دیا ہے۔ تم چاہو تو سمتی کو بچا سکتے ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کرو گے۔

پربھوسیوک کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ وہ اپنے کو اس عزّت کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ بولے۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے قابل نہیں ہوں مجھے خوف ہے کہ مجھ جیسا ناتجربہ کار اور سست آدمی سمتی کو ترقی نہیں دے سکتا۔ یہ آپ کی نوازش ہے کہ مجھے اس قابل خیال کرتے ہیں میرے لئے تو صف ہی کافی ہے۔

کنور صاحب نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ تم جیسے آدمیوں کو صف میں رکھوں تو افسر کہاں سے لاؤں؟ مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں ڈاکٹر گنگولی کے ساتھ رہ کر تم اس کام میں ہوشیار ہو جاؤ گے۔ شریف لوگ ہمیشہ اپنی قابلیت کی بیقدری کرتے ہیں۔ پر میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں۔ تم میں عجیب برقی قوت ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ جتنی تم سمجھتے ہو۔ عربی گھوڑا ہل میں نہیں چل سکتا۔ اس کے لئے تو میدان ہی چاہیئے۔ تمہاری آزاد روح کارخانہ میں تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ دنیا کے وسیع میدان میں نکل کر اُس کے پر لگ جائیں گے۔ میں نے ونے کو اس عہدہ کے لئے منتخب کر رکھا تھا۔ مگر اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر مجھے اب اس پر اعتماد نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جماعت کو ایسی عمدہ حالت میں چھوڑ جاؤں کہ وہ بلا کسی روک ٹوک کے اپنا کام کرتی رہے۔ ایسا نہ ہوا تو میں اطمینان سے مر بھی نہ سکوں گا۔ تمہارے اوپر مجھے بھروسہ ہے کیونکہ تم بیغرض ہو۔ پربھوسیوک۔ میں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا استعمال کیا ہے۔ اب پیچھے پھر کر اس پر نظر ڈالتا ہوں تو کوئی جزو ایسا نہیں دکھائی دیتا جس پر میں فخر کر سکوں۔ ایک ریگستان ہے۔ جہاں سبزی کا نشان نہیں۔ اس جماعت پر میری زندگی بھر کی بداعمالیوں کا بار لدا ہوا ہے۔ یہی میرے کفارہ کا ذریعہ اور میری نجات کا وسیلہ ہے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میرا یہ سمتی گروہ دُنیا میں کچھ کر دکھائے۔ اُس میں خدمت کا جوش، قربانی کی لگن ہو۔ قومی عزت کا گھمنڈ ہو۔ جب میں ایسے لوگوں کو مُلک پر قربان ہوتے دیکھتا ہوں جن کے پاس جان کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو مجھے اپنے اوپر رونا آتا ہے کہ میں نے سب کچھ رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کیا۔ میرے لئے اس سے زیادہ مہلک

اور کوئی صورت نہیں ہے کہ یہ جماعت اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ میں اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے دس لاکھ روپے اس کھاتے میں جمع کر رکھے ہیں اور ارادہ ہے کہ اس پر ایک لاکھ سالانہ کا اضافہ کرتا رہوں۔ کم از کم پانچ سو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر میں دس سال بھی اور زندہ رہا تو شاید میری یہ مراد پوری ہو جاوے۔ اندر دت میں اور سب اوصاف تو ہیں مگر وہ متحمل مزاج نہیں ہے۔ اس وجہ سے میرا دل اس پر نہیں جمتا۔ میں تم سے باصرار۔ ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر گنگولی آپہنچے اور پربھوسیوک کو دیکھ کر بولے۔ اچھا تم یہاں کنور صاحب کو منتر دے رہا ہے۔ تمہارا پاپا مہیندر کمار کو پٹی پڑھا رہا ہے۔ پر میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ ایسا بات نہیں ہو سکتا۔ تمہارا سیل ہے۔ اس کا پھائدہ نکسان تم کو اور تمہارے حصہ داروں کو ہو گا۔ گریبوں کو کیوں اُن کے گھر سے نکالتا ہے۔ پر میری کوئی نہیں سنتا۔ ہم کڑوا بات کہتا ہے نا۔ وہ کاہے کو اچھا لگے گا۔ ہم کونسل میں اس پر سوال کرے گا۔ یہ کوئی بات نہیں ہے کہ آپ لوگ اپنے پھائدہ کے لئے دوسروں پر اتیاچار کرے۔ سہر کا رئیس لوگ ہم سے ناراج ہو جائے گا۔ ہم کو پرواہ نہیں ہے۔ ہم تو وہاں وہی کرے گا جو ہمارا آتما کہے گا۔ تم کو دوسرے کسیم کا آدمی چاہئے تو پاپا ہم سے استیپھا (استعفا) لے لو۔ پر ہم پانڈے پور کو اُجڑنے نہ دے گا۔

کنور۔ یہ بیچارے تو خود ہی اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں۔ آج اسی بات پر باپ بیٹے میں بدمزگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ گھر سے چلے آئے ہیں اور کارخانہ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔

گنگولی۔ اچھا ایسا بات ہے۔ بہت اچھا ہوا۔ ایسا بچار وان اور عقلمند لوگ میل کا کام نہیں کر سکتا۔ ایسا لوگ میل میں جائے گا تو ہم لوگ کہاں سے آدمی لائے گا؟ پربھوسیوک۔ ہم بوڑھا ہو گیا۔ کل مر جائے گا۔ تم ہمارا کام کیوں نہیں سنبھالتا؟ ہمارا الکشیر لوگ تمہارا رسپکٹ کرتا ہے۔ تم ہمیں اس بوجھ سے ہلکا کر سکتا ہے۔ بڈھا آدمی اور سب کچھ کر سکتا ہے۔ جوش تو اس کے بس کا بات نہیں۔ ہم تم کو

اب نہ چھوڑے گا۔ کونسل میں اتنا کام ہے کہ ہم کو اس کام کے لئے فرصت ہی نہیں ملتا۔ ہم کاونسل میں نہ گیا ہوتا تو اودے پور میں یہ سب کچھ نہیں ہونے پاتا۔ ہم جاکر سب کو شانت کر دیتا۔ تم اتنا ودیا پڑھا کر اس کو دھن کمانے میں لگائے گا۔ چھی چھی!

پربھو سیوک۔ میں تو خادموں میں بھرتی ہونے کے لئے گھر سے چلا ہی آیا ہوں پر میں سمتی کا افسر بننے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ عہدہ تو آپ ہی کے لئے موزوں ہے۔ مجھے سپاہیوں ہی میں رہنے دیجئے۔ میں اسی کو اپنے لئے عزت کی بات سمجھوں گا۔

گنگولی۔ (ہنس کر) ہا ہا کام تو نا قابل لوگ ہی کرتا ہے۔ قابل آدمی نہیں کرتا۔ وہ بس باتیں کرتا ہے۔ قابل آدمی کا مطلب ہے۔ باتونی آدمی کھالی بات بات۔ جو جتنا ہی بات کرتا ہے اتنا ہی قابل ہوتا ہے۔ وہ کام کا ڈھنگ بتا دے گا۔ کہاں کون بھول ہو گیا۔ یہ بتا دے گا پر کام نہیں کر سکتا۔ ہم ایسا قابل آدمی نہیں چاہتا۔ ہمارے یہاں باتیں کرنے کا کام نہیں ہے۔ ہم تو ایسا آدمی چاہتا ہے۔ جو موٹا کھائے۔ موٹا پہنے۔ گلی گلی اور نگر دوڑے۔ گریبوں کا اپکار کرے۔ مصیبت میں اُن کا مدد کرے۔ تو کب سے آئے گا؟

پربھو سیوک۔ میں تو ابھی سے حاضر ہوں۔

گنگولی۔ (مسکرا کر) تو پہلا لڑائی تم کو اپنے پاپا سے لڑنا پڑے گا۔

پربھو سیوک۔ میرا خیال ہے کہ پاپا خود ہی اس بات کو ترک کر دیں گے۔

گنگولی۔ نہیں نہیں وہ کبھی ایسا بات نہیں چھوڑے گا۔ ہم کو اس سے لڑائی کرنا پڑے گا۔ تم کو اس سے لڑنا پڑے گا۔ ہمارا سمتی دھن کو سب سے اوپر مانتا ہے۔ دنیا نے ہم کو ماں باپ سے دھن دولت سے۔ نام اور جس سے ایک نام کا ہے۔ سب سے بڑھ کر پایا ہے۔ ہم اور سب کچھ چھوڑ دے گا پر تیلئے کو نہ چھوڑے گا۔ یہی ہمارا برت (عہد) ہے۔ تم کو کھوب سوچ بچار کر تب

یہاں آنا ہوگا۔

پربھو سیوک۔ میں نے خوب سوچ بچار لیا ہے۔

گنگولی۔ نہیں نہیں۔ جلدی نہیں ہے۔ خوب سوچ بچار لو۔ یہ تو اچھا نہیں ہوگا کہ ایک بار آکر تم پھر بھاگ جائے۔

پربھو سیوک۔ اب موت ہی مجھے اس جماعت سے جدا کر سکتی ہے۔

گنگولی۔ مسٹر جان سیوک تم سے کہے گا۔ ہم نیائے انیائے کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ تم ہمارا بیٹا ہے۔ ہمارا حکم ماننا تمہارا دھرم ہے تو تم کیا جواب دے گا؟ (ہنس کر) میرا باپ ایسا کہتا تو میں تو اس سے کبھی نہ کہہ سکتا۔ کہ ہم تمہارا بات نہ ملنے گا۔ وہ ہم سے بولا تم بیرسٹر ہو جائے۔ ہم انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں سے بیرسٹر ہو کر آگیا۔ کئی سال تک کچہری جا کر پیپر (کاغذ) پڑھا کرتا تھا۔ جب فادر (باپ) کو ڈیتھ (وفات) ہو گیا تو ڈاکٹری پڑھنے لگا۔ باپ کے سامنے ہم کو یہ کہنے کا ہمت نہیں ہوا کہ ہم قانون نہیں پڑھے گا۔

پربھو سیوک۔ باپ کی عزت کرنا دوسری بات ہے اور اصول پر کاربند ہونا دوسری بات۔ اگر آپ کے فادر کہتے کہ جاکر کسی کے گھر میں آگ لگا دو۔ تو آپ آگ لگا دیتے؟

گنگولی۔ نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہم کبھی آگ نہ لگاتا۔ چاہے ہمارا باپ ہمیں کو کیوں نہ جلا دیتا۔ لیکن باپ ایسا حکم دے بھی تو نہیں سکتا۔

دفعتاً رانی جاہنوی وارد ہوئیں۔ غم اور غصہ کی تصویر۔ بھویں تنی ہوئیں ماتھے پر شکن۔ گویا نہا کر پوجا کرنے کے لئے جاتے وقت کتے نے چھو لیا ہو۔ گنگولی کو دیکھ کر بولیں ـــ آپ کی طبیعت کونسل سے نہیں تھکتی۔ میں تو زندگی سے تنگ آگئی۔ جو چاہتی ہوں وہ نہیں ہوتا۔ جو نہیں چاہتی وہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! سب کچھ سہا جاتا ہے پر بیٹے کا برا برتاؤ نہیں سہا جاتا۔ خاص کر ایسے بیٹے کا جس کے بنانے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی گئی ہو۔ نالائق جسونت نگر کے ہنگامہ

میں مر گیا ہوتا تو مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔

کنور صاحب اور زیادہ نہ سُن سکے۔ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ رانی صاحبہ نے پھر کہا یہ میرا دُکھ کیا سمجھیں گے۔ ان کی ساری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی ہے۔ نفس پرستی کے سامنے انہوں نے کبھی معیار کی پرواہ نہیں کی۔ دیگر پرُوسا کی طرح تن پروری میں مشغول رہے۔ میں نے تو دینے کے لئے سخت ریاضت کی ہے۔ اُسے ہاتھ لے کر مہینوں پہاڑوں میں پیدل چلی ہوں۔ صرف اس لئے کہ بچپن ہی سے اُسے مشکلات کا عادی بنا دوں۔ اُس کی ایک ایک بات، اُس کے ایک ایک کام کو غور سے دیکھتی رہی ہوں کہ اُس میں برائیاں نہ آ جائیں۔ اگر وہ کبھی نوکر پر بگڑا ہے تو اُسے فوراً سمجھایا ہے۔ کبھی سچائی سے منہ موڑتے دیکھا ہے تو فوراً تنبیہ کی ہے۔ یہ میرے درد دُکھ کا حال کیا جانیں گے!

یہ کہتے کہتے رانی صاحبہ کی نگاہ پربھو سیوک پر پڑ گئی جو گوشہ میں کھڑا کتابیں اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ ان کی زبان بند ہو گئی۔ آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔ صوفیہ کے متعلق جو سخت باتیں دل میں تھیں۔ وہ دل ہی میں رہ گئیں۔ صرف گنگولی سے اتنا کہا کہ جاتے وقت مجھ سے مل لیجئے گا اور چلی گئیں۔

(۳۵)

ونے سنگھ آبادی میں داخل ہوئے تو سویرا ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دُور چلے تھے کہ ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ انہیں دیکھ کر بولی۔ بیٹا! غریب ہوں۔ بن پڑے تو کچھ دے دو۔ دھرم ہوگا۔

نایک رام۔ سویرے سویرے رام نام نہیں لیتی۔ بھیک مانگنے چل کھڑی ہوئی ہے۔ تجھے تو جیسے رات کو نیند ہی نہیں آئی۔ مانگنے کو تو دن بھر ہے۔

بڑھیا۔ بیٹا دُکھیا ہوں۔

نایک رام۔ یہاں سُکھیا کون ہے؟ رات بھر پہروں مرے بھوک

کی گھڑکیاں کھائیں۔ پیر تو سیدھے پڑتے نہیں۔ جنہیں پیسے کہاں سے دے دیں؟
بڑھیا۔ بیٹا دھوپ میں مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ سر میں چکر آجاتا ہے۔ تمہی
نئی بپتا ہے بھیا۔ بھگوان اُس ادھم پاپی ونے سنگھ کا بُرا کرے۔ اُسی کے کارن
بڑھاپے میں یہ دن دیکھنا پڑا۔ نہیں تو بیٹا دوکان کرتا تھا۔ گھر میں رانی بنی بیٹھی
رہتی تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ کون سا سکھ نہیں تھا؟ تم پردیسی ہو۔ نہ جانتے ہو گے۔
یہاں دنگا ہو گیا تھا۔ میرا لڑکا دوکان سے ہلا تک نہیں پر اُس نگوڑے ونے سنگھ نے
گواہی دے دی کہ یہ بھی دنگے میں ملا ہوا تھا۔ پولیس ہمارے اوپر بہت دنوں سے
دانت لگائے تھی۔ کوئی داؤں نہ پاتی تھی۔ یہ گواہی پاتے ہی دوڑ آگئی۔ لڑکا پکڑ
لیا گیا! اُسے تین سال کی سجا ہو گئی۔ ایک ہجار جریمانہ ہُوا۔ گھر کی بیس ہزار
کی گرہستی نہس نہس ہو گئی۔ گھر میں بہو ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اسی طرح
مانگ جانچ کر انہیں پالتی پوستی ہوں۔ نہ جانے اُس کل مُنہے نے کب کا بیر نکالا۔
ونے نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر بڑھیا کو دیا اور آسمان کی طرف دیکھ
کر ٹھنڈی سانس لی۔ ایسی روحانی تکلیف انہیں کبھی نہ ہوئی تھی۔
بڑھیا نے روپیہ دیکھا تو چونک پڑی۔ سمجھی۔ شاید بھول سے دے دیا ہے۔
بولی — بیٹا یہ تو روپیہ ہے۔
ونے سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاں لے جاؤ۔ میں نے بھول سے
نہیں دیا ہے۔
بڑھیا دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ دونوں آدمی اور آگے بڑھے تو راستہ میں ایک
کنواں ملا۔ اس پر ایک پیپل کا درخت تھا۔ ایک چھوٹا سا مندر بھی بنا ہُوا تھا۔
نایک رام نے سوچا۔ یہیں ہاتھ منہ دھو لیں۔ دونوں آدمی کنوئیں پر گئے تو دیکھا کہ
ایک پنڈت جی پیپل کے نیچے بیٹھے پاٹھ کر رہے ہیں۔ جب وہ پاٹھ کر چکے تو ونے نے
پوچھا۔ آپ کو معلوم ہے۔ سردار نیلکنٹھ آج کل کہاں ہیں؟
پنڈت جی نے سخت لہجہ میں کہا۔ ہم نہیں جانتے۔

دنے۔ پولیس کے انسپکٹر تو ہوں گے؟

پنڈت۔ کہہ دیا۔ میں نہیں جانتا۔

دنے۔ مسٹر کلارک تو دورہ پر ہوں گے؟

پنڈت۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

نایک رام۔ پوجا پاٹ میں دیس دنیا کی سُدھ ہی نہیں۔

پنڈت۔ ہاں۔ جب تک منو کامنا (دلی خواہش) نہ پوری ہو جائے۔ تب تک مجھے کسی سے کچھ سروکار نہیں۔ سبیرے سبیرے تم نے ملیچھوں کا نام سُنا دیا۔ نہ جانے دن کیسے کٹے گا؟

نایک رام۔ وہ کون سی منو کامنا ہے؟

پنڈت۔ اپنے اپمان (توہین) کا بدلہ۔

نایک رام۔ کس سے؟

پنڈت۔ اُس کا نام نہ لوں گا۔ کسی بڑے رئیس کا لڑکا ہے۔ کاسی سے گریبوں کی سہایتا (مدد) کرنے آیا تھا۔ سینکڑوں گھر اُجاڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اُسی کے لئے یہ انُشٹھان (پوجا) کر رہا ہوں۔ یہاں آدھا سہر میرا ججمان تھا۔ سیٹھ ساہوکار میرا آدر (عزت) کرتے تھے۔ لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ ہاں بُرائی یہی تھی کہ نا جم کو سلام کرنے نہ جاتا تھا۔ عملوں کی کوئی بُرائی دیکھتا تو اُن کے مُنہ پر کہہ دیتا۔ اِسی سے سب کے سب مجھ سے جلتے تھے۔ پچھلے دنوں جب یہاں دنگا ہوا۔ تو سبھوں نے اُسی بنارس کے گنڈے سے مجھ پر بغاوت کا اپرادھ لگوا دیا۔ سجا ہو گئی۔ بپت پڑ گئے۔ جرمانہ ہو گیا۔ آبرو مٹی میں مل گئی۔ اب نگریں کوئی دروازے پر کھڑا نہیں ہونے دیتا۔ نراس ہو کر دیوی کی شرن آیا ہوں۔ پورشچرن کا پاٹ کر رہا ہوں۔ جس دن سنوں گا کہ اس ہتیارے پر دیوی نے کوپ کیا۔ اسی دن میری تپسیا پوری ہو جائے گی۔ براہمن ہوں۔ لڑنا جھگڑنا نہیں جانتا۔ میرے پاس اس کے سوا اور کون سا ہتھیار ہے؟

وتے کبھی شراب خانے سے نکلتے ہوئے پکڑے جاتے تو بھی اتنے شرمندہ نہ ہوتے۔
انہیں اب اس براہمن کی صورت یاد آئی۔ یاد آیا کہ میں نے ہی پولیس کی ترغیب
سے اسے پکڑوا دیا تھا۔ جیب سے پانچ روپے نکالے اور پنڈت جی سے بولے۔
یہ لیجئے میری طرف سے بھی اس بدمعاش کے لئے پرشچیرن کا جاپ کرو دیجئے اس
نے مجھے بھی تباہ کر دیا ہے۔ میں بھی اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوں۔
پنڈت۔ مہاراج آپ کا بھلا ہوگا۔ بیری کے ویہہ (جسم) میں کیڑے نہ
پڑ جائیں تو کہئے گا کہ کوئی کہتا تھا۔ کتوں کی موت مرے گا۔ یہاں سارا نگر اس کا
دشمن ہے۔ اب تک اس لئے اس کی جان بچی کہ پولیس اس کو گھیرے رہتی ہے۔
مگر کب تک؟ جس دن اکیلا گھر سے نکلا۔ اسی دن دیوی کا اس پر کوپ (قہر)
گرا۔ ہے وہ اسی راج میں۔ کہیں باہر نہیں گیا ہے اور نہ اب بچ کر جا ہی سکتا ہے۔
کال اس کے سر پر کھیل رہا ہے۔ اتنے دکھیوں کی ہائے کیا اکارتھ جائے گی؟
جب یہاں سے اور آگے چلے تو وتے نے کہا۔ پنڈا جی۔ اب جلد ایک موٹر
طے کر لو۔ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ اپنی جان کا اتنا خوف مجھے
کبھی نہ ہوا تھا۔ اگر ایسے ہی دو ایک نظارے اور سامنے آئے تو شاید میں خودکشی
کر لوں۔ آہ میں کتنا گر گیا ہوں۔ اور اب تک میں یہی سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے کوئی
غلطی نہیں ہوئی۔ میں نے خدمت کا عہد کیا تھا۔ گھر سے دوسروں کی بھلائی کرنے
چلا تھا۔ خوب بھلائی کی۔ شاید یہ لوگ مجھے تمام عمر نہ بھولیں گے۔
نایک رام۔ بھیا۔ بھول چوک آدمی ہی سے تو ہوتی ہے۔ اب اس کا
پچھتاوا نہ کرو۔

وتے۔ نایک رام۔ یہ بھول چوک نہیں۔ ایشور کا قانون ہے۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ ایشور پاک عہد کرنے والوں کا سخت امتحان لیا کرتے ہیں۔ خادم قوم کا درجہ
ان امتحانات میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں ملتا۔ میں امتحان میں فیل ہو گیا۔
بڑی طرح فیل ہو گیا!

نایک رام نے سوچا تھا کہ ڈراجیں کے داروغہ صاحب سے فیروز مانیت کا حال دریافت کرتے چلیں۔ لیکن موقع نہ دیکھا تو فوراً موٹر سرد من کے دفتر میں گئے وہاں معلوم ہوا کہ دربار نے سب موشوں کو ایک ہفتہ کے لئے روک لیا ہے۔
مسٹر کلارک نے کئی ٹورنمنٹ باہر سے شکار کھیلنے کو آئے ہوئے تھے۔ اب کیا ہو؟ نایک رام کو گھوڑے پر سوار ہونا نہ آتا تھا اور ونے کو یہ مناسب نہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ تو سوار ہو کر چلے اور وہ پیدل۔
نایک رام ۔ بھیا۔ تم سوار ہو جاؤ۔ میری کون؟ ابھی موقع پڑ جائے۔ تو دس کوس چل سکتا ہوں۔
ونے ۔ تو میں ایسا کون مرا جاتا ہوں۔ اب رات کی تھکاوٹ دور ہو گئی۔
دونوں آدمیوں نے کچھ ناشتہ کیا اور ادودے پور کو روانہ ہوئے۔ آج ونے نے جتنی باتیں کیں۔ اتنی شاید اور کبھی نہ کی تھیں۔ اور وہ بھی نایک رام جیسے لٹھ گنوار سے۔ صوفیا کی کڑی باتیں اب اُنہیں بالکل واجبی معلوم ہوتی تھیں۔
بولے ۔ پنڈا جی۔ سمجھ لو۔ کہ اگر دربار نے ان سب قیدیوں کو چھوڑ نہ دیا۔ تو میری شہادت سے سزایاب ہوئے ہیں۔ تو میں اپنا منہ کسی کو نہ دکھلاؤں گا۔ میرے لئے یہی ایک اُمید باقی رہ گئی ہے۔ تم گھر جا کر ماتا جی سے کہہ دینا کہ وہ اپنی غلطی پر کتنا ملول کتنا نادم تھا۔
نایک رام ۔ بھیا۔ تم گھر نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤں گا۔ اب تو جہاں تم ہو وہیں میں بھی ہوں۔ جو کچھ بیتے گی دونوں ہی پر بیتے گی۔
ونے ۔ بس تمہاری یہی بات بُری معلوم ہوتی ہے۔ تمہارا اور میرا کونسا ساتھ ہے؟ میں پاپی ہوں۔ مجھے اپنے پاپوں کا پراشچت کرنا ہے۔ تمہارے ماتھے پر کوئی کلنک نہیں ہے۔ تم اپنی زندگی کیوں برباد کرو گے؟ میں نے اب تک صوفیا کو نہیں پہچانا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ وہ کتنی فراخ دل ہے۔ مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہاں شکایت صرف اس بات کی ہے کہ اس نے مجھے اپنا نہ سمجھا۔ وہ

اگر سمجھتی کہ یہ میرے ہیں تو پوری ایک ایک بات کیوں پکڑتی۔ خود غلوں کی باتوں پر کیوں جاسوسوں کی طرح کڑی نگاہ ڈالتی۔ وہ یہ جانتی ہے کہ انہیں ٹھکرا دے گی تو یہ جان پر کھیل جائیں گے۔ یہ جانتے ہوئے بھی اس نے ایسے ساتھ اتنی بیدردی کیوں کی؟ وہ یہ کیوں بھول گئی کہ انسان سے خطائیں ہوتی ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اپنا سمجھ کر ہی اس نے مجھے یہ سخت سزا دی ہو۔ دوسروں کی برائیوں کی ہمیں پرواہ نہیں ہوتی۔ اپنوں ہی کو بُری راہ چلتے دیکھ کر سزا دی جاتی ہے۔ مگر بیگانوں کو سزا دیتے وقت اس کا تو خیال رکھنا چاہئے کہ یگانگت کا رشتہ نہ ٹوٹنے پائے۔ یہ سوچ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دل مجھ سے ہمیشہ کے لئے پھر گیا۔

نایک رام۔ عیسائن ہے نا؟ کسی انگریز کو گانٹھے گی!

ونے۔ تم بالکل بیہودہ ہو۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ وہ اب عمر بھر کنواری رہے گی۔ تم اُسے کیا جانو؟ بات سمجھو نہ بوجھو۔ جھٹ کہہ اٹھے کہ کسی انگریز کو گانٹھے گی۔ میں اُسے کچھ کچھ جانتا ہوں۔ میرے لئے اُس نے کیا کیا نہیں کیا۔ کیا کیا نہیں سہا؟ جب اُس کی محبت یاد آتی ہے تو دل وجگر میں ایسا درد ہوتا ہے کہ کہیں پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دینے کو جی چاہتا ہے۔ اب وہ ناقابلِ فتح ہے۔ اُس نے اپنی محبت کا دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اُس جنم میں نہ جانے کون سی تپسیا کی تھی۔ جس کا اچھا پھل اتنے دنوں تک میں نے بھوگا۔ اب کوئی دیوتا بن کر بھی اُس کے سامنے آئے تو وہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ جنم سے عیسائن بھلے ہی ہو مگر عادات و اطوار سے وہ آریہ استری ہے۔ میں نے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔ آپ بھی ڈوبا۔ اُسے بھی لے ڈوبا۔ اب تم دیکھنا کہ ریاست کو کیسا وہ ناکوں چنے چبواتی ہے۔ اس کی زبان میں وہ طاقت ہے کہ آن کی آن میں ریاست کا نام و نشان مٹا سکتی ہے۔

نایک رام۔ ہاں ہے تو ایسی ہی آفت کی پرکالہ۔

ونے۔ پھر وہی حماقت! بھیا تم سے کتنی ہی بار کہہ چکا کہ میرے سامنے

اُس کا نام عزت سے لیا کرو۔ میں اُس کے متعلق کسی کی زبان سے ایک بھی نامناسب لفظ نہیں سُن سکتا۔ وہ اگر مجھے برچھیوں سے چھیدے تو اُس کے لئے میرے دل میں نفرت کا خیال نہ پیدا ہوگا۔ محبت میں انتقام نہیں ہوتا۔ محبت تو بیحد عفو۔ بیحد فیاضی۔ بیحد تحمل سے معمور ہوتی ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں نے دوپہر تک نصف منزل طے کی۔ دوپہر کو آرام کرنے لگے تو ایسے سوئے کہ شام ہوگئی۔ رات کو وہیں ٹھہرنا پڑا۔ سرائے موجود تھی۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ ہاں نایک رام کو آج زندگی میں پہلی دفعہ بھنگ نہ ملی۔ اور وہ بہت بے چین رہے۔ ایک تولہ بھنگ کے لئے ایک سے دس روپے تک دینے کو تیار تھے۔ مگر آج نصیبوں میں فاقہ ہی لکھا تھا۔ ہر طرح مجبور ہو کر وہ سر پکڑے ہوئے کوئیں کی جگت پر آ بیٹھے۔ گویا گھر سے کسی آدمی کو کریا کرم کرکے آئے ہوں۔

ونے نے کہا ایسی عادت کیوں ڈالتے ہو کہ بھنگ کے بغیر ایک روز بھی رہنا مشکل ہو؟ چھوڑ دو ایسے بھلے آدمی۔ مُفت جان دیتے ہو۔

نایک رام۔ بھیا۔ اس جنم میں تو چھوٹتی نہیں۔ آگے کی رام جانے۔ یہاں تو مرتے وقت بھی ایک تولا سرہانے رکھ لیں گے۔ وصیت کر جائیں گے کہ ایک سیر بھنگ ہماری چتا میں ڈال دینا۔ کوئی پانی دینے والا تو ہے نہیں۔ پر جو کبھی بھگوان نے وہ دن دکھایا تو لڑکوں سے کہہ جاؤں گا کہ پنڈے کے ساتھ بھنگ کا پنڈا بھی ضرور دینا۔ اس کا مزا وہی جانتا ہے جو اسے پیتا ہے۔

نایک رام کو آج کھانا اچھا نہ معلوم ہوا۔ نیند نہ آئی۔ بدن ٹوٹتا رہا۔ غصہ میں سرائے والے کو خوب گالیاں دیں۔ مارنے دوڑے۔ بنئے کو ڈانٹا کہ صاف شکر کیوں نہیں دی۔ حلوائی سے اُلجھ پڑے کہ مٹھائیاں کیوں خراب دیں؟ دیکھو تو تیری کیا گت بناتا ہوں۔ نکل کر سیدھے سردار صاحب سے کہتا ہوں۔ بچا۔ دوکان نہ لٹوا لوں تو کہنا۔ جانتے ہو میرا نام ہے نایک رام! یہاں تیل کی بُو سے گھن ہے۔ حلوائی پیروں پڑنے لگا پر اُنہوں نے ایک نہ سُنی۔ یہاں تک کہ دھمکا کر اُس سے پچیس روپے

اینٹھ لیئے۔ لیکن چلتے وقت ونے نے روپے واپس کرا دئے۔ ہاں حلوائی کو تاکید کر دی کہ ایسی خراب مٹھائیاں نہ بنایا کرے۔ اور تیل کی چیز کے گھی سے دام نہ لیا کرے۔

دوسرے روز دونوں آدمی دس بجتے بجتے ادوے پور پہنچ گئے۔ پہلا آدمی جو انہیں نظر پڑا وہ خود سردار صاحب تھے۔ وہ ٹمٹم پر بیٹھے ہوئے دربار سے آ رہے تھے۔ ونے کو دیکھتے ہی گھوڑا روک دیا اور پوچھا آپ کہاں؟

ونے نے کہا۔ یہیں تو آ رہا تھا۔

سردار۔ کوئی موٹر نہ ملا؟ ہاں نہ ملا ہوگا۔ تو ٹیلی فون کیوں نہ کر دیا؟ یہاں سے سواری بھیج دی جاتی۔ فضول ہی اتنی تکلیف اُٹھائی۔

ونے۔ مجھے پاپیادہ چلنے کا محاورہ ہے۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ میں آج آپ سے ملنا چاہتا ہوں اور تنہائی میں۔ آپ کب مل سکیں گے؟

سردار۔ آپ کے لیئے وقت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب جی چاہے چلے آئیے گا بلکہ وہیں ٹھہریئے گا بھی۔

ونے۔ اچھی بات ہے۔

سردار صاحب نے گھوڑے کو چابک لگائی اور روانہ ہوگئے۔ یہ نہ ہو سکا کہ ونے کو بھی بٹھا لیتے کیونکہ اُن کے ساتھ نایک رام کو بھی بٹھانا پڑتا۔ ونے سنگھ نے ایک تانگا لیا اور تھوڑی دیر میں سردار صاحب کے مکان پر جا پہنچے۔

سردار صاحب نے دریافت کیا۔ اِدھر کئی روز سے آپ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ آپ کے ساتھ کے اور لوگ کہاں ہیں؟ کچھ مسز کلارک کا پتہ چلا؟

ونے۔ ساتھ کے آدمی تو پیچھے ہیں۔ لیکن مسز کلارک کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ساری محنت رائیگاں ہوئی۔ ہیر پال سنگھ کا تو میں نے پتہ لگا لیا بلکہ اُس کا گھر بھی دیکھ آیا۔ پر مسز کلارک کا سُراغ نہیں ملا۔

سردار صاحب نے تعجب سے کہا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو جو اطلاع ملی ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے مسز کلارک کی ملاقات ہوئی

اور اب مجھے آپ سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ دیکھئے یہ وہ خط آپ کو دکھلاتا ہوں۔
یہ کہہ کر سردار صاحب میز کے پاس گئے اور ایک موٹے بادامی کاغذ پر لکھا ہوا
خط اُٹھا لائے۔ لاکر ونے کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ونے نے دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ اُن کے چہرہ
کا رنگ فق ہو گیا۔ اپنی بات کس طرح بنائیں۔ یہ سمجھ میں نہ آیا۔ نایک رام بھی
فرش پر بیٹھے تھے سمجھ گئے کہ یہ پریشان ہیں۔ وہ خود جھوٹ بولنے اور باتیں بنانے
میں کافی مشاق تھا۔ بولا۔ کنور صاحب ذرا مجھے دیکھئے کس کا خط ہے؟

ونے۔ اندردت کا۔

نایک رام۔ ادہو۔ اُس پاگل کا خط ہے! وہی لونڈا نا۔ جو سیوا سمتی میں آ
کر گایا کرتا تھا؟ اُس کے ماں باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ سرکار پگلا ہے ایسی
ہی اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتا ہے۔

سردار۔ نہیں کسی پاگل لونڈے کی تحریر ایسی نہیں ہو سکتی۔ بڑا ہوشیار
اس میں کوئی شک نہیں۔ اُس کے خطوط اِدھر کئی روز سے میرے پاس برابر آ رہے
ہیں۔ کبھی مجھے دھمکاتا ہے۔ کبھی اُپدیش دیتا ہے۔ لیکن جو کچھ کہتا ہے مہذب پیرایہ
میں۔ ایک لفظ بھی اہانت آمیز نہیں ہوتا۔ اگر یہ وہی اندردت ہے جسے آپ جانتے
ہیں تو اور بھی تعجب ہے۔ ممکن ہے اُس کے نام سے کوئی دوسرا ہی آدمی خط لکھتا
ہو۔ یہ کوئی معمولی تعلیمیافتہ شخص نہیں معلوم ہوتا۔

ونے سنگھ تو ایسے سٹ پٹائے جیسے کوئی نوکر مالک کا صندوق کھولتا ہوا
پکڑ لیا جائے۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے کہ میں نے کیوں جھوٹ کہا؟ مجھے چھپانے
کی ضرورت ہی کیا تھی؟ لیکن اندردت کا اِس خط سے کیا مقصد ہے؟ کیا مجھے
بدنام کرنا چاہتا ہے؟

نایک رام۔ کوئی دوسرا ہی آدمی ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں کے
حاکموں کو کنور صاحب سے بھڑکا دیں۔ کیوں بھیا؟ سمتی میں کوئی اچھا پڑھا

لکھا آدمی تھا؟

ونے۔ سبھی پڑھے لکھے تھے۔ اُن میں جاہل ایک بھی نہیں۔ اندمت بھی اعلےٰ درجہ کا تعلیم یافتہ شخص ہے۔ پر مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ اُس کے دل میں میری جانب سے اتنی کدورت ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے سردار صاحب کو منفعل نگاہوں سے دیکھا۔ جھوٹ کی شکل ہر لمحہ زیادہ خوفناک اور اُس کی تاریکی اور بھی زیادہ گھنی ہوتی جاتی تھی۔

ونے نے شرماتے ہوئے کہا۔ سردار صاحب معاف فرمائیے گا کہ میں آپ سے جھوٹ کہہ رہا تھا۔ اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ لفظ بلفظ صحیح ہے۔ بلاشک میری ملاقات مسز کلارک سے ہوئی۔ میں اس واقعہ کو آپ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے اُن سے اس بات کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ وہاں بہت آرام سے ہیں یہاں تک کہ میرے بیحد اصرار پر بھی وہ میرے ساتھ نہ آئیں۔

سردار صاحب نے بے پروائی سے کہا۔ سیاسی معاملات میں وعدہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اب مجھے آپ سے واقعی ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اگر اس خط سے مجھے ساری باتوں کی خبر نہ مل گئی ہوتی تو آپ نے تو مجھے مغالطہ دینے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آج کل اُس کے متعلق گورنمنٹ سے کتنی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ یوں کہیئے کہ مسز کلارک کے بخیریت واپس آجانے پر ہی ہماری جملہ کارگزاریوں کا انحصار ہے۔ خیر یہ کیا بات ہے؟ مسز کلارک آئیں کیوں نہیں؟ کیا بدمعاشوں نے انہیں آنے نہ دیا؟

ونے۔ پرپال سنگھ تو بڑی خوشی سے اُنہیں بھیجنا چاہتا تھا یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی جان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ لیکن وہ خود ہی آنے پر تیار نہ ہوئیں۔

سردار۔ مسٹر کلارک سے ناراض تو نہیں ہیں؟

ونے۔ ہو سکتا ہے۔ جس روز بغاوت ہوئی تھی۔ مسٹر کلارک نشہ میں بیہوش پڑے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ چڑھ گئی ہو۔ ٹھیک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں ان

سے ملاقات ہو جانے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہم نے جسونت نگر کے باشندوں پر تشدد کرنے میں بہت سی نامنصفانہ باتوں سے کام لیا۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ باغیوں نے مسز کلارک کو یا تو قید کر رکھا ہے یا قتل کر ڈالا ہے۔ اسی خوف کی بنا پر ہم نے جبر و تشدد سے کام لیا۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا۔ مگر وہ باتوں میں سے ایک بھی صحیح نہ نکلی۔ مسز کلارک زندہ ہیں اور خوش ہیں۔ وہ وہاں سے خود ہی نہیں آنا چاہتیں۔ جسونت نگر کے لوگ بلا وجہ ہمارے عتاب کے مورد ہوئے۔ میں آپ سے باصرار التجا کرتا ہوں کہ اُن غریبوں پر رحم ہونا چاہیئے۔ سیکڑوں بے گناہوں کا خون ہو رہا ہے۔

سردار صاحب دیدہ و دانستہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر ایسا کر چکنے پر انہیں اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انصاف کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا بے انصافی کی تلافی کرنا۔ صوفیا کے گم ہو جانے سے انہیں صرف گورنمنٹ کی کج نگاہی کا خوف تھا۔ مگر صوفیا کا پتہ مل جانا تو تمام ملک کے سامنے اپنی نااہلیت اور ناانصافی کا اعلان کرنا تھا۔ مسز کلارک کو خوش کر کے گورنمنٹ کو خوش کیا جا سکتا تھا۔ مگر رعایا کا منہ اتنی آسانی سے بند نہ کیا جا سکتا تھا۔

سردار صاحب نے تامل سے کہا۔ یہ تو میں مان سکتا ہوں کہ مسز کلارک صحیح و سالم ہیں۔ لیکن آپ تو کیا اگر کوئی فرشتہ بھی آ کر کہے کہ وہ وہاں خوش ہیں۔ اور لوٹنا نہیں چاہتیں تو بھی میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ بچوں کی سی بات ہے۔ کسی کو اپنے گھر سے اتنی نفرت نہیں ہوتی کہ وہ دشمنوں کے ساتھ رہنا پسند کرے۔ باغیوں نے مسز کلارک کو یہ کہنے کے لئے مجبور کیا ہوگا۔ وہ مسز کلارک کو اُس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک ہم تمام قیدیوں کو آزاد نہ کر دیں یہ اُن کی چالاکی ہے اور میں اُسے باور نہیں کر سکتا۔ مسز کلارک کو سخت سے سخت اذیتیں دی جا رہی ہیں اور انہوں نے اذیتوں سے نجات پانے کے لئے آپ سے یہ سفارش کی ہے۔ بس اور کوئی بات نہیں ہے۔

ونے - میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتا۔ مسز کلارک کافی

خوش و خرم نظر آتی تھیں۔ دُکھتا ہُوا دل کبھی اتنا مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سردار۔ یہ آپ کی آنکھوں کا نقص ہے۔ اگر مسز کلارک خود آکر مجھ سے کہیں کہ میں مزے آرام سے ہوں تو بھی مجھے یقین نہ آئے گا۔ آپ نہیں جانتے یہ لوگ کن حکمتوں سے آزادی پر جان دینے والے لوگوں پر بھی اپنا رعب جما لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے پنجہ سے چھٹکارا پا جانے پر بھی قیدی انہیں کی سی کہتا ہے۔ اور انہیں کی سی کرتا ہے۔ میں ایک زمانہ میں پولیس کا ملازم تھا۔ آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے کتنے ہی سیاسی مقدمات میں بڑے بڑے ریاضت کشوں سے ایسے ایسے جرائم کا اقبال کرا دیا۔ جن کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بیرپال سنگھ اس معاملہ میں ہم سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے۔

تھرسٹے۔ سردار صاحب اگر ذرا دیر کے لئے مجھے یہ یقین بھی ہو جائے کہ مسز کلارک نے دباؤ میں پڑ کر مجھ سے یہ باتیں کہی ہیں تو بھی اب ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہمیں اتنی بیدردی سے تشدد نہ کرنا چاہئے تھا۔ اب ان ملزموں کے ساتھ کچھ رعایت ضروری ہونی چاہئے؟

سردار۔ سیاسی معاملات میں رعایت کرنا اپنی ہار مان لینا ہے۔ اگر میں یہ بھی مان لوں کہ مسز کلارک وہاں آرام سے ہیں اور آزاد ہیں۔ اور ہم نے جسونت نگر کے لوگوں پر واقعی بڑا ظلم کیا ہے۔ پھر بھی میں رعایت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ رعایت کرنا اپنی کمزوری اور غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں رعایت کا انجام کیا ہوگا۔ باغیوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ ان کے دلوں سے ریاست کا خوف جاتا رہے گا اور جب خوف نہ رہا تو سلطنت بھی نہیں رہ سکتی۔ خوف کو آپ نکال دیجئے اور سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ پھر ارجن کی بہادری اور بیدمشتر کا انصاف بھی اسے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ سو دو سو بیگناہوں کا جیل میں رہنا سلطنت کے نہ رہنے سے کہیں بہتر ہے۔ مگر میں ان باغیوں کو بیگناہ کیوں کر تسلیم کر لوں؟ کئی ہزار آدمیوں کا مسلح ہو کر جمع ہونا ثابت کرتا ہے۔ کہ وہاں لوگ بغاوت کرنے ہی

کے خیال سے جمع ہوئے تھے۔
ونے۔ لیکن جو لوگ اُس میں شامل نہ تھے وہ تو بے قصور ہیں؟
سردار۔ ہرگز نہیں؛ اُن کا فرض تھا کہ حکام کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیتے۔ ایک چور کسی کے گھر میں نقب زنی ہوتے دیکھ کر آپ گھر والوں کو جگانے کی کوشش نہ کریں تو وہ خود چور کی اعانت کر رہا ہے۔ اکثر حالتوں میں اغماض جرم سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔
ونے۔ کم از کم اتنا تو کیجیے کہ جو لوگ میری شہادت پر قید کیے گئے ہیں انہیں رہا کر دیجیے۔
سردار۔ ناممکن ہے۔
ونے۔ میں طرزِ حکومت کے تعلق سے نہیں بلکہ رحم اور شرافت کی بنا پر آپ سے یہ التجا کرتا ہوں۔
سردار۔ کہہ دیا بھائی جان! کہ یہ ناممکن ہے۔ آپ اُس کے انجام پر غور نہیں کر رہے ہیں۔
ونے۔ لیکن میری التجا کو منظور نہ کرنے کا انجام بھی اچھا نہ ہوگا۔ آپ مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ بنا رہے ہیں۔
سردار۔ میں کھلی ہوئی بغاوت سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتا ہوں صرف قومی خادموں سے۔ رعایا کے ہوا خواہوں سے اور اُن سے یہاں کی رعایا کا جی بھر گیا ہے۔ مدت گزر جائے گی اس کے قبل کے رعایا کو قومی خادموں کا پھر اعتبار ہو۔
ونے۔ اگر اسی نیت سے آپ نے میرے ہاتھوں رعایا کو تباہ و برباد کرایا تو آپ نے میرے ساتھ واقعی دغا کیا۔ لیکن میں آپ کو متنبہ کیے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے میرا کہنا نہ مانا تو آپ ریاست میں ایسا انقلاب برپا کر دیں گے جو ریاست کی جڑ ہلا دے گا۔ میں یہاں سے مسٹر کلارک کے پاس جاتا ہوں۔ ان سے بھی یہی التجا کروں گا اور اگر وہ بھی نہ سنیں گے تو مہارانا کی خدمت میں یہی تجویز پیش کروں گا۔ اگر انہوں نے

بھی نہ سُنا تو پھر اس ریاست کا مجھ سے بڑا اور کوئی دشمن نہ ہو گا۔
یہ کہہ کر ونے سنگھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور نایک رام کو ہمراہ لئے مسٹر کلارک کے بنگلے پر جا پہنچے۔ وہ آج ہی اپنے شکاری احباب کو رُخصت کر کے واپس آئے تھے۔ اور اس وقت آرام کر رہے تھے۔ ونے نے اردلی سے پُوچھا تو معلوم ہُوا۔ کہ صاحب کچھ کام کر رہے ہیں۔ ونے باغ میں ٹہلنے لگے۔ جب نصف گھنٹہ تک صاحب نے نہ بلایا تو اُٹھے اور سیدھے مسٹر کلارک کے کمرہ میں چلے گئے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے اور بولے۔ آئیے آئیے۔ آپ ہی کی یاد کر رہا تھا۔ کہئے کیا خبر ہے؟ صوفیا کا پتہ تو آپ لگا ہی آئے ہوں گے؟

ونے۔ جی ہاں لگا آیا۔

یہ کہہ کر ونے سنگھ نے مسٹر کلارک سے بھی وہی داستان کہی جو اُنہوں نے سردار صاحب سے کہی تھی اور اُن سے بھی وہی اصرار آمیز التجا کی۔

کلارک۔ مس صوفیا آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟

ونے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن وہاں انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔

کلارک۔ تو پھر آپ نے نئی کھوج کیا کی؟ میں نے تو سمجھا تھا کہ شاید آپ کے آنے سے اس معاملہ پر کچھ روشنی پڑے گی۔ یہ دیکھئے صوفیا کا خط ہے۔ آج ہی آیا ہے۔ اسے آپ کو دکھا تو نہیں سکتا مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اس وقت میرے سامنے آ جائے تو اُسے پستول کا نشانہ بنانے میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہ کروں گا۔ اب مجھے معلوم ہُوا کہ مذہب پرستی مکر اور دغا کا دوسرا نام ہے۔ اُس کی مذہبیت نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ شاید کبھی کسی نے اتنا بڑا دھوکا نہ کھایا ہو گا۔ میں نے سمجھا تھا کہ مذہبیت سے خلوص پیدا ہوتا ہے مگر یہ میرا وہم تھا۔ میں اس کی مذہبیت پر دیوانہ ہو گیا۔ میں انگلینڈ کی رنگیلی عورتوں کی طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔ صوفیا کی سادگی اور مذہبیت دیکھ کر میں نے سمجھا کہ مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی۔ اپنی سوسائٹی کی بیقدری کر کے میں اس کے پاس آنے جانے لگا۔ اور بالآخر شادی کے لئے کہا۔

صوفیانے منظور تو کر لیا۔ مگر کچھ دنوں تک شادی کو ملتوی رکھنا چاہا۔ میں کیا جانتا
تھا کہ اُس کے دل میں کیا ہے۔ راضی ہو گیا۔ اُسی حالت میں وہ میرے ساتھ یہاں آئی۔
بلکہ یوں کہئے کہ وہی مجھے یہاں لائی۔ دُنیا سمجھتی ہے وہ میری بیوی تھی۔ اوہ۔ ہرگز نہیں۔
ہماری تو منگنی بھی نہ ہوئی تھی۔ اب جا کر بھید کھلا کہ وہ تو بولشویکوں کی ایجنٹ ہے۔
اُس کے ایک ایک لفظ سے اُس کے فطرت کا اظہار ہوتا ہے۔ محبت کا سوانگ
بھر کر وہ انگریزوں کے باطنی خیالات سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ اُس کا یہ مقصد
پورا ہو گیا۔ مجھ سے جو کام نکل سکتا تھا وہ نکال کر اُس نے مجھے دھتا بتا دیا۔
ونے سنگھ تم نہیں اندازہ کر سکتے کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتا تھا؟ اس بھیانک حُسن
کی تہ میں یہ زبردست دغا! مجھے دھمکایا ہے کہ اتنے دنوں میں انگریزی معاشرت کا
مجھے جو کچھ تجربہ ہوا ہے اُسے میں ہندوستانیوں کے تفنن طبع کے لئے بے کم و کاست
شائع کر دوں گی۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے اُسے میں خود ہی کیوں نہ ظاہر کر دوں۔ انگریز
قوم ہندوستان کو لامحدود زمانہ تک اپنی وسیع سلطنت کا جزو بنائے رکھنا چاہتی
ہے۔ کنزرویٹو ہو یا لبرل۔ ریڈیکل ہو یا لیبر۔ نیشنلسٹ ہو یا سوشلسٹ۔ اس
ایک بات پر سبھی متفق ہیں۔ صوفیا کے پہلے ہی میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ریڈیکل
اور لیبر کے لیڈروں کے دھوکے میں نہ آؤ۔ کنزرویٹو جماعت میں خواہ کتنی ہی بُرائیاں
ہوں۔ مگر وہ بے خوف ہے۔ وہ کڑوے سچ سے نہیں ڈرتا۔ ریڈیکل اور لیبر اپنے
پاک و صاف اصولوں کی تائید کرنے میں ایسی اُمید افزا باتیں کہہ ڈالتے ہیں جن پر
عمل کرنے کی جرأت اُن میں نہیں ہے۔ اقتدار ترک کی چیز نہیں ہے۔ دنیا کی تاریخ
صرف اسی ایک لفظ "اقتدار پسندی" پر ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی فطرت اب
بھی وہی ہے جو آغازِ دُنیا کے وقت تھی۔ انگریز قوم ترک کے لئے یا بلند
اصولوں پر قربان ہو جانے کے لئے کبھی مشہور نہیں رہی۔ ہم سب کے سب
(ریڈیکل لیبر ہوں) سلطنت پسند واقع ہوئے ہیں۔ فرق صرف اُس طرزِ عمل
میں ہے جسے مختلف جماعتیں اس قوم پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے

اختیار کرتی ہیں۔ کوئی شخصیت حکومت کرنا چاہتی ہے۔ کوئی ہمدردی سے کوئی چکنی
چپڑی باتوں سے کام نکال کر۔ بس اصل میں کوئی مقررہ طرزِ حکومت نہیں ہے بلکہ
صرف مقصد ہے اور وہ یہ کہ کیونکر ہمارے اختیار و اقتدار میں روز افزوں ترقی
ہوتی رہے۔ یہی وہ مخفی راز ہے جسے ظاہر کر دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ اگر یہ
خط مجھے نہ ملتا تو میری آنکھوں پر پردہ ہی پڑا رہتا اور میں صوفیا کے لئے کیا
کچھ نہ کر ڈالتا۔ مگر اس خط نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور اب میں آپ کی
کوئی مدد نہیں کر سکتا بلکہ آپ سے بھی اصرار کرتا ہوں کہ اس بالشویک تحریک
کو نیست و نابود کر دینے میں ریاست کی مدد کیجئے۔ صوفیا جیسی ذہین، مستعد
اور دھن کی پکی عورت کے ہاتھوں میں پڑ کر یہ تحریک کتنی خطرناک ہو سکتی ہے۔
اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

ونے یہاں سے بھی مایوس ہو کر باہر نکلے تو سوچنے لگے کہ اب مہارانا صاحب
کے پاس جانا بے فائدہ ہے۔ وہ صاف کہہ دیں گے کہ جب دیوان اور ایجنٹ کچھ
نہیں کر سکتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن جی نہ مانا۔ تانگہ والے کو شاہی محل کی طرف
چلنے کا حکم دیا۔

نایک رام۔ کیا گٹ پٹ کرتا رہا؟ آیا راہ پر؟

ونے۔ یہی راہ پر آجاتا تو مہارانا صاحب کے پاس کیوں چلتے۔

نایک رام۔ بیچارہ ہزار مانگتا ہو تو دے کیوں نہیں دیتے؟ افسر چھوٹے
ہوں یا بڑے سبھی لالچی ہوتے ہیں۔

ونے۔ کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ انگریزوں میں اگر یہ برائیاں ہوتیں۔ تو
اس ملک سے کب کے چلے گئے ہوتے۔ یوں انگریز بھی رشوت لیتے ہیں۔ دیوتا نہیں
ہیں۔ پہلے پہل جو انگریز یہاں آئے تھے وہ تو پورے ڈاکو تھے مگر اپنی سلطنت کا
نقصان کر کے یہ لوگ کبھی اپنا فائدہ نہیں سوچتے۔ رشوت لیں گے تو اسی حالت
میں جب سلطنت کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

تانک رام خاموش ہو گئے۔ تانگہ شاہی محل کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں کئی سڑکیں، کئی مدرسے کئی شفاخانے ملے۔ ان سب کے نام انگریزی تھے یہاں تک کہ ایک پارک ملا۔ وہ بھی کسی انگریز ایجنٹ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہندوستانی شہر نہیں بلکہ انگریزوں کی بستی ہے۔ جب تانگہ محل کے سامنے پہنچا تو ونے سنگھ اتر پڑے۔ اور مہارانا صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس گئے۔ وہ ایک انگریز تھا۔ ونے سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ مہاراجہ صاحب تو ابھی پوجا پر ہے۔ گیارہ بجے بیٹھا تھا۔ چار بجے اُٹھے گا۔ کیا آپ لوگ اتنی دیر تک پوجا کیا کرتا ہے؟

ونے۔ ہمارے یہاں ایسے ایسے پوجا کرنے والے ہیں جو کئی کئی دنوں تک مراقبہ میں غرق رہتے ہیں۔ پوجا کا وُہ حصّہ جس میں پرماتما سے یا دیگر دیوتاؤں سے اپنی بھلائی کی استدعا کی جاتی ہے جلد ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن وہ حصّہ جس میں مراقبہ کے ذریعہ روح کو پاک بنایا جاتا ہے بہت بڑا ہوتا ہے۔

سیکرٹری۔ ہم جب راجہ کے ساتھ پہلے تھا۔ وہ سویرے سے دس بجے تک پوجا کرتا تھا۔ تب کھانا کھاتا تھا اور چار بجے سوتا تھا۔ پھر نو بجے پوجا پہ "بیٹھ جاتا" تھا۔ اور دو بجے رات کو اُٹھتا تھا۔ وہ سورج ڈوبنے کے وقت آدھ گھنٹہ کے لئے باہر نکلتا تھا۔ مگر اتنی لمبی پوجا تو میرے خیال میں بالکل غیر قدرتی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ نہ تو عبادت ہے اور نہ دل کی صفائی کا کام۔ بلکہ ایک قسم کا بیکاری ہے۔

ونے اسوقت اتنا پریشان ہو رہے تھے کہ انہوں نے اس طنز کا کوئی جواب نہ دیا۔ سوچنے لگے۔ "اگر راجہ صاحب نے بھی صاف جواب دیا تو میرے لئے کہاں ٹھکانا ہوگا۔ ابھی اتنے بیگناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ کہیں صوفیا نے خونریزی کا کھیل شروع کر دیا تو وہ خون بھی میری گردن پر ہوگا۔" اس خیال سے ونے اتنے پریشان ہوئے کہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آرام کرسی پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ یوں وہ روزانہ سندھیا کرتے تھے پر آج پہلی بار ایشور سے رحم کی پرارتھنا

کی۔ رات بھر کے جاگے۔ دن بھر کے تھکے تھے ہی۔ ایک جھپکی آگئی۔ جب آنکھیں کھلیں تو چار بج چکے تھے۔ سکریٹری سے پوچھا۔ اب تو ہز ہائینس پوجا پر سے اٹھ گئے ہونگے۔

سیکریٹری۔ آپ نے تو ایک لمبی نیند لے لیا۔

یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون کے ذریعہ کہا۔ گورو سنگھ ہز ہائینس سے ملنا چاہتے ہیں۔

ایک منٹ میں جواب ملا۔ آنے دو۔

وِنے سنگھ مہاراجہ کر دیوانِ خاص میں پہنچے۔ وہاں کوئی آرائش نہ تھی۔ صرف دیواروں پر دیوتاؤں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ قالین کے فرش پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ مہاراجہ صاحب مسند پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے جسم پر صرف ایک ریشمی چادر تھی اور گلے میں ایک تلسی کی مالا۔ چہرہ پر فقر وغنا کا رنگ نمودار تھا۔ ونے کو دیکھتے ہی بولے۔ آؤ جی۔ بہت دن لگا دئے۔ مس کلارک کی مہم کا کچھ پتہ چلا؟

ونے۔ جی ہاں۔ بیرپال سنگھ کے گھر ہیں۔ ہے۔ اور بڑے آرام سے۔ دراصل ابھی مسٹر کلارک سے اُس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ صرف منگنی ہوئی ہے۔ اُن کے پاس آنے پر راضی نہیں ہوتی ہے۔ کہتی ہے۔ میں یہیں بڑے آرام سے ہوں اور مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

مہاراجہ۔ ہری ہری۔ یہ تم نے تو عجیب بات سنائی۔ اُن کے پاس آتی ہی نہیں! سمجھ گیا۔ اُن سب نے بس کر دیا ہوگا۔ شیو شیو۔ ان کے پاس آتی ہی نہیں؟

ونے۔ اب خیال فرمایئے کہ وہ تو زندہ ہے اور آرام سے۔ اور یہاں ہم لوگ نے کتنے ہی بیگناہوں کو جیل میں ڈال دیا۔ کتنے ہی گھروں کو برباد کر دیا اور کتنے ہی کو جسمانی سزائیں دیں۔

مہاراجہ۔ شیو شیو۔ بڑا انرتھ (ظلم) ہوا۔

ونے۔ غلطی سے ہم لوگوں نے غریبوں پر کیسے کیسے ظلم کئے کہ اُن کی یاد ہی سے

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مہاراج بہت ٹھیک فرماتے ہیں۔ کہ بڑا انرتھ ہوا۔
جیوں ہی یہ بات لوگوں کو معلوم ہو جائے گی تو رعایا میں بڑا واویلا مچ جائے گا۔ اس
لئے اب یہی مناسب ہے کہ ہم اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور قیدیوں کو رہا کر دیں۔

مہاراجہ۔ ہری ہری۔ یہ کیسے ہوگا بیٹیا۔ راجاؤں سے بھی کہیں غلطیاں ہوتی ہیں؟
شیو شیو۔ راجہ تو ایشور کا اوتار ہے۔ ہری ہری۔ وہ ایک بار جو کر دیتا ہے اُسے پھر نہیں
مٹا سکتا۔ شیو شیو۔ راجہ کی بات نوشتۂ تقدیر ہے۔ وہ نہیں مٹ سکتا۔ شیو شیو۔

رانی۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں جو نیک نامی و عزت ہے وہ ناانصافی
وظلم کو عرصہ تک قائم رکھنے میں نہیں ہے۔ راجاؤں کے لئے عفو ہی زیبا ہے۔ قیدیوں
کو چھوڑ دینے کا حکم دیا جائے۔ جرمانہ کے روپے لوٹا دئے جائیں اور جنہیں جسمانی
سزائیں دی گئی ہیں اُنہیں انعام دے کر خوش کیا جائے۔ ۔ اس سے آپ کا بڑا نام
ہوگا۔ لوگ آپ کی تعریف کریں گے اور آپ کو دعائیں دیں گے ۔

مہاراجہ۔ شیو شیو۔ بیٹا تم راج نیت (سیاست) کی باتیں نہیں جانتے۔
یہاں ایک قیدی بھی چھوڑا گیا اور ریاست پر ایک بلا نازل ہوئی۔ سرکار کہے گی۔
کہ میم کو نہ جانے کس نیت سے چھپائے ہوئے ہے۔ شاید اُس پر فریفتہ ہے۔ جبھی
تو پہلے سزا کا سوانگ رچ کر اب باغیوں کو چھوڑے دیتا ہے۔ شیو شیو۔ ریاست
خاک میں مل جائے گی۔ پاتال (تحت الثریٰ) کو چلی جائے گی۔ کوئی نہ پوچھے گا
کہ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ۔ کہیں بھی اس پر خیال نہ ہوگا۔ ہری ہری۔ ہماری حالت
معمولی مجرموں سے بھی گئی گذری ہے۔ اُنہیں تو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔
عدالت میں اُن پر کوئی قانونی دفعہ عائد کی جاتی ہے اور اُسی دفعہ کے مطابق اُنہیں
سزا دی جاتی ہے۔ ہم سے کون صفائی لیتا ہے؟ ہمارے لئے کون سی عدالت ہے؟
ہری ہری۔ ہمارے لئے نہ کوئی قانون ہے۔ نہ کوئی دفعہ۔ جو جرم چاہا لگا دیا۔ جو
سزا چاہی دے دی۔ نہ کہیں اپیل ہے نہ نگرانی۔ راجے عیاش مشہور ہی ہیں۔
ان پر یہ الزام لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ کہا جائے گا کہ ہم نے کلارک کی حمایت

حسین میم کو اپنے رنواس میں چھپا لیا اور جھوٹ موٹ اُڑا دیا کہ وہ گم ہو گئی۔ ہری ہری۔ شیو شیو۔ سُنتا ہوں۔ بڑی خوب صورت عورت ہے۔ چاند کا ٹکڑا ہے۔ پری ہے بیٹا۔ اس حالت میں مجھے کلنک نہ لگاؤ۔ ضعیفی کی عمر بھی نہیں ایسے بُرے الزامات سے نہیں بچا سکتی۔ یہ مشہور ہی ہے کہ راجا لوگ کشتوں وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں اس لئے تمام عمر قوی و مضبوط بنے رہتے ہیں۔ شیو شیو! یہ راج نہیں ہے۔ اپنے اعمال کی سزا ہے۔ بھگتنا چاہیے بُرے اعمال! شیو شیو! اب کچھ نہیں ہو سکتا سو بچاس بیگھتا ہوں کا جیل میں پڑا رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ وہاں بھی تو کھانا کپڑا ملتا ہی ہے۔ اب تو جیل خانوں کی حالت بہت اچھی ہے۔ نئے نئے کُرتے دئے جاتے ہیں۔ خوراک بھی عمدہ دی جاتی ہے۔ ہاں تمہاری خاطر اتنا کر سکتا ہوں کہ جن گھرانوں کا کوئی سرپرست نہ رہ گیا ہو یا جو جُرمانوں کے سبب سے مفلس و نادار ہو گئے ہوں۔ اُنہیں پوشیدہ طور سے کچھ مدد دی جائے۔ ہری ہری! تم ابھی کلارک کے پاس تو نہیں گئے تھے؟

ونے۔ گیا تھا۔ وہیں سے تو آ رہا ہوں۔

مہاراجہ۔ (گھبرا کر) اُن سے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میم صاحب بڑے آرام سے ہیں اور آنے پر راضی نہیں ہیں؟

ونے۔ یہ بھی کہہ دیا۔ چھپانے کی کوئی بات نہ تھی کسی طرح اُنہیں صبر تو ہو۔

مہاراجہ۔ (زانو پر ہاتھ ٹیک کر) چوپٹ کر دیا۔ ہری ہری! بالکل چوپٹ کر دیا شیو شیو! آگ تو لگا دی۔ اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟ شیو شیو! کلارک کہے گا کہ قیدی قید میں بھی آرام سے ہے تو اس میں کچھ راز ضرور ہے۔ ضرور ہی کہے گا۔ ایسا کہنا قدرتی بات بھی ہے۔ میرے دن بُرے آ گئے شیو شیو! میں اس اعتراض کا کیا جواب دوں گا؟ بھگوان۔ تم نے بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ اسی کو کہتے ہیں لڑکپن کی عقل۔ وہاں نہ جانے کون سی خوشخبری سُنانے کو دوڑے گئے۔ پہلے رعایا کو بھڑکایا۔ ریاست میں آگ لگا دی۔ اب یہ دوسری چوٹ کی۔ نادان

تجھے کلارک سے کہنا چاہئے تھا کہ وہاں میم کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ اوہ۔ شیو شیو!

دفعتاً پرائیویٹ سکریٹری نے ٹیلی فون میں کہا۔ مسٹر کلارک آ رہے ہیں۔

مہاراجہ نے کھڑے ہو کر کہا۔ آ گیا ملک الموت۔ آ گیا۔ کوئی ہے؟ کوٹ پتلون لاؤ۔ تم جاؤ ونے چلے جاؤ۔ ریاست سے چلے جاؤ۔ پھر مجھے منہ نہ دکھانا۔ جلدی پگڑی لاؤ۔ یہاں سے اوگالدان ہٹا دو۔

ونے کو آج راجہ سے نفرت ہو گئی۔ سوچا اتنی اخلاقی گراوٹ۔ اتنی بزدلی! یوں راج کرنے سے ڈوب مرنا بہتر ہے۔ وہ باہر نکلے تو نایک رام نے پوچھا۔ کیسی چھنی؟

ونے۔ ان کی تو مارے دہشت کے آپ ہی جان نکلی جاتی ہے! ایسا ڈرتے ہیں گویا مسٹر کلارک کوئی شیر ہیں اور انہیں آتے ہی نگل جائیں گے۔ مجھ سے تو اس حالت میں ایک دن بھی نہ رہا جاتا۔

نایک رام۔ بھیّا۔ میری تو اب صلاح ہے کہ گھر لوٹ چلو۔ اس خیال میں کب تک جان کھپاؤ گے؟

ونے نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ پنڈا جی کون منہ لے کر گھر جاؤں؟ میں اب گھر جانے کے قابل نہیں رہا۔ ماتا جی میرا منہ نہ دیکھیں گی۔ آیا تھا قوم کی خدمت کرنے جا رہا ہوں سینکڑوں خاندانوں کو تباہ کر کے۔ میرے لئے تو اب ڈوب مرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ میں سمجھ گیا نایک رام۔ مجھ سے کچھ نہ ہوگا۔ میرے ہاتھوں کسی کی بھلائی نہ ہوگی۔ میں زہر لینے ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ میں سانپ ہوں جو کاٹنے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ جس کم بخت کو علاقہ کا علاقہ گالیاں دے رہا ہو جس کی بربادی کے لئے پوجا پاٹ کئے جا رہے ہوں۔ اسے دنیا پر بوجھ کی طرح رہنے کا کیا حق ہے؟ آج مجھ پہ کتنے بیکسوں کا صبر پڑ رہا ہے۔ میری وجہ سے جتنا آنسو بہا ہے اس

میں جب ڈوب سکتا ہوں تب مجھے زندگی سے ڈر لگ رہا ہے جتنا ہی جیئیں گا اتنا ہی اپنے
اوپر گناہوں کا بار چڑھاؤں گا۔ اس وقت اگر ایکا ایک میری موت ہو جائے تو سمجھوں
کہ ایشور نے مجھے بچا لیا۔

اس طرح رنج و پشیمانی میں ڈوبے ہوئے ونے اس مکان میں پہنچے جو ریاست
کی جانب سے انہیں قیام کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ ونے کو دیکھتے ہی نوکر چاکر دوڑے۔
کوئی پانی کھینچنے لگا۔ کوئی جھاڑو دینے لگا۔ کوئی برتن دھونے لگا۔ ونے تانگہ سے
اتر کر سیدھے دیوان خانہ میں گئے۔ اندر قدم رکھا ہی تھا کہ میز پر ایک بند لفافہ
ملا۔ ونے کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ رانی جاہنوی کا خط تھا۔ لفافہ کھولنے کی ہمت
نہ پڑی۔ کوئی ماں پردیس میں پڑے ہوئے اپنے بیمار بیٹے کا تار پا کر اتنی غمگین نہ
ہوتی ہوگی۔ لفافہ ہاتھ میں لئے ہوئے سوچنے لگے۔ اس میں میری ملامت کے
سوا اور کیا ہوگا؟ اندردت نے جو کچھ زبانی کہا ہے۔ وہی بات زیادہ سخت الفاظ
میں یہاں دوہرائی گئی ہوگی۔ لفافہ جیوں کا تیوں رکھ دیا اور سوچنے لگے۔ اب
کیا کرنا چاہئے؟ کیوں نہ یہاں بازار میں کھڑے ہو کر عوام کو مطلع کر دوں۔ کہ
دربار تمہارے ساتھ بے انصافی کر رہا ہے؟ لیکن اس وقت غمزدہ عوام کو مدد
کی ضرورت ہے۔ روپیہ کہاں سے آئے؟ والد صاحب کو لکھوں کہ آپ اس
وقت مجھے جتنے روپے بھیج سکیں بھیج دیجئے؟ روپے آ جائیں تو یہاں یتیموں
کو تقسیم کر دوں۔ نہیں۔ سب سے پہلے والسرائے سے ملوں اور یہاں کی واقعی
حالت ان سے بیان کروں۔ ممکن ہے کہ وہ دربار پر دباؤ ڈال کر قیدیوں کو آزاد
کرا دیں۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ اب مجھے سب کام چھوڑ کر والسرائے سے
ملنا چاہئے۔

وہ سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔ لیکن رانی جی کے خط کی یاد سر پر لٹکتی
برہنہ شمشیر کی طرح انہیں مضطرب کر رہی تھی۔ آخر ان سے ضبط نہ ہو سکا۔
خط کھول کر پڑھنے لگے۔

وہ آج سے کئی ماہ قبل میں تمہاری ماں ہونے پر فخر کرتی تھی۔ مگر آج تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ تم کیا سے کیا ہو گئے! اور اگر یہی حالت رہی تو ابھی اور نہ جانے کیا ہو جاؤ گے۔ اگر میں جانتی کہ تم اسی طرح مجھے خفیف کرو گے تو آج تم اس دُنیا میں نہ ہوتے۔ بیٹا! اس لئے تو نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا؟ اس لئے میں نے تجھے اپنے دل کا خون پلا پلا کر پالا پوسا تھا؟ مصور جب کوئی تصویر بناتے بناتے دیکھتا ہے کہ اس سے میرے دلی جذبات کا انکشاف نہیں ہوتا تو وہ فوراً اُسے مٹا دیتا ہے۔ اسی طرح میں تجھے بھی مٹا دینا چاہتی ہوں۔ میں نے ہی تمہیں بنایا ہے۔ میں نے ہی تمہیں یہ جسم دیا ہے۔ روح کہیں سے آئی ہے۔ پر جسم میرا ہی ہے۔ میں اُسے تم سے واپس مانگتی ہوں۔ اگر تم میں اب بھی کچھ خودداری ہے تو میری امانت مجھے واپس کر دو۔ تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے رنج ہوتا ہے۔ جس کانٹے سے دل میں کسک ہو رہی ہے اُسے نکال سکوں تو کیوں نہ نکال ڈالوں؟ کیا تم میری یہ آخری خواہش پوری کرو گے؟ یا دیگر خواہشات کی طرح اسے بھی خاک میں ملا دو گے؟ میں تمہیں اب بھی اتنا بے غیرت نہیں سمجھتی ورنہ میں خود آتی اور تمہارے دل سے وہ چیز نکال لیتی جس نے تمہاری طبیعت کو بُرائی کی طرف مائل کر دیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے؟ وہ خودداری ہے۔ اگر تمہارے جیسے میرے سو لڑکے ہوتے تو میں ان سبوں کو اس کے تحفظ کے لئے قربان کر دیتی! تم سمجھتے ہو گے میں غصہ سے پاگل ہو گئی ہوں۔ یہ غصہ نہیں ہے۔ اپنی دلی تکلیف کا رونا ہے۔ جب ماں کے قلم سے ایسے بیدردانہ الفاظ نکلیں اُس کے غم مایوسی اور ندامت کا اندازہ تم جیسا کمزور انسان نہیں کر سکتا۔ اب میں اور کچھ نہ لکھوں گی۔ تمہیں سمجھانا بے سود ہے۔ جب عمر بھر کی تعلیم رائیگاں گئی تو ایک خط کی تعلیم کا کیا اثر ہوگا۔ اب صرف دو تمنائیں ہیں! ایشور سے تو یہ کہ تم جیسی نالائق اولاد سا تویں دُشمن کو بھی نہ دے اور تم سے یہ کہ اپنی زندگی کے اس بھدّے کھیل کو ختم کرو۔

وہ یہ خط پڑھ کر روئے نہیں۔ ناراض نہیں ہوئے۔ مغموم بھی نہیں ہوئے۔

اُن کی آنکھیں غرور سے چمک اٹھیں چہرہ پر جوش کی سُرخی نمودار ہوگئی جیسے کسی شاعر کی
زبان سے اپنے آباو اجداد کے بہادرانہ کارنامے سُن کر کسی منچلے راجپوت کا چہرہ تمتما اُٹھے۔
ماتا! تمہیں دھنیہ ہے! بہشت میں بیٹھی ہوئی بہادر راجپوتنیوں کی رُوحیں تمہاری
معیار پسندی پر فخر کرتی ہوں گی۔ میں اب تک تمہاری لاثانی شجاعت سے واقف نہ
تھا۔ تم نے بھارت کی قابل عورتوں کا سَر اونچا کر دیا۔ دیوی! میں خود اپنے کو تمہارا بیٹا
کہتے ہوئے شرمندہ ہوں۔ ہاں میں تمہارا بیٹا کہلانے کے قابل نہیں ہوں۔ تمہارے فیصلہ
کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ اگر میرے قالب میں سو جانیں ہوتیں، تو اُن سبھوں کو تمہاری
خودداری کے تحفظ کے لئے قربان کر دیتا۔ ابھی اتنا بے غیرت نہیں ہوا ہوں لیکن۔ یوں
نہیں۔ میں تمہیں اتنا اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ تمہارا بیٹا جینا نہیں جانتا پر مرنا جانتا
ہے۔ اب دیر کیوں؟ زندگی میں جو کچھ کرنا تھا وہ سب کر چکا۔ اُس کے ختم کر دینے کا اس
سے بہتر اور کون موقع ہوگا۔ یہ سر صرف ایک بار تمہارے قدموں پر تڑپے گا۔ ممکن ہے
کہ آخر وقت تمہارا پاک آشیرواد پا جاؤں۔ شاید تمہاری زبان سے یہ پاک الفاظ ادا ہو
جائیں کہ تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ تو نے جینا نہ جانا۔ پر مرنا جانتا ہے۔ اگر مرتے وقت
بھی تمہارے منہ سے "پیارے بیٹے" یہ دو الفاظ سُن سکا۔ تو میری روح مطمئن
ہو جائے گی اور دوزخ میں بھی شکوہ چین سے رہ سکے گی۔ کاش البٹور نے پَر دئے
ہوتے تو اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاتا۔

ونے نے باہر کی طرف دیکھا۔ سُورج کسی غیرت کے مارے انسان کی طرح اپنا اُترا
ہُوا چہرہ پہاڑوں کی آڑ میں چھپا چکا تھا۔ نایک رام چار زانو بیٹھے ہوئے بھنگ
گھونٹ رہے تھے۔ یہ کام وہ خدمتگاروں سے نہیں لیتے تھے۔ کہتے "یہ بھی ایک
پدیا ہے۔ کوئی ہلدی دھنیا تو ہے نہیں کہ جو چاہے پیس دے۔ برسوں میں بُدھی خرچ
کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر بُوٹی بنتی ہے۔" کل ناغہ بھی ہو گیا تھا۔ مجبور ہو کر بھنگ پیتے
اور رامائن کی دو چار چوپائیاں جو یاد تھیں لَے سے گاتے جاتے تھے۔ اتنے میں ونے
نے بُلایا۔

نایک رام۔ کیا ہے بھیا؟ آج مجاورا بوٹی بن رہی ہے۔ تم نے کبھی کاہے کو پی ہوگی۔ آج تھوڑی سی لے لینا۔ ساری تھکاوٹ بھاگ جائے گی۔

ونے۔ اچھا اس وقت بوٹی رہنے دو۔ ماتا جی کا خط آیا ہے۔ گھر چلنا ہے۔ ایک تانگہ ٹھیک کر لو۔

نایک رام۔ بھیا، تمہارے تو سب کام جلدی کے ہوتے ہیں۔ گھر چلنا تو کل آرام سے چلیں گے۔ بوٹی چھان کر رسوئی بناتا ہوں۔ تم نے بہت کا شمیری رسوئیوں کا بنا ہوا بھوجن کھایا ہے۔ آج جرا میرے ہاتھ کے بھی بھوجن کا سواد لو۔

ونے۔ اب گھر پہنچ کر ہی تمہارے ہاتھ کے بھوجن کا سواد لوں گا۔

نایک رام۔ ماتا جی نے بلایا ہوگا؟

ونے۔ ہاں۔ بہت جلد۔

نایک رام۔ اچھا۔ بوٹی تو تیار ہو جائے۔ گاڑی تو نو بجے رات کو جاتی ہے۔

ونے۔ نو بجنے میں دیر نہیں ہے۔ سات تو بج ہی گئے ہوں گے۔

نایک رام۔ جب تک اسباب بندھواؤ۔ میں جلدی سے چھانے لیتا ہوں تقدیر میں آتنا سکھ بھی نہیں لکھا ہے کہ بے فکر ہو کر بوٹی تو چھانتا۔

ونے۔ اسباب کچھ نہیں جائے گا۔ میں گھر سے کوئی اسباب لے کر نہیں آیا تھا۔ یہاں سے چلتے وقت گھر کی کنجی سردار صاحب کو دے دینی ہوگی۔

نایک رام۔ اللہ یہ سارا اسباب؟

ونے۔ کہہ دیا کہ میں کچھ نہ لے جاؤں گا۔

نایک رام۔ بھیا تم کچھ نہ لو۔ پر میں تو یہ دوسالا اور یہ صندوق جرور لوں گا۔ بدھر سے دوسالا ۔۔۔ ہ کر نکل جاؤں گا۔ دیکھنے والے لوٹ جائیں گے۔

ونے۔ ایسی بہلک چیزیں کر کیا کرو گے جسے دیکھ کر ہی تھر تھرا اٹھ جائے؟ یہاں کی کوئی چیز نہ چھونا۔ جاؤ۔

نایک رام بھاگ کو گھوٹتے ہوئے گھر سے نکلے تو گھنٹہ بھر تک گاڑیوں کا کرایہ

ملے کرتے رہے۔ آخر جب یہ پیچیدہ مسئلہ کسی طرح حل نہ ہُوا تو ایک کو جبراً پکڑ لائے۔ تانگہ والا بھنبھناتا ہُوا آیا۔ "سب حاکم ہی حاکم تو ہیں۔ ارے جنور کے پیٹ کو بھی تو کچھ ملنا چاہیئے۔ کوئی مائی کا لال یہ نہیں سوچتا کہ دن بھر تو بیگار میں مرے گا۔ کیا آپ کھائے گا۔ کیا جنور کو کھلائے گا۔ کیا بال بچوں کو دے گا؟ اس پر ترکھ نامہ لکھ کر گلی گلی لٹکا دیا۔ بس تانگہ والے ہی سب کو لوٹے کھاتے ہیں اور تو جتنے محکمے ملازم ہیں۔ سب دودھ کے دھوئے ہوئے ہیں۔ بکچہ ڈھوے۔ بھیک مانگ کھائے پر تانگہ کبھی نہ چلائے۔"

جیوں ہی تانگہ دروازہ پر آیا ونے جاکر بیٹھ گئے لیکن نایک رام اپنی اَدھ گھٹی بوٹی کیونکر چھوڑتے؟ جلدی جلدی رگڑی۔ چھان کر پی۔ تمباکو کھائی۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر پگڑی باندھی۔ لوگوں سے رام رام کہی اور دوشالہ کو گر بسنہ لگا ہوں سے تکتے ہوئے باہر نکلے۔ تانگہ چلا۔ سردار صاحب کا گھر راستہ ہی میں تھا۔ وہاں جاکر نایک رام نے کنجی اُن کے دربان کے حوالہ کی اور آٹھ بجتے بجتے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ نایک رام نے سوچا۔ کہ راہ میں تو کچھ کھانے کو ملے ہی گا نہیں اور گاڑی پر کھانا کھائیں گے کیسے۔ دوڑ کر پوریاں لیں۔ پانی لائے اور کھانے بیٹھ گئے۔ ونے نے کہا ابھی میرا جی نہیں چاہتا۔ وہ کھڑے گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل دیکھ رہے تھے کہ یہ گاڑی اجمیر کب پہنچے گی۔ اور دلی میں کون سی گاڑی ملے گی۔ یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑھیا روتی پیٹتی ہوئی چلی آ رہی ہے اور دو تین آدمی اُسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ ونے سنگھ کے سامنے ہی آکر بیٹھ گئی۔ ونے نے پوچھا تو معلوم ہُوا کہ اُس کا لڑکا جسونت نگر کی جیل کا داروغہ تھا۔ اُسے دن دہاڑے کسی نے قتل کر ڈالا۔ ابھی خبر ملی ہے اور یہ بیچاری غمزدہ ماں یہاں سے جسونت نگر جا رہی ہے۔ موٹر والے کرایہ زیادہ مانگتے تھے۔ اس لئے ریل گاڑی سے جاتی ہے۔ راستہ میں اُتر کر بیل گاڑی کر لے گی۔ ایک ہی لڑکا تھا۔ بیچاری کو بیٹے کا منہ بھی دیکھنا بدا نہ تھا۔

ونے سنگھ کو بہت رنج ہُوا۔ "داروغہ بڑا سیدھا سادہ آدمی تھا۔ قیدیوں پر

بڑی مہربانی کرتا تھا۔ اُس سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ اُنہیں معاً شبہ ہوا کہ یہ بھی بیرپال سنگھ کی جماعت کی مجرمانہ کارروائی ہے۔ صوفیا نے غالباً دھمکی ہی دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے خفیہ قتل کے ذرائع جمع کر لئے ہیں۔ ایشور۔ میری بدعمالیوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اِن قتل کی وارداتوں کا عذاب بھی میری ہی گردن پر ہے۔ صوفیا کی گردن پر نہیں۔ صوفیا جیسی رحیم۔ عقیل۔ فرض شناس عورت نے میری ہی کمزوریوں سے متاثر ہو کر یہ خونریزی کا وطیرہ اختیار کیا ہے۔ ایشور کیا ابھی میری تکالیف اپنی انتہائی حد کو نہیں پہنچ گئیں؟ میں پھر صوفیا کے پاس جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا اور اُس کے قدموں پر سر رکھ کر مؤدبانہ عرض کروں گا۔ دیوی میں اپنے کیئے کی سزا پا چکا۔ اب یہ کارروائیاں بند کر دو۔ ورنہ یہیں تمہارے سامنے جان دے دوں گا۔ لیکن صوفیا کو پاؤں کہاں؟ کون مجھے اُس قلعہ کے دشوار گزار راستہ پر لے جائے گا؟

جب گاڑی آئی تو ونے نے بڑھیا کو اپنے ہی پاس بٹھلایا۔ نایک رام دوسرے خانہ میں بیٹھے کیونکہ ونے کی موجودگی میں اُنہیں مسافروں سے آزادانہ گفتگو کرنے کا موقع نہ ملتا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ آج پولیس کے سپاہی ہر اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دربار نے مسافروں کی حفاظت کے لیئے یہ خاص انتظام کیا تھا۔ کسی اسٹیشن پر مسافر سوار ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ باغیوں نے کئی جاگیرداروں کو لُوٹ لیا تھا۔

پانچویں اسٹیشن سے تھوڑی ہی دُور پر گاڑی اچانک رُک گئی۔ وہاں کوئی اسٹیشن نہ تھا۔ لائن کے نیچے کئی آدمیوں کی بات چیت سُنائی دی۔ پھر کسی نے ونے کے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ ونے نے پہلے تو آنے والے کو روکنا چاہا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُن کی جمہوریت خود غرضی کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ یہ بھی شک ہوا کہ ڈاکو نہ ہوں۔ لیکن قریب جا کر دیکھا تو کسی عورت کے ہاتھ تھے۔ بلاتک ہٹ گئے اور ایک لمحہ میں ایک عورت گاڑی پر چڑھ آئی۔ ونے دیکھتے ہی پہچان گئے۔

وہ بس صوفیا تھی۔ بس کے بیٹھتے ہی گاڑی پھر چلنے لگی۔

صوفیا نے گاڑی میں آتے ہی وِنے کو دیکھا۔ چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ جی میں آیا۔ گاڑی سے اُتر جاؤں۔ مگر گاڑی چل چکی تھی۔ ایک لمحہ تک وہ ساکت کھڑی رہی۔ وِنے کے سامنے اُس کی آنکھیں نہ اٹھتی تھیں۔ پھر اُس بڑھیا کے پاس بیٹھ گئی اور کھڑکی کی طرف تاکنے لگی۔ تھوڑی دیر تک دونوں بُت بنے بیٹھے رہے۔ کسی کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

بُڑھیا نے صوفیا سے پوچھا۔ کہاں جاؤ گی بیٹی؟

صوفیا۔ بڑی دُور جانا ہے۔

بُڑھیا۔ یہاں کہاں سے آ رہی ہو؟

صوفیا۔ یہاں سے تھوڑی دُور ایک گاؤں ہے۔ وہیں سے آتی ہوں۔

بُڑھیا۔ تم نے گاڑی کھڑی کرا دی تھی کیا؟

صوفیا۔ اسٹیشنوں پر آج کل ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ اسی لئے درمیان میں گاڑی رکوا لی۔

بُڑھیا۔ تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں ہے کیا؟ اکیلے کیسے جاؤ گی؟

صوفیا۔ آدمی نہ ہو تو ایشور تو ہے۔

بُڑھیا۔ ایشور ہیں کہ نہیں۔ کون جانے؟ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ سنسار کا کرتا دھرتا کوئی نہیں ہے جبھی تو دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ خون ہوتے ہیں۔ کل میرے بیٹے کو ڈاکوؤں نے مار ڈالا۔ (رو کر) گونگا تھا گونگا۔ کبھی مجھے جواب نہیں دیا۔ جیل کے قیدی اُس کو دُعائیں دیا کرتے تھے کہ ان کا جیلر ماں کو نہیں ستایا۔ اُس پر یہ آفت آئی تو کیسے کہوں کہ کوئی ایشور ہے۔

صوفیا۔ کیا جسونت نگر کے جیلر آپ کے بیٹے تھے؟

بُڑھیا۔ ہاں بیٹی۔ وہی ایک لڑکا تھا سو بھگوان نے ہر لیا۔

یہ کہہ کر بڑھیا سسکنے لگی۔ صوفیا کا چہرہ کسی مرتے ہوئے مریض کے چہرہ

کی طرح بے رونق ہو گیا۔ ذرا دیر تک وہ ضبط کئے ہوئے کھڑی رہی۔ پھر کھڑکی سے باہر سر نکال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کا کینہ آتشِ انتقام منحوس شکل میں اُس کے سامنے تھا۔

صوفیا آدھ گھنٹہ تک منہ چھپائے روتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آ گیا جہاں بڑھیا اترنا چاہتی تھی۔ جب وہ اترنے لگی تو ونے نے اُس کا اسباب اتارا اور اُسے تسلی دے کر رخصت کیا۔

ابھی ونے گاڑی میں بیٹھے بھی نہ تھے کہ صوفیا نیچے جا کر بڑھیا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔ ماتا تمہارے بیٹے کا خون کرنے والی میں ہوں۔ جو سزا چاہو دو۔ تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔

بڑھیا نے حیرت سے کہا۔ کیا تو ہی وہ ڈائن ہے جس نے دربار سے لڑنے کے لئے ڈاکوؤں کو جمع کیا ہے؟ نہیں۔ تو نہیں ہو سکتی! تو تو مجھے رحم و مہربانی کی مورت سی نظر آتی ہے۔

صوفیا۔ ہاں ماتا۔ میں ہی وہ ڈائن ہوں!

بڑھیا۔ جیسا تو نے کیا ویسا تیرے آگے آئے گا۔ میں تجھے اور کیا کہوں؟ میری طرح تیرے دن بھی روتے ہی کٹیں۔

انجن نے سیٹی دی۔ صوفیا بےحس سی کھڑی تھی۔ وہاں سے ہلی تک نہیں۔ گاڑی چلی۔ صوفیا اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ دفعتاً ونے گاڑی سے کود پڑے۔ صوفیا کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا اور آپ بھی بڑی مشکل سے گاڑی میں چڑھے۔ ایک لمحہ کی دیر ہوتی تو وہیں رہ جاتے۔

صوفیا نے مغموم لہجہ میں کہا۔ ونے تم میرے کہنے کا یقین کرو یا نہ کرو۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے بیرپال کو ایک آدمی کے قتل کی بھی صلاح نہیں دی۔ میں اُس کی قاتلانہ رغبت کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کرتی رہی۔ مگر وہ گروہ اس وقت بدلہ لینے کی دھن میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ کسی نے میری نہ سنی۔ یہی سبب ہے کہ میں اب

یہاں سے جا رہی ہوں۔ میں نے اس رات کو ایک جنون کی سی حالت میں تم سے نہ جانے کیا کیا باتیں کیں۔ لیکن ایشور جانتا ہے کہ اس کا مجھے کتنا رنج و افسوس ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ ہمیشہ دوسروں کو مارنے اور دوسروں کے ہاتھوں مارے جانے کے لئے ہم سخت مصیبت کے وقت ہی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ حالت ہمیشہ نہیں قائم رہ سکتی۔ انسان فطرتاً امن پسند ہوتا ہے۔ پھر جب سرکاری تشدد نے کمزور رعایا کو انتقام لینے پر آمادہ کر دیا تو کیا طاقتور سرکار اس سے بھی زیادہ تشدد کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے گی؟ لیکن میں تم سے ایسی باتیں کر رہی ہوں گویا تم گھر ہی کے آدمی ہو۔ میں بھول گئی تھی کہ تم سرکاری ہوا خواہوں میں سے ہو۔ مگر اتنی مہربانی کرنا کہ مجھے پولیس کے حوالہ نہ کر دینا۔ پولیس سے بچنے ہی کے لئے میں نے راستہ میں گاڑی ٹھہرا کر سوار ہونے کا بندوبست کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس وقت بھی تم میری ہی تلاش میں ہو۔

ونے سنگھ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ ملامت آمیز لہجہ میں بولے صوفیا تمہیں اختیار ہے کہ مجھے جتنا چاہے کمینہ اور ذلیل سمجھو۔ مگر ایک دن آئے گا جب تمہیں ان باتوں پر پچھتانا پڑے گا اور تم سمجھو گی کہ تم نے مجھ پر کتنی زیادتی کی ہے۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کیا گھر سے یہاں آنے کے قبل میرے گرفتار ہونے کی خبر پا کر تم نے بھی وہی وطیرہ اختیار نہ کیا تھا؟ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے دوسروں کو برباد کیا اور تم اپنے ہی کو برباد کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ میں نے تمہارے طرزِ عمل کو قابلِ عفو سمجھا۔ وہ مصیبت کے وقت کا طرزِ عمل تھا۔ تم نے میرے طرزِ عمل کو معافی کے ناقابل سمجھا۔ اور سخت سے سخت چوٹ جو تم پہنچا سکتی تھیں اسے پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ مجھے پولیس کی مدد کرتے دیکھ کر تمہیں اتنا تعجب و افسوس نہ ہوا ہوگا جتنا مجھ کو تمہیں مسٹر کلارک کے ساتھ دیکھ کر ہوا۔ اس وقت بھی تم وہی انتقامی وطیرہ اختیار کر رہی ہو یا کم از کم تم مجھ سے ایسا کہہ چکی ہو۔ اتنے پر بھی تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔

تمہاری جھڑکیاں سُن کر مجھے جتنا روحانی کوفت ہوئی اور ہورہی ہے وہ میرے لئے نئے کالی سے زیادہ ۔ اِس میں تم نے اس وقت اور اضافہ کر دیا۔ کبھی تم اپنی اِس بیدردی پر خون کے آنسو بہاؤ گی ۔ خیر۔

یہ کہتے کہتے ونے کا گلا بھر آیا۔ پھر وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔

صوفیا نے آنکھوں سے اپنی دلی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ۔ آؤ اب ہمارا تمہارا میل ہو جائے۔ میری ان باتوں کو بھول جاؤ۔

ونے نے آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا ۔ میں کچھ کہتا ہوں؟ اگر طبیعت آسودہ نہ ہوئی تو اور جو چاہے کہہ ڈالو۔ جب بُرے دن آتے ہیں تو کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ تمہارے یہاں سے آکر میں نے قیدیوں کو آزاد کرانے کے لئے حکام سے مسٹر کلارک سے ۔ یہاں تک کہ تمہارا نا صاحب سے بھی جتنی منت سماجت کی وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مگر کسی نے میری بات تک نہ سُنی۔ ہر طرف سے مایوس ہی ہونا پڑا۔

صوفیا ۔ یہ تو میں جانتی تھی۔ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟

ونے ۔ جہنم کو ۔

صوفیا۔ مجھے بھی لیتے چلو ۔

ونے ۔ تمہارے لئے بہشت ہے ۔

ایک لمحہ بعد پھر بولے ۔ گھر جا رہا ہوں۔ ماں جی نے بُلایا ہے مجھے دیکھنے کی خواہش مند ہیں۔

صوفیا ۔ اندر دت تو کہتے تھے تم سے بہت ناراض ہیں۔

ونے نے جیب سے رانی صاحبہ کا خط نکال کر صوفیا کو دے دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ یہ تو محبت اتنا کھنچ رہی ہے اور میں خواہ مخواہ اُس کی طرف دوڑا جاتا ہوں ۔ دفعتاً صوفیا نے خط کو چاک کر کے کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور فرطِ محبت سے بیقرار ہو کر بولی ۔" میں

تمہیں نہ جانے دوں گی۔ ایشور جانتا ہے۔ میں تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تمہارے عوض میں خود ہی رانی جی کے پاس جاؤں گی۔ اور ان سے کہوں گی۔ تمہاری خطاوار میں ہوں ..... "یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ بول نہ سکی۔ ونے کے کندھے پر سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگی۔ آواز ہلکی ہوئی۔ تو پھر بولی ۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ نہ جاؤں گا۔ تم نہیں جا سکتے۔ مذہباً اور انصافاً تمہیں جا سکتے۔ بولو وعدہ کرتے ہو؟

اُن اشک آلود آنکھوں میں کتنی نرمی کتنی التجا کتنی عاجزی۔ کتنی ضد تھی!

ونے نے کہا۔ نہیں صوفیا۔ مجھے جانے دو۔ تم ماتا جی کو خوب جانتی ہو۔ میں نہ جاؤں گا۔ تو وہ اپنے دل میں مجھے بے عزت۔ بے حیا۔ بزدل سمجھیں گی۔ اور اس مجنونانہ حالت میں وہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔

صوفیا۔ نہیں ونے۔ مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔ للہ رحم کرو۔ میں رانی جی کے پاس جا کر روؤں گی۔ اُن کے پیروں پڑوں گی اور ان کے دل میں تمہاری طرف سے جو کدورت ہے اُسے اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالوں گی۔ مجھے وثوق ہے کہ میں اُن کی ماتنا والے جذبات متحرک کر دوں گی۔ میں ان کے مزاج سے واقف ہوں۔ اُن کا دل دَیا کا بھنڈار ہے۔ جس وقت میں ان کے قدموں پر سر رکھ کر کہوں گی۔ اماں تمہارا بیٹا میرا مالک ہے۔ میری خاطر اسے معاف کر دو۔" اس وقت وہ مجھے پیروں سے ٹھکرائیں گی نہیں۔ وہاں سے جھلائی ہوئی اٹھ کر چلی جائیں گی لیکن ایک لمحہ بعد مجھے بلائیں گی اور محبت سے گلے لگائیں گی۔ میں ان سے تمہاری جان کی اماں مانگوں گی۔ پھر تمہیں بھی مانگ لوں گی۔ ماں کا دل کبھی اتنا سخت نہیں ہو سکتا۔ وہ اس خط کو لکھ کر شاید اس وقت پچھتا رہی ہوں گی۔ منتا رہی ہوں گی کہ خط نہ پہنچے۔ بولو۔ وعدہ کرو۔

ایسے محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ ونے کے کانوں نے کبھی نہ سنے تھے۔

اُنہیں اپنی زندگی بامعنی معلوم ہونے لگی۔ آہ۔ صوفیا اب بھی مجھے چاہتی ہے۔ اُس نے مجھے معاف کر دیا۔ وہ زندگی جو پہلے ریگستان کی طرح بے آب غیر آباد اور سُنسان تھی اب دلکش و بلیور چشموں اور نہروں بیل بوٹوں اور پودوں سے معمور ہو کر ایک دلکشی کا مرقع بن گئی۔ خوشی کے دروازے کھل گئے تھے اور اس کے اندر سے میٹھے گیتوں کی تان و برقی لیمپوں کی روشنی۔ ہوائے معطر کی خوشبو باہر نکل نکل کر دل کو جبراً اپنی طرف کھینچے لگیں۔ ونے سنگھ کو اس منظرِ دلفریب نے بالکل وارفتہ بنا دیا۔ اصل میں زندگی کا سُکھ زندگی کا دُکھ ہے۔ ترکِ تعلق اور دلی کلفت زندگی کے لئے قابل قدر جواہر ہیں۔ ہماری پاک خواہش۔ ہماری بے لوث خدمات۔ ہمارے نیک ارادے سبھی ہماری کشتِ غم کی پیداوار ہیں۔

ونے نے نوش کھاتے ہوئے کہا صوفیا۔ ماتا جی کے پاس ایک بار مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ مجھ صاف طور پر نہ کہیں گی کہ . . . .

صوفیا نے ونے کی گردن میں ہاتھوں کو حمائل کرتے ہوئے کہا نہیں نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔ تم تنہا اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ تم میں ہمت ہے خودداری ہے مروّت ہے سب کچھ ہے پر صبر نہیں۔ پہلے میں اپنے لئے تمہیں ضروری سمجھتی تھی۔ اب تمہارے لئے اپنے کو ضروری سمجھتی ہوں۔ ونے زمین کی طرف کیوں تاکتے ہو؟ میری طرف دیکھو! میں نے تمہیں جو سخت الفاظ کہے اُس پر نادم ہوں۔ خدا گواہ ہے۔ سچے دل سے نادم ہوں۔ اُن باتوں کو بھول جاؤ۔ محبت میں جتنی معیار پسندی ہوتی ہے اُتنا ہی عفو بھی ہوتا ہے۔ بولو۔ وعدہ کرو۔ اگر تم مجھ سے گلا چھڑا کر چلے جاؤ گے تو پھر . . . . تمہیں صوفیا نہ ملے گی۔

ونے نے محبت کے جوش میں آ کر کہا۔ تمہاری مرضی ہے تو نہ جاؤں گا۔

صوفیا۔ تو ہم اگلے سٹیشن پر اُتر پڑیں گے۔

ونے۔ نہیں پہلے بنارس چلیں۔ تم ماتا جی کے پاس جانا۔ اگر وہ مجھے معاف کر دیں گی . . . .

صوفیا۔ ونے ابھی بنارس نہ چلو۔ ذرا دل کو سکون ہونے دو۔ ذرا طبیعت ٹھکانے ہونے دو۔ پھر رانی جی کا تم پر کیا اختیار ہے؟ تم میرے ہو۔ اُن سبھی قاعدوں کے مطابق جنہیں خدا اور انسانوں نے بنایا ہے۔ تم میرے ہو۔ میں رعایت نہیں اپنا حق چاہتی ہوں۔ ہم اگلے اسٹیشن پر اُتر پڑیں گے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کہاں جانا ہے؟

ونے نے لجاتے ہوئے کہا۔ گذر بسر کیسے ہوگا؟ میرے پاس جو کچھ ہے وہ نایک رام کے پاس ہے۔ وہ کسی دوسرے کمرہ میں ہے۔ اگر اُسے خبر ہو گئی۔ تو وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔

صوفیا۔ اُس کی کیا پرواہ؟ نایک رام کو جانے دو محبت جنگلوں میں بھی بسکھی رہ سکتی ہے۔

اندھیری رات میں گاڑی کوہ و بیابان کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ باہر دوڑتی ہوئی کوہستانی قطاروں کے سوا اور کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ ونے تاروں کی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ صوفیا دیکھ رہی تھی کہ آس پاس کوئی گاؤں ہے یا نہیں۔

اتنے میں اسٹیشن نظر آیا۔ صوفیا نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور دونوں چپکے سے اُتر پڑے جیسے چڑیوں کا جوڑا گھونسلے سے دانہ کی کھوج میں اُڑ جائے اُنہیں اُس کی فکر نہیں کہ آگے صیاد بھی ہے۔ شکاری چڑیاں بھی ہیں اور کسان کی غلیل بھی ہے۔ اُس وقت تو دونوں اپنے خیالات میں مگن ہیں۔ دانہ سے لہراتے ہوئے کھیتوں کی بہار دیکھ رہے ہیں۔ مگر وہاں تک پہنچنا بھی اُن کے نصیبوں میں ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔

(۳۶)

مسٹر جان سیوک نے طاہر علی، محنت اور ایمانداری سے خوش ہو کر کھالوں پر کچھ کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ اس سے اب اُن کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو

گیا تھا جس سے مل کے مزدوروں پر اُن کا رُعب تھا اور اوور سیر تیسرے
درجے کے کلرک بھی ان کا کافی لحاظ کرتے تھے۔ لیکن آمدنی میں ترقی ہونے کے
ساتھ ہی ان کے اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جب یہاں اُن کے مساوی
درجے کے لوگ نہ تھے تو وہ پھٹے پُرانے جوتوں پر ہی بسر کر لیا کرتے۔ خود ہی بازار
سے سودا خرید لاتے اور کبھی کبھی خود ہی پانی بھی کھینچ لیتے تھے۔ کوئی ہنسنے والا نہ
تھا۔ اب مل کے ملازموں کے سامنے انہیں زیادہ شان سے رہنا پڑتا تھا اور
کوئی موٹا کام اپنے ہاتھ سے کرتے شرم معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے انہوں نے
مجبوراً ایک بُڑھیا خادمہ رکھ لی تھی۔ پان الائچی وغیرہ کا خرچ پہلے سے کئی
گنا بڑھ گیا تھا۔ اُس پر کبھی دوستوں کی دعوت بھی کرنی پڑتی تھی تنہا رہنے
والے سے کوئی دعوتوں کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ جانتا ہے کہ اس طرح دعوت
پھیکی رہے گی۔ لیکن عیال دار لوگوں کے لئے تو کوئی عذر نہیں۔ کسی نے کہا۔ خاں
صاحب آج ذرا زردہ پکوائیے۔ روٹی دال کھاتے کھاتے زبان موٹی پڑ گئی۔
اس کے جواب میں طاہر علی کو کہنا ہی پڑتا۔ ہاں ہاں لیجئے۔ آج ہی پکواتا ہوں
گھر میں ایک ہی عورت ہوتی تو اُس کی بیماری کا حیلہ کر کے ٹالنے کی کوشش کرتے
مگر یہاں تو گھر میں ایک کیا بلکہ تین تین عورتیں تھیں۔ پھر اُس کے علاوہ طاہر علی
دل کے چھوٹے نہ تھے۔ انہیں کھلانے پلانے کا شوق تھا اور دوستوں کی خاطرداری
میں اُن کو خاص لطف آتا۔ خلاصہ یہ کہ شرافت کے نباہ میں اُن کی حلیہ بگڑی جاتی
تھی۔ بازار میں تو اب اُن کا دمڑی کا اعتبار نہ تھا۔ وہ نادہند مشہور ہو گئے تھے۔
بنیے وہاں تو انہیں کوئی چیز بھی ادھار نہ ملتی۔ دوستوں سے دستگرداں سے
قرض لے کر کام چلایا کرتے بازار والوں نے نااُمید ہو کر تقاضا کرنا چھوڑ دیا۔
سمجھ گئے کہ اس کے پاس ہی نہیں ہے دے گا کہاں سے۔ تحریری قرض جان
دار اور غیر فانی ہوتا ہے۔ زبانی قرض بے جان اور فانی۔ ایک عربی گھوڑا ہے
جو اُسے نہیں برداشت کر سکتا۔ یا تو سود کا خاتمہ کر دے گا یا اپنا۔ دوسرا

لدّو ٹٹو ہے جیسے اُس کے پیر نہیں بلکہ کوڑے چلاتے ہیں۔ کوڑا لوٹا یا سوار کا ہاتھ رُکا اور ٹٹو بیٹھا۔ پھر نہیں اُٹھ سکتا۔

لیکن اگر صرف دوستوں کی خاطر مدارات ہی تک بات ہوتی تو شاید طاہر علی کسی طرح کھینچ تان کر چولہ بٹھانے میں کامیاب ہوتے۔ مصیبت یہ تھی کہ اُن کے چھوٹے بھائی ماہر علی ان دنوں مراد آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گئے تھے۔ تنخواہ پاتے ہی اُس کا نصف حصہ آنکھیں بند کر کے مراد آباد بھیج دینا پڑتا تھا۔ طاہر علی خرچ سے ڈرتے تھے۔ مگر اُن کی دونوں ماؤں نے طعنے دے دے کر انہیں گھر میں رہنا مشکل کر دیا تھا۔ دونوں ہی کی یہ دلی تمنا تھی کہ ماہر علی پولیس میں ملازم ہو کر داروغہ بنے۔ بیچارے طاہر علی مہینوں تک حکام کے بنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ یہاں جا وہاں جا۔ انہیں ڈالی دے۔ اُنہیں نذرانہ پیش کر۔ ان کی سفارش لا۔ ان کی چٹھی منگا۔ بالآخر مسٹر جان سیوک کی سفارش کام کر گئی۔ یہ سب مرحلے تو طے ہو گئے۔ آخری مرحلہ ڈاکٹری معائنہ تھا۔ یہاں سفارش اور خوشامد کا گزر نہ تھا۔ بتیس روپے سول سرجن کے لیئے سولہ روپے اسسٹنٹ سرجن اور آٹھ روپے کلرک اور چپراسیوں کے لیئے کل چھپن روپے کی میزان تھی۔ یہ رقم کہاں سے آئے۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر طاہر علی کلثوم کے پاس آئے اور بولے۔ تمہارے پاس کوئی زیور ہو تو دے دو۔ میں بہت جلد چھڑا دوں گا۔ اس نے تنگ کے صندوقچہ ان کے سامنے پٹک دیا اور کہا۔ یہاں زیوروں کی ہوس نہیں ہے۔ سب آس پوری ہو چکی۔ روٹی دال ملتی جائے۔ یہی غنیمت ہے۔ تمہارے گہنے تمہارے آگے ہیں۔ جو جی چاہے کرو ـــ طاہر علی کچھ دیر تک تو شرم سے سر نہ اُٹھا سکے۔ پھر صندوقچہ طرف دیکھا۔ ایسی ایک بھی چیز نہ تھی جس سے اس کی چوتھائی رقم بھی مل سکتی۔ ہاں تمام زیورات سے کام چل سکتا تھا۔ شرماتے ہوئے کل چیزیں نکال کر رومال میں باندھیں اور باہر آ کر اس فکر میں بیٹھے ہی تھے۔ کہ انہیں کیونکر لے جاؤں کہ اتنے میں خادمہ آئی۔ طاہر علی کو سوجھی کہ کہیں نہ اس

کے معرفت روپے منگواؤں۔ مامائیں ان کاموں میں مشاق ہوتی ہیں۔ خیر چپکے سے بلا کر اُس سے یہ بات کہی۔ بڑھیا نے کہا ۔ میاں یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چیز تو رکھنی ہے کون کسی سے خیرات مانگتے ہیں۔ میں روپے لادوں گی۔ آپ مطمئن رہیں۔ خادمہ گہنوں کی پوٹلی لے کر چلی تو زینب نے دیکھا۔ بلا کر بولیں۔ تو کہاں لئے لئے پھرے گی؟ میں روپے منگوائے دیتی ہوں۔ اُن کا ایک دوست مہاجنی کا کام کرتا ہے ماما نے پوٹلی اُسے دے دی۔ دو گھنٹہ بعد اپنے پاس سے چھپن روپے نکال کر دئے۔ اس طرح یہ مشکل مسئلہ حل ہوا۔ طاہر علی مراد آباد گئے اور جب سے وہیں تعلیم پا رہے تھے۔ تنخواہ کا نصف حصہ وہاں چلے جانے کے بعد بقیہ نصف حصہ میں گھر کا خرچ بڑی مشکل سے پورا پڑتا۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی۔ اُدھر طاہر علی نصف ہی پر قناعت نہ کرتے۔ کبھی لکھتے کہ کپڑوں کے لئے روپے بھیجے، کبھی ٹینس کھیلنے کے لئے سوٹ کی فرمائش کرتے۔ طاہر علی کو کمیشن کے روپوں سے بھی کچھ نہ کچھ وہاں بھیج دینا پڑتا تھا۔

ایک روز تمام رات فاقہ کرنے کے بعد علی الصباح زینب نے آکر کہا۔ آج روپوں کی کچھ فکر کی یا آج بھی روزہ رہے گا؟

طاہر علی نے چڑھ کر کہا۔ میں اب کہاں سے لاؤں؟ تمہارے سامنے ہی کمیشن کے روپے مراد آباد نہیں بھیجے تھے؟ بار بار لکھتا ہوں کہ کفایت سے خرچ کرو۔ میں بہت تنگ ہوں۔ لیکن وہ حضرت فرماتے ہیں کہ یہاں ہر ایک لڑکا گھر سے سینکڑوں روپے منگواتا ہے اور بے دریغ خرچ کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کفایت کرنا میرے امکان میں نہیں۔ جب اُدھر کا یہ حال ہے اور ادھر کا یہ حال تو روپے کہاں سے لاؤں؟ دوستوں میں بھی تو کوئی ایسا نہیں بچا جس سے کچھ مانگ سکوں۔

زینب مشتعل ہو کر بولیں۔ اُن کی باتیں؟ لڑکے کو خرچ کیا دے رہے ہیں گویا میرے اوپر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ مجھے کیا تم اُسے خرچ بھجواؤ یا بلاؤ۔ اُس کے

وہاں پڑھنے سے یہاں پیٹ تھوڑا ہی بھر جائے گا۔ تمہارا بھائی ہے پڑھاؤ یا نہ پڑھاؤ۔ مجھ پر کیا احسان؟

طاہر علی۔ تو تمہیں بتاؤ۔ روپے کہاں سے لاؤں؟

زینب۔ مردوں کے ہزار ہاتھ ہوتے ہیں۔ تمہارے ابا جان دس ہی روپے پاتے تھے کہ زیادہ؟ بیس تو مرنے کے کچھ دن پہلے ہو گئے تھے۔ آخر کنبہ کی پرورش کرتے تھے کہ نہیں؟ کبھی فاقوں کی نوبت نہیں آئی۔ موٹا مہین دن میں دو بار ضرور میسر ہو جاتا تھا۔ تمہاری تعلیم ہوئی۔ شادی ہوئی۔ کپڑے وغیرہ بھی آتے تھے۔ اللہ کے فضل سے بساط کے مطابق گہنے بھی بنتے تھے۔ وہ تو مجھ سے کبھی نہ پوچھتے تھے۔ کہاں سے روپے لاؤں؟ آخر کہیں سے لاتے ہی تو تھے۔

طاہر علی۔ پولیس کے محکمہ میں ہر طرح کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہاں کیا ہے؟ گنی بوٹیاں۔ پتا شوربا۔

زینب۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو دکھا دیتی کہ اسی نوکری میں کیسے سونا برستا ہے۔ سینکڑوں چمار ہیں۔ کیا کہو تو ایک ایک گٹھا لکڑی کا نہ لائیں؟ سبوں کے یہاں چھان چھپر پر ترکاریاں لگی ہوں گی۔ کیوں نہیں توڑوا منگاتے؟ کھالوں کی قیمت میں بھی کمی بیشی کرنے کا تمہیں اختیار ہے۔ کوئی یہاں بیٹھا دیکھ نہیں رہا ہے۔ دس کے پونے دس لکھ دو تو کیا ہرج ہو؟ روپوں کی رسیدوں پر انگوٹھے کا نشان ہی نہ بنواتے ہو۔ نشان پکارنے جاتا ہے کہ میں دس ہوں یا پونے دس؟ پھر اب تمہارا اعتبار جم گیا۔ صاحب کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آخر اس اعتبار سے کچھ اپنا فائدہ بھی تو ہو کہ ساری عمر دوسروں ہی کا پیٹ بھرتے رہو گے؟ اس وقت بھی تمہاری تحویل میں سینکڑوں روپے ہوں گے۔ جتنی ضرورت سمجھو اس وقت نکال لو۔ جب ہاتھ میں روپے آئیں تو رکھ دینا۔ روزانہ آمدنی کا میزان ہی ملنا چاہئے نا؟ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آج کھال کا دام نہ دیا۔ کل دیا۔ اس میں کیا تردد ہے۔ چمار کہیں فریاد کرنے نہ جائے گا۔ کبھی ایسا

کرتے ہیں اور اسی طرح دنیا کا کام چلتا ہے۔ ایمان دُرست رکھنا ہو تو انسان کو چاہیئے کہ فقیر ہو جائے۔

رقیہ۔ بہت ایمان ہے کہاں؟ دنیا کا کام تو اسی طرح چلتا ہے۔

طاہر علی۔ بھئی جو لوگ کرتے ہیں۔ وہ جانیں۔ میری تو ان ہتھکنڈوں سے روح فنا ہوتی ہے۔ امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ آخر خدا کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔ جیسی بھی اُس کی مرضی ہو۔ زندہ رکھے یا مار ڈالے۔

زینب۔ واہ رے مردُوئے۔ قربان جاؤں تیرے ایمان پر۔ تیرا ایمان سلامت رہے چاہے گھر والے بھوکوں مر جائیں۔ تمہاری منشاء یہی ہے کہ یہ سب مُنہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جائیں۔ بس اور کچھ نہیں۔ فکر تو آدمی کو اپنے بیوی بچوں کی ہوتی ہے۔ اُن کے لئے بازار موجود ہی ہے۔ فاقہ تو ہمارے لئے ہے۔ اُن کا فاقہ تو محض تماشہ ہے۔

طاہر علی نے اس الزام بیجا پر مغموم ہو کر کہا — کیوں جلاتی ہو اچھی جان؟ خدا گواہ ہے جو بچے کے لئے دھیلے کی بھی کوئی چیز لی ہو۔ میری نیت تو کبھی ایسی نہ تھی نہ ہے اور نہ ہوگی۔ یوں تمہاری طبیعت ہے جو چاہے سمجھو۔

رقیہ۔ دونوں بچے رات بھر تڑپتے رہے۔ "اماں روٹی۔ اماں روٹی! "پوچھو اماں کیا آپ روٹی بن جائے۔ تمہارے بچے اور نہیں تو اور سسر کے گھر چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے کچھ کھا پی آتے ہیں۔ یہاں تو میری جان ہی کھاتے ہیں۔

زینب۔ اپنے بال بچوں کو کھلانے نہ کھلانے کا تمہیں اختیار ہے۔ کوئی تمہارا حساب لینے والا تو ہے نہیں۔ خواہ زردہ کھلاؤ خواہ بھوکا رکھو۔ ہمارے بچوں کو تو گھر کی رُوکھی سُوکھی روٹیوں کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ یہاں کوئی دل نہیں ہے جو فاقوں سے زندہ رہے۔ جا کر کچھ انتظام کرو۔

طاہر علی باہر آ کر بڑی دیر تک متفکر کھڑے رہے۔ آج پہلی مرتبہ انہوں نے امانت کے روپیوں کو ہاتھ لگانے کی جراٗت کی۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی کھڑا

تو نہیں ہے۔ پھر بہت آہستگی کے ساتھ آہنی صندوق کو کھولا۔ یوں دن میں سیکڑوں بار وہی صندوق کھولتے اور بند کرتے تھے مگر اس وقت اُن کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آخر اُنہوں نے روپے نکال لئے۔ پھر صندوق کو بند کر دیا۔ روپے لاکر زینب کے سامنے پھینک دئے اور بغیر کچھ کہے باہر چلے گئے۔ اپنے دل کو یوں سمجھایا۔ "اگر خدا کو منظور ہوتا کہ میرا ایمان سلامت رہے تو کیوں اتنے آدمیوں کا بوجھ میرے سر پر ڈالتا۔ یہ بوجھ سر پر رکھا تھا تو اس کے اُٹھانے کی طاقت بھی تو دینی چاہئے تھی۔ میں خود فاقے کر سکتا ہوں پر دوسروں کو تو مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر اس مجبوری کی حالت میں خدا مجھے سزا کے قابل سمجھے تو وہ منصف ہی نہیں ہے۔" اس دلیل سے انہیں کچھ تسکین ہوئی۔ لیکن مسٹر جان سیوک تو اس دلیل سے مان جانے والے آدمی نہ تھے۔ طاہر علی سوچنے لگے۔ کون چمار سب سے موٹا ہے جسے آج روپے نہ دوں تو چیں چپڑ نہ کرے۔ انہیں موٹے آدمی کے روپے روکنا مناسب نہیں کیونکہ وہ نڈر ہوتے ہیں۔ جو سب سے غریب سب سے سیدھا ہو اُسی کے روپے روکنا چاہئے۔ اس میں کوئی خوف نہیں ہے۔ چپکے سے بُلا کر انگوٹھے کا نشان بنوالوں گا۔ اس کی ہمت ہی نہ پڑے گی کہ کسی سے کہے۔ اُس دن سے انہیں جب ضرورت پڑتی تحویل سے روپے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔ رفتہ رفتہ روپوں کو پورا کر دینے کا خیال کم ہونے لگا۔ تحویل کے روپوں میں کمی واقع ہونے لگی۔ دل مضبوط ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ چھٹا مہینہ گزرتے گزرتے وہ تحویل کے پورے ڈیڑھ سو روپے صرف کر چکے تھے۔

اب طاہر علی کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ چماروں سے خوشامد آمیز باتیں کرتے مگر کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتے تھے کہ تحویل میں ان روپوں کا پتہ نہ چلے۔ لیکن بہی کھاتہ میں ردّ و بدل کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ گھر میں بھی کسی سے یہ بات نہ کہتے۔ بس خدا سے یہی دعا کرتے کہ ماہر علی آجائیں۔ "انہیں سو روپے ماہوار ملیں گے دو ماہ میں ادا کر دوں گا۔ اتنے دن

صاحب حساب کی جانچ کریں تو پھر بڑا پاپ ہے۔

اُنہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب کچھ ہی ہو مگر اوپر روپے نہ نکالوں گا لیکن ساتویں مہینہ پھر پچیس روپے نکالنے پڑے۔ اب ماہر علی کا سال بھی پورا ہونے کو تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کی کسر رہتی تھی۔ سوچا آخر مجھے اُسی کی بدولت تو یہ زیر باری ہو رہی ہے۔ جیوں ہی آیا میں نے گھر اُسے سونپا۔ کہہ دوں گا "بھائی! اتنے دنوں تک میں نے سنبھالا۔ جو کچھ بن پڑا تمہاری تعلیم میں صرف کیا۔ تمہیں برسرِ روزگار کر دیا۔ اب کچھ دنوں کے لئے مجھے اس فکر سے نجات دو۔" اُس کے آنے تک یہ پردہ ڈھکا رہ جائے تو پھر دُم جھاڑ کر نکل بھاگوں گا۔

پہلے وہ ایسی ہی کوئی ضرورت پڑنے پر صاحب کے یہاں جاتے تھے۔ اب دن میں ایک بار اُن سے ضرور ہی ملتے۔ ملاقاتوں سے اُن کے شک کو دبا ہوا رکھنا چاہتے تھے۔ جس چیز سے ٹکر لینے کا خوف ہوتا ہے اُس سے ہم اور بھی زیادہ چمٹ جاتے ہیں۔ کلثوم ان سے بار بار پوچھتی کہ آج کل تم اتنے روپے کہاں پا جاتے ہو؟ سمجھاتی۔ "دیکھو نیت خراب نہ کرنا۔ تکلیف اور تنگی سے بسر کرنا اتنا بُرا نہیں ہے جتنا خدا کے سامنے گنہگار بننا۔" لیکن طاہر علی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے بہلا دیا کرتے تھے۔

ایک روز صبح کو طاہر علی نماز سے فارغ ہو کر دفتر میں آئے تو دیکھا کہ ایک چمار کھڑا رو رہا ہے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ بولا "کیا بتاؤں کھاں صاحب۔ رات گھر والی گُزر گئی۔ اب اُس کا کریا کرم کرنا ہے۔ میرا جو کچھ حساب ہو دے دیجئے۔ دوڑا ہوا آیا ہوں۔ کفن کے لئے بھی روپیہ پاس نہیں ہے۔" طاہر علی کی تحویل میں روپے کم تھے۔ کل اسٹیشن سے مال روانہ کیا تھا۔ محصول ادا کرنے میں روپے خرچ ہو گئے تھے۔ آج صاحب کے سامنے حساب پیش کر کے روپیہ لانے والے تھے۔ اُنہیں اس چمار کو کئی کھالوں کی قیمت دینی تھی۔ کوئی بہانہ نہ کر سکے۔ کچھ روپے لا کر اُسے دئے۔

چمار نے کہا۔ ہجور۔ اتنے میں تو کبھی بھی پورا نہ ہوگا۔ مرنے والی اب پھر سے تو آئے گی نہیں۔ اس کا کریا کرم تو دل کھول کر کر دوں۔ میرے جتنے روپے آتے ہیں۔ سب دے دیجئے۔ یہاں تو جب تک دس بوتل دارو نہ ہوگی۔ لہاس (لاش) دَروَتے سے نہ اٹھے گی۔

طاہر علی نے کہا۔ اس وقت روپے نہیں ہیں۔ پھر لے جانا۔

چمار۔ واہ کہاں صاحب واہ۔ انگوٹھے کا نسان کرلئے تو مہینوں ہو گئے۔ اب کہتے ہو پھر لے جانا۔ اس بکھت نہ دوگے تو کیا میرے مرنے پر دوگے؟ چاہیئے تو یہ تھا کہ اپنی طرپھ سے کچھ مدد کرتے۔ اُلٹے میرے ہی روپے باقی رکھتے ہو۔

طاہر علی کچھ روپے اور لائے۔ چمار نے سب روپے زمین پر پٹک دئے۔ اور بولا۔ آپ تھوک سے چوہیا جِلاتے ہیں! میں آپ سے اُدھار نہیں مانگتا۔ کھیرات نہیں مانگتا۔ اپنے روپے مانگتا ہوں اور آپ یہ کنجوسی کر رہے ہیں مانو گھر سے دے رہے ہوں۔

طاہر علی نے کہا۔ اس وقت اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

چمار تھا تو سیدھا مگر اُسے کچھ شبہ ہو گیا۔ وہ گرم ہو پڑا۔ اتفاقاً اُسی وقت مسٹر جان سیوک بھی آ پہنچے۔ وہ آج بہت جھلائے ہوئے تھے۔ پربھو سیوک کی مجبوری نے اُنہیں بے قابو سا کر دیا تھا۔ اُنہوں نے یہ جھگڑا دیکھا تو تیز لہجہ میں بولے اس کے روپے کیوں نہیں دے دیتے؟ میں نے آپ سے تاکید کر دی تھی کہ سب آدمیوں کا حساب روز مرہ صاف کرا دیا کیجئے۔ آپ کیوں باقی رکھتے ہیں؟ کیا آپ کی تحویل میں روپے نہیں ہیں؟

طاہر علی روپے لانے چلے تو کچھ ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ صاحب کو فوراً شک ہو گیا۔ اُنہوں نے رجسٹر اٹھا لیا اور حساب دیکھنے لگے۔ حساب دیکھنے لگے۔ حساب صاف تھا۔ اس چمار کے روپے ادا ہو چکے تھے۔ اس کے انگوٹھے کا نشان موجود تھا۔ پھر یہ تقاضا کیسا؟ اتنے میں اور کئی چمار آ گئے۔ اس چمار کو روپے لے جاتے

دیکھا تو سمجھ آج حساب صاف کیا جا رہا ہے۔ بولے ـــ سرکار ہمارا بھی لیا جائے
صاحب نے رجسٹر کو زمین پر پٹک دیا اور جھڑک کر بولے ـــ یہ کیا معاملہ ہے؟
جب ان سے رسید لی گئی تو ان کے روپے کیوں نہیں دے گئے؟
طاہر علی سے اور کچھ تو نہ بن پڑا۔ صاحب کے قدموں پر گر پڑے اور رونے لگے۔ نقب میں بیٹھ کر آنکھیں دکھانے کے لئے بڑے مشاق آدمی کی ضرورت ہے۔
چماروں نے موقع کو تاڑ کر کہا ـــ سرکار ہمارا پچھلا کچھ نہیں ہے۔ ہم تو آج کے روپوں کے لئے کہتے ہیں۔ جرادیر ہوئی مال رکھ گئے رہتے۔ کہاں صاحب اس بھگت (وقت) نماج پڑھتے تھے۔

صاحب نے پھر رجسٹر اٹھا کر دیکھا تو انہیں کسی نام کے سامنے ایک ہلکا سا × کا نشان دکھائی دیا۔ سمجھ گئے حضرت نے یہی روپے اڑائے ہیں۔ ایک چمار سے جو بازار سے سگریٹ پیتا ہوا آ رہا تھا۔ پوچھا ـــ تیرا نام کیا ہے؟
چمار۔ جھنکو۔
صاحب۔ تیرے کتنے روپے باقی ہیں؟
کئی چماروں نے اسے ہاتھ کے اشارہ سے سمجھایا کہ کہہ دے کچھ نہیں۔
جھنکو نہ سمجھا اور بولا ـــ سترو روپے پہلے کے تھے تو آج کے۔

صاحب نے اپنی نوٹ بک پر اس کا نام درج کر لیا۔ طاہر علی کو کچھ بھی نہ کہا۔ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ جہاں قانون کی رُو سے اُسے سزا مل سکتی تھی۔ وہاں سخت سست کہنے کی کیا ضرورت؟ سب رجسٹروں کو اٹھوا کر گاڑی میں رکھا۔ دفتر میں قفل بند کیا۔ آہنی سیف میں ڈبل لاک لگائے۔ کنجیاں جیب میں رکھیں اور فٹن پر سوار ہو گئے۔ طاہر علی کو اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ کچھ منت سماجت کریں۔ زبان ہی بند ہو گئی۔ ساکت کھڑے رہ گئے۔ چماروں کے چودھری نے تشفی دی۔ آپ کیوں ڈرتے ہو کہاں صاحب۔ آپ کا بال تو بانکا ہونے نہ پائے گا۔ ہم کہہ دیں گے اپنے روپے بھر پائے ہیں۔ کیوں رے

چنگو۔ بڑا گنوار ہی ہے۔ اشارہ بھی نہیں سمجھتا؟
چنگو نے نادم ہو کر کہا — چودھری۔ بھگوان جانیں جو میں ذرا بھی اشارہ پا جاتا تو روپے کا نام ہی نہ لیتا۔

چودھری۔ اپنا بیان بدل دینا۔ کہہ دینا۔ مجھے جبانی حساب یاد نہیں تھا۔
چنگو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بیان بدلنا سانپ کے منہ میں انگلی دینا تھا۔

طاہر علی کی ان باتوں سے ذرا بھی تسکین نہیں ہوئی۔ وہ پچھتا رہے تھے۔ اس لئے نہیں کہ میں نے روپے کیوں خرچ کئے بلکہ اس لئے کہ ناموں کے سامنے کے نشانات کیوں قائم کئے۔ الگ کسی کاغذ پر نوٹ کر لیتا تو آج کیوں یہ نوبت آتی۔ اب خدا ہی خیر کرے۔ صاحب معاف کرنے والے آدمی نہیں ہیں۔ کچھ سوجھ ہی نہ پڑتا تھا کہ کیا کریں۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

چودھری بولا۔ کہاں صاحب۔ اب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا۔ یہ صاحب بڑا جلاد آدمی ہے۔ جلدی روپے جٹائیے۔ آپ کو یاد ہے کل کتنے روپے نکلتے ہوں گے؟

طاہر علی۔ روپوں کی فکر نہیں ہے جی۔ یہاں تو داغ لگ جانے کا افسوس ہے۔ کیا جانتا تھا کہ آج یہ آفت آنے والی ہے ورنہ پہلے ہی سے تیار نہ ہو جاتا۔ جانتے ہو کہ یہاں کارخانہ کا ایک نہ ایک آدمی قرض مانگنے کو سر پر سوار رہتا ہے۔ کس کس سے حیلہ کروں؟ اور پھر مروت میں حیلہ کرنے سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ روپے نکال کر دیتا ہوں۔ یہ اسی شرافت کی سزا ہے۔ ڈیڑھ سو سے کم نہ نکلیں گے بلکہ چاہے دو سو ہو گئے ہوں۔

چودھری۔ بھلا سرکاری رقم اس طرح خرچ کی جاتی ہے۔ آپ نے خرچ کی یا کسی کو ادھار دے دی۔ بات ایک ہی ہے۔ وہ لوگ روپے دے دیں گے؟

طاہر علی۔ ایسا کھرا تو ایک بھی نہیں۔ کوئی کہے گا۔ تنخواہ ملنے پر دوں گا۔

کوئی کچھ بہانہ کرے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

چودھری۔ گھر میں تو روپے ہوں گے؟

طاہر علی۔ ہونے کو کیا دو چار سو روپے نہ ہوں گے۔ مگر جانتے ہو کہ عورتوں کا روپیہ جان کے ساتھ رہتا ہے۔ خدا کو جو منظور ہے وہ ہوگا۔

یہ کہہ کر طاہر علی اپنے دو چار دوستوں کی طرف چلے کہ شاید یہ حال سُن کر لوگ میری کچھ مدد کریں۔ مگر کہیں نہ جا کر ایک درخت کے نیچے نماز پڑھنے لگے۔ کسی سے مدد کی اُمید نہ تھی۔

اِدھر چودھری نے چماروں سے کہا ــ بھائیو ہمارے منشی جی اس وقت تنگ ہیں۔ سب لوگ تھوڑی تھوڑی مدد کرو تو اُن کی جان بچ جائے۔ صاحب اپنے روپے ہی تو لیں گے کہ کسی کی جان لیں گے بس سمجھ لو کہ ایک دن نشہ نہ کیا۔

چودھری تو چماروں سے روپے وصول کر کے جمع کرنے لگا۔ طاہر علی کے دوستوں نے یہ حال سُنا تو چپکے ہی دبک رہے کہ کہیں طاہر علی کچھ مانگ نہ بیٹھیں۔ ہاں جب تیسرے پہر کو دار وغہ نے آکر تحقیقات کرنا شروع کی۔ اور طاہر علی کو حراست میں لے لیا تو یار لوگ بھی تماشہ دیکھنے آ پہنچے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ کلثوم نے جا کر زینب سے کہا ــ لیجئے اب تو آپ کا ارمان نکلا۔

زینب نے کہا۔ تم مجھ سے کیا بگڑتی ہو بیگم۔ ارمان نکلے ہوں گے تو تمہارے نہ نکلے ہوں گے تو تمہارے۔ میں نے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ جا کر کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالو۔ گلچھرے تم نے اُڑائے ہوں گے۔ یہاں تو روٹی دال کے سوا اللہ کسی کا کچھ نہیں جانتے۔

کلثوم کے پاس تو کفن کو کوڑی بھی نہ تھی۔ زینب کے پاس روپے تھے۔ مگر اُس نے دل جلانا ہی کافی سمجھا۔ کلثوم کو اس وقت طاہر علی سے ہمدردی نہ تھی۔ اُسے اُن پر غصّہ آرہا تھا جس طرح کسی کو اپنے بچے کو چاقو سے اُنگلی کاٹتے ہوئے دیکھ کر غصّہ آئے۔

شام ہو رہی تھی۔ طاہر علی کے لئے داروغہ نے ایک یکہ منگوایا۔ اُس پر چار کانسٹبل انہیں لے کر سوار ہوئے۔ داروغہ جانتا تھا کہ یہ ماہر علی کے بھائی ہیں۔ کچھ لحاظ کرتا تھا۔ چلتے وقت بولا کہ اگر آپ کو گھر میں کسی سے کچھ کہنا ہو تو آپ جا سکتے ہیں عورتیں گھبرا رہی ہوں گی۔ انہیں ذرا تسکین دیتے آئیے۔ مگر طاہر علی نے کہا مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ وہ کلثوم کو اپنی صورت نہ دکھانا چاہتے تھے۔ جیسے اُنہوں نے دیدہ و دانستہ تباہ کر دیا تھا اور اب بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے تھے۔ کلثوم دروازہ پر کھڑی تھی۔ اُس کا غصہ ہر لمحہ رنج کی شکل میں تبدیل ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب یکہ چلا تو وُہ غش کھا کر گر پڑی۔ بچے ابا ابا کہتے یکہ کے پیچھے دوڑے۔ داروغہ نے انہیں ایک ایک چوَنّی مٹھائی کھانے کو دے کر بہلا دیا۔ طاہر علی تو اُدھر حراست میں گئے۔ اِدھر گھڑی رات جاتے جاتے چماروں کا چودھری روپے لے کر مسٹر سیوک کے پاس پہنچا۔ صاحب بولے۔ یہ روپے تم اُن کے گھر والوں کو دے دو تو اُن کا گزر ہو جائے۔ معاملہ اب پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

چودھری۔ حضور۔ آدمی سے کھتا ہو ہی جاتی ہے۔ اتنے دنوں تک آپ کی چاکری کی۔ سرکار کو اُس پر کچھ دَیا کرنی چاہیئے۔ بڑا بھاری کرمہ (کنبہ) ہے۔ مالک۔ بال بچے بھوکوں مر جائیں گے۔

جان سیوک۔ میں یہ سب جانتا ہوں۔ بیشک اُن کا خرچ بہت تھا۔ اِسی لئے میں نے مال پر کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے مجبور ہو کر کیا ہے۔ لیکن زہر کسی نیت سے کھایا جائے وہ زہر ہی کا کام کرے گا۔ کبھی امرت نہیں ہو سکتا۔ دغا بازی زہر سے کم مہلک نہیں ہوتی۔ تم یہ روپے لے جا کر اُن کے گھر والوں کو دے دو۔ مجھے خانصاحب سے کوئی کینہ نہیں ہے۔ مگر اپنے اصول کو نہیں توڑ سکتا۔ گناہ کو معاف کرنا گناہ ہے۔

چودھری یہاں سے مایوس ہو کر چلا گیا۔ دوسرے دن مقدمہ پیش ہُوا۔

طاہر علی مجرم ثابت ہوئے۔ وہ اپنی صفائی نہ دے سکے۔ انہیں چھ ماہ کی سزا ہو گئی۔
جب طاہر علی کانسٹبلوں کے ساتھ جیل کی طرف جا رہے تھے تو انہیں ماہر علی تانگہ پر سوار آتا ہوا نظر پڑا۔ اُن کا دل بے اختیار اُمڈ آیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سمجھے کہ ماہر مجھ سے ملنے کو دوڑا ہوا چلا آ رہا ہے۔ شاید آج ہی آیا ہے۔ اور آتے ہی آتے یہ خبر سُن کر بیقرار ہو گیا ہے۔ جب تانگہ قریب آیا تو چیخ مار کر رو پڑے۔ ماہر علی نے ایک بار انہیں دیکھا لیکن نہ سلام کیا نہ تانگہ روکا۔ نہ پھر اُس طرف دیکھا۔ اپنا منہ پھیر لیا گویا دیکھا ہی نہیں۔ تانگہ طاہر علی کی بغل سے نکل گیا۔ طاہر علی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ ایک بار پھر چیخ کر رو دئے۔ وہ خوشی کا نعرہ تھا اور یہ غم کی فریاد۔ وہ آنسو کے قطرے تھے اور یہ خون کے!

لیکن ایک ہی لمحہ میں اُن کے دل کو تسکین ہو گئی۔ ماہر نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو گا۔ اس کی نگاہ میری طرف اُٹھی ضرور تھی مگر شاید وہ کسی خیال میں مستغرق تھا۔ ایسا ہوتا بھی تو ہے۔ کہ جب ہم کسی خیال میں محو ہوتے ہیں تو نہ سامنے کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور نہ قریب کی باتیں سُنائی دیتی ہیں۔ یہی سبب ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ اُس نے مجھے نہ دیکھا ورنہ ادھر مجھے ندامت ہوتی اُدھر اُسے رنج ہوتا۔
اُدھر ماہر علی مکان پر پہنچے تو چھوٹے بھائی آکر لپٹ گئے۔ طاہر علی کے دونوں بچے بھی دوڑے آئے اور "ماہر چچا آئے" کہہ کر اُچھلنے کودنے لگے۔ کلثوم بھی بھاگتی ہوئی نکل آئی۔ سلام بندگی کے بعد ماہر اپنی ماں کے پاس گئے۔ اُس نے اُنہیں سینہ سے لگا لیا۔

ماہر۔ تمہارا خط نہ گیا ہوتا تو ابھی میں تھوڑا ہی آتا۔ امتحان کے بعد ہی تو وہاں لطف آتا ہے۔ کبھی میچ۔ کبھی دعوت۔ کبھی سیر۔ کبھی مشاعرہ۔ بھائی صاحب کو یہ کیا حماقت سوجھی۔
زینب۔ بیگم صاحبہ کی فرمائشیں کیسے پوری ہوتیں۔ زیور چاہئے۔

زدوہ جاہیے۔ زری چاہیئے۔ کہاں سے آتا؟ اُس پر کہتی ہیں کہ جہیں لوگوں نے انہیں غارت کردیا۔ پوچھو۔ روکھی دال میں ایسا کون چھپن ٹکے کا خرچ تھا۔ مہینوں سر میں تیل ڈالنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ اپنے پاس سے پیسے نکالو تو پان کھاؤ۔ اُس پر آج یہ طعنے!

ماہر۔ میں نے تو اسٹیشن سے آتے ہوئے انہیں جیل جاتے دیکھا۔ میں تو شرم کے مارے ان سے کچھ نہ بولا۔ سلام تک نہ کیا۔ آخر لوگ یہی نہ کہتے کہ اُن کا بھائی قید خانہ جا رہا ہے۔ مُنہ پھیر کر چلا آیا۔ بھیا رو پڑے۔ میرا دل بھی مسوس اُٹھا۔ جی چاہتا تھا اُن کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ لیکن شرم دامنگیر ہوئی۔ تعلقدار کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ اُس کا شمار حکّام میں ہوتا ہے۔ اس بات کا خیال نہ کرونگا تو بدنام ہو جاؤں گا۔

زینب۔ چھ ماہ کی سزا ہوئی ہے۔

ماہر۔ جرم تو سنگین تھا مگر شاید حاکم نے رحم کیا۔

زینب۔ تمہارے ابا کا لحاظ کیا ہوگا۔ ورنہ تین سال سے کم کے لئے نہ جاتے۔

ماہر۔ خاندان میں داغ لگا دیا۔ بزرگوں کی آبرو خاک میں ملا دی۔

زینب۔ خدا نہ کرے کہ کوئی مرد عورت کا کلمہ پڑھے۔

اتنے میں ماما ناشتہ کے لئے مٹھائیاں لائی۔ ماہر علی نے ایک مٹھائی طاہر کو دی اور ایک جابر کو۔ ان دونوں نے جاکر صابر اور نسیمہ کو دکھائی۔ وہ دونوں بھی کھڑے تھے۔ زینب نے کہا۔ "جاؤ کھیلتے کیوں نہیں؟ کیا سر پہ ٹوٹ گئے۔ نہ جانے کہاں کے مرتھُوکے چھوکرے ہیں۔ ان سبھوں کے مارے کوئی چیز منہ میں ڈالنی مشکل ہے۔ بلا کی طرح سر پہ سوار ہو جاتے ہیں۔ رات دن کھاتے ہی رہتے ہیں پھر بھی اُن کا جی نہیں بھرتا۔

رقیہ۔ بیچاری ماں کے بچے اداس ہوں گے کیسے؟

ماہر نے ایک ایک مٹھائی ان دونوں کو بھی دی۔ پھر بولے — اب گزر بسر کی کیا صورت ہوگی؟ بھابی کے پاس تو روپے ہوں گے نا؟

زینب۔ ہوں گے کیوں نہیں۔ انہیں روپوں کے لئے تو ڈھونسہ کو جیل بھیجا۔ دیکھتی ہوں۔ کیا انتظام کرتی ہیں۔ یہاں کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ پوچھنے جائے۔

ماہر۔ مجھے ابھی نہ جانے کتنے دنوں میں جگہ ملے۔ مہینہ بھر لگ جائے۔ دو مہینے لگ جائیں۔ جب تک مجھے تنگ مت کرنا۔

زینب۔ تم اس کا غم نہ کرو بیٹا۔ وہ اپنا سنبھالے۔ ہمارا بھی خدا حافظ ہے۔ وہ زردہ کھا کر سوئیں گی تو ہمیں بھی روکھی روٹیاں میسر ہو جائیں گی۔

جب شام ہو گئی تو زینب نے ماما سے کہا۔ جا کر بیگم صاحب سے پوچھو کچھ سودا سلف آئے گا یا آج ماتم منایا جائے گا؟ ماما نے واپس ہو کر کہا۔ وہ تو بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ جسے بھوک ہو وہ کھائے مجھے نہیں کھانا ہے۔

زینب۔ دیکھا یہ تو میں پہلے ہی کہتی تھی کہ صاف جواب ملے گا۔ جانتی ہے کہ لڑکا پردیس سے آیا ہے مگر پیسے نہ نکلیں گے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے بازار سے کھانا منگوا لے گی۔ دوسرے کھائیں یا مریں اس کی بلا سے۔ جبرا نہیں اُن کے بیٹھے نوالے مبارک ہوں۔ ہمارا بھی اللہ مالک ہے۔

کلثوم نے جب سے سُنا تھا کہ طاہر علی کو چھ ماہ کی سزا ہو گئی تبھی سے اُس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ ماما پیغام لائی۔ تو وہ سُن کر جل اٹھی۔ بولی: ۔ ان سے کہہ دو کہ پکائیں کھائیں۔ یہاں بھوک نہیں ہے۔ بچوں پر ترس آئے تو دو نقمے اُنہیں بھی دے دیں۔

ماما نے ان ہی فقرات کا خلاصہ کہا تھا جس سے یہ گڑبڑ ہوئی۔

رات کو نو بج گئے۔ کلثوم دیکھ رہی تھی کہ چولھا گرم ہے۔ مصالحہ جات کی خوشبو آ رہی تھی۔ بگھار کی آواز بھی سُنائی دیتی تھی۔ لیکن جب بڑی دیر تک کوئی اس کے بچوں کو بلانے نہ آیا تو ڈاڑھیں مار کر رونے لگی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ گھر والوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب میں بیکس ہوں۔ دُنیا میں کوئی میرا نہیں ہے۔ دونوں بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ انہیں کے پاس بیٹھے وہ بھی

بیٹھی ہی۔ یا اللہ! یہ دو دو بچے اور پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ گھر کے آدمیوں کا یہ حال ہے ناؤ کیسے پار لگے گی۔

ماہر علی دستر خوان پر بیٹھے تو ماما سے پوچھا۔ بھابھی نے بھی کچھ بازار سے منگوایا ہے یا نہیں؟

زینب۔ ماما سے منگوائیں گی تو پردہ ہی فاش ہو جائے گا۔ خدا کے فضل سے صاحب سیانا ہوا ہے۔ گپ چپ کے سودے وہی لاتا ہے۔ اور ایسا گھاگھ ہے کہ لاکھ پھسلانے پر بھی منہ نہیں کھولتا۔

ماہر علی۔ پوچھ لینا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم لوگ کھا پی کر سوئیں اور وہ بیچاری روزہ سے رہ جائیں۔

زینب۔ ایسی اَنیلی نہیں ہیں۔ وہ ہم جیسوں کو چرا لائیں۔ ہاں پوچھنا میرا فرض ہے پوچھ لوں گی۔

رقیہ۔ سالن اور روٹی کیس جلنے کھائیں گی۔ انہیں تو زردہ اور شیر مال چاہیے۔

دوسرے روز دونوں بچے سویرے ہی باورچی خانہ میں گئے تو زینب نے ایسی کڑوی نگاہوں سے دیکھا کہ بس روتے ہی لوٹ آئے۔ اب کلثوم سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ جھلا کر اٹھی اور باورچی خانہ میں جا کر ماما سے بولی۔ تو نے بچوں کو کھانا کیوں نہیں دیا رے؟ کیا اتنی جلد کایا پلٹ ہو گئی؟ اسی گھر کے پیچھے ہم مٹی میں مل گئے اور آج میرے بچے بھوکوں کے مارے تڑپیں۔ کسی کو ترس نہ آئے۔

ماما نے کہا۔ تو آپ مجھ سے کیا بگڑتی ہیں؟ میں کون ہوتی ہوں؟ جیسا حکم پاتی ہوں ویسا کرتی ہوں۔

زینب اپنے کمرے سے بولی۔ تم مٹی میں مل گئیں تو یہاں کس نے گھر بھر لیا؟ کل تک کچھ نا کچھ بیٹھا جاتا وہ بھی تم نے توڑ دیا۔ بھنڈے کے یہاں سے اور دھار عقل آئی جب کہیں منہ میں داب گیا۔ سو کوس سے لڑکا آیا۔ تم نے بات تک نہ پوچھی۔ تمہاری ستم کوئی کہاں تک بیان کرے۔

آج سے کلثوم کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ ماہر علی کبھی دونوں بھائیوں کو لے کر نانبائی کی دوکان سے کھانا کھا آتے۔ کبھی کسی دوست آشنا کے مہمان ہو جاتے۔ زینب اور رقیہ کے لئے ماما چپکے چپکے اپنے گھر سے کھانا بنا لاتی۔ گھر میں چولھا نہ جلتا۔ قسیم اور صابر علی الصباح گھر سے نکل جاتے اور کوئی کچھ دے دیتا۔ تو کھا لیتے۔ زینب اور رقیہ کی صورت سے ایسا ڈرتے تھے جیسے چوہا بلی سے۔ ماہر کے پاس بھی نہ جاتے۔ بچے دوست اور دشمن کو خوب پہچانتے ہیں۔ اب وہ پیار کے بھوکے نہیں رحم کے بھوکے تھے۔ رہی کلثوم سو اس کے لئے تو غم ہی کافی تھا۔ وہ سینا پرونا جانتی تھی۔ چاہتی تو سلائی کر کے اپنا گزارہ کر لیتی پر جلن کے مارے کچھ نہ کرتی تھی۔ وہ ماہر کے منہ میں کالکھ لگانا چاہتی تھی کہ دنیا میری حالت دیکھے اور ان پر تھوکے۔ غصے اب طاہر علی پر بھی غصہ آتا تھا۔ تم اسی قابل تھے کہ جیل میں پڑے پڑے چکی پیسو۔ اب آنکھیں کھلیں گی۔ تم کو دنیا کے سامنے ننگا کر دیا۔ اب دنیا کسی پر ہنستی نہیں۔ لوگ مزے سے میٹھے ٹکڑے اڑاتے اور میٹھی نیند سوتے ہیں۔ یہ کسی کو بھی تو نہیں دیکھتی کہ چھوٹوں ہی ذرا ان کو دھتکار ضرور کی فضیحت کرے۔ کسی کو غرض ہی کیا پڑی ہے کہ کسی پر ہنسے۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ایسے کوتاہ اندیش عیالداروں کی یہی سزا ہے۔

یوں طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز سبھاگی کلثوم کے یہاں ساگ بھاجی لے کر آئی۔ وہ اب سبزی فروشی کا کام کرتی تھی۔ کلثوم کی صورت دیکھی تو بولی۔ بہو جی۔ تم تو پہچانی نہیں جاتیں۔ کیا کڑھ کڑھ کر جان دے دوگی؟ بہت تو پڑھی ہے۔ کڑھنے سے کیا ہوگا؟ مثل ہے آندھی آئے بیٹھ گنوائے۔ تم نہ رہوگی تو بچوں کو کون پالے گا؟ دنیا کتنی جلد اندھی ہو جاتی ہے۔ بچارے کھاں صاحب انہیں لوگوں کے لئے مرتے تھے۔ اب کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ گھر گھر یہی چرچا ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ بھگوان کو کیا منہ دکھائیں گے۔

کلثوم۔ اب تو بھاڑ لیپ کر برا کالا ہو گیا۔

سُبھاگی۔ بہو کوئی مُنہ پر بھلے نہ کہے پر سب تھوڑی تھوڑی کرتے ہیں۔ بچارے ننھے ننھے لڑکے مارے مارے پھرتے ہیں۔ دیکھ کر کلیجہ پھٹتا ہے۔ کل تو چودھری نے ماہر میاں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

کلثوم کو اِن باتوں سے بڑی تسکین ہوئی۔ دُنیا ان لوگوں کو تھوکتی تو ہے۔ اُن کی بُرائی تو کرتی ہے۔ ان بیحیاؤں کو لاج ہی نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ بولی۔ کس بات پر؟ سُبھاگی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ باہر سے چودھری نے پُکارا۔ سبھاگی نے جاکر پُوچھا۔ کیا کہتے ہو؟

چودھری۔ بہو جی سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا پردے کی اُوٹ میں کھڑی ہو جائیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ زینب اور رقیہ کسی ولی کے مزار پر شیرینی چڑھانے گئی ہوئی تھیں۔ کلثوم پردہ کی آڑ میں آکر کھڑی ہو گئی۔

چودھری۔ بہو جی۔ کئی دن سے آنا چاہتا تھا۔ مگر موقع ہی نہ ملتا تھا۔ جب آتا تو ماہر میاں کو بیٹھے دیکھ کر لوٹ جاتا تھا۔ کل ماہر میاں مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے بھیا کی مدد کے لئے جو روپے جمع کئے تھے وہ مجھے دے دو۔ بھابھی نے مانگے ہیں۔ میں نے کہا کہ جب تک بہو جی سے خود نہ پُوچھ لوں گا آپ کو نہ دُوں گا۔ اس پر بہت بگڑے۔ کچی پکی منہ سے نکالنے لگے۔ "سمجھ لوں گا۔ بُرے گھر بھجوا دوں گا"۔ میں نے کہا۔ "جائیے۔ سمجھ لیجئے گا"۔ تو اب آپ کا کیا حکم ہے؟ وے سب روپے ابھی تک میرے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کو دے دُوں نا؟ مجھے تو آج معلوم ہُوا کہ وہ سب آپ کے ساتھ دگا کر گئے۔

کلثوم نے کہا۔ خدا تمہیں اِس نیکی کا ثواب دے گا۔ مگر یہ روپے جس کے ہوں انہیں واپس کر دو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔

چودھری۔ کوئی نہ لوٹائے گا۔

کلثوم۔ تو تمہیں اپنے پاس رکھو۔

چودھری۔ آپ لیتی کیوں نہیں؟ ہم کوئی احسان تھوڑے جتاتے ہیں۔

کھاں صاحب کی بدولت بہت کچھ کمایا کھایا ہے۔ دوسرا منشی ہوتا تو ہزاروں روپے نجرے لیتا۔ یہ انہیں کی نجر سمجھی جائے۔

چودھری نے بہت اصرار کیا مگر کلثوم نے روپے نہ لئے۔ وہ ماہر علی کو دکھانا چاہتی تھی کہ جن روپوں پر تم کتوں کی طرح لپکے تھے انہیں روپوں کو میں نے پیر سے ٹھکرا دیا۔ میں لاکھ گئی گزری ہوں پھر بھی مجھ میں کچھ غیرت باقی ہے۔ تم مرد ہو کر بےحیائی پر کمر باندھے ہوئے ہو۔

چودھری یہاں سے چلا تو شبھاگی سے بولا۔ یہی بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں۔ چاہے ٹکڑے ٹکڑے اڑ جائیں، مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پساریں گی۔ ایسا نہ ہوتا تو چھوٹے بڑے میں پھر ک ہی کیا رہتا۔ دھن سے بڑائی نہیں ہوتی۔ دھرم سے ہوتی ہے۔

ان روپوں کو لوٹا کر کلثوم کا سر غرور سے اونچا ہو گیا۔ آج اسے پہلی مرتبہ طاہر علی پر ناز ہوا۔ یہ عزت ہے کہ پیٹھ پیچھے دنیا بڑائی کرتی ہے۔ اس بےعزتی سے تو مر جانا ہی اچھا کہ چھوٹے چھوٹے آدمی منہ پر فضیحت کریں۔ کوئی لاکھ ان کے احسان کو مٹائے پر دینا تو انصاف کرتی ہے۔ روز ہی تو عملے سزا پاتے رہتے ہیں۔ کوئی تو ان کے بال بچوں کی بات نہیں پوچھتا بلکہ الٹے اور لوگ طعنے دیتے ہیں۔ آج ان کی نیک نامی نے میرا سر اونچا کر دیا۔

شبھاگی نے کہا۔ بہو جی۔ بہت عورتیں دیکھیں پر تم جیسی دھیرج والی برلی ہی کوئی ہوگی۔ بھگوان تمہارا سنکٹ ہریں۔

جانے لگی تو اس نے کئی امرود بچوں کے لئے رکھ دئے۔ کلثوم نے کہا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

شبھاگی مسکرا کر چلی گئی۔

(۳۷)

پربھو سیوک نہایت مستعد آدمی تھے۔ ان کی حوصلہ مندیوں کی بدولت سیوا سمتی

میں جان سی پڑ گئی۔ ممبروں کی تعداد میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ جو لوگ کاہل اور بے پرواہ سے ہو رہے تھے۔ وہ پھر نئے جوش سے کام کرنے لگے۔ پربھو سیوک کی شرافت اور نیک دلی سب کو فریفتہ کر لیتی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی اب اُن میں وہ مستعدی نظر آتی تھی جس کی اُنہیں خود اُمید نہ تھی۔ سیوا سمتی کے عموماً سبھی لوگ قابل اور تعلیم یافتہ تھے۔ وہ سمتی کو ترقی دینے کے لئے کسی نئی تجویز سے کام لینا چاہتے تھے۔ وہ جاہل سپاہیوں کی فوج نہ تھی جو افسر کے حکم کو حکم خدا مانتی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ فوج تھی۔ جو افسر کے حکم پر غور کرتی ہے۔ اُسے ہر پہلو سے جانچتی ہے اور جب تک اُس کے جواز کی قائل نہ ہو جائے اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ پربھو سیوک بڑی ہوشیاری سے اس مشکل کام کو آگے بڑھانا شروع کیا۔

اب تک اس جماعت کا کام صرف سوشل تھا۔ میلوں تماشاؤں میں جانے والوں کی مدد کرنا۔ باڑھ کے مارے ہوؤں کو بچانا۔ مصیبت زدہ عوام کی تکلیف رفع کرنا یہی اُن کے خاص کام تھے۔ پربھو سیوک نے سمتی کے دائرہ عملی کو وسیع کر دیا۔ اُسے سیاسی شکل دے دی۔ اگرچہ اُنہوں نے کوئی نئی تجویز نہیں پیش کی۔ کسی تبدیلی کا تذکرہ تک نہ کیا۔ مگر رفتہ رفتہ ان کی شخصیت کے اثر سے نئی باتوں کا آغاز ہونے لگا۔

پربھو سیوک نہایت خلیق آدمی تھے مگر کسی کو غریبوں پر ظلم کرتے دیکھ کر اُن کا اخلاق تشدد آمیز ہو جاتا تھا۔ کسی سپاہی کو گھسیاروں کی گھاس چھینتے دیکھ کر وہ فوراً گھسیاروں کی طرف سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ آفات ارضی و سماوی سے عوام کی حفاظت کرنا اُنہیں بے سود سا معلوم ہوتا تھا۔ زبردستوں کے ظلم ہی پر اُن کی خاص نگاہ رہتی تھی۔ رشوت خور اہلکاروں پر ظالم زمینداروں پر خود غرض حکام پر۔ وہ ہمیشہ تاک لگائے رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں اس جماعت کی دھاک بیٹھ گئی۔ اُن کا دفتر کمزوروں اور مصیبت زدوں کی جائے پناہ بن گیا۔ پربھو سیوک کمزوروں کو مقابلہ کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ اُن کا قول تھا۔ کہ جب تک عوام خود ہی اپنی حفاظت کرنا نہ سیکھیں گے۔ ایشور بھی انہیں ظلم سے

نجات نہیں دے سکتا۔

ہمیں سب سے پہلے اپنی خودداری کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ ہم بزدل اور ڈرپوک ہو گئے ہیں۔ ذلت اور نقصان چپکے سے برداشت کر لیتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کو تو بہشت میں بھی آرام نہیں مل سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم بے خوف اور جری بنیں۔ مصائب کا مقابلہ کریں۔ مرنا سیکھیں۔ جب تک ہمیں مرنا نہ آئیگا۔ جینا بھی نہ آئے گا۔ پربھو سیوک کے لیے مظلوموں کی حفاظت کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بن جانا اس سے کہیں زیادہ آسان تھا کہ وہ کسی مریض کے سرہانے بیٹھا پنکھا جھلے یا قحط زدوں کو غلہ اور روپیہ تقسیم کرتا پھرے۔ اُس کے رفیقوں کو بھی اس قسم کی مردانہ خدمت کرنے کا زیادہ شوق تھا۔ کچھ لوگ تو اس سے بھی زیادہ کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عوام میں بدامنی پیدا کرنا بھی والنٹیروں کا خاص فرض ہے۔ اندردت اس غول کا سرغنہ تھا اور اُسے نرم رکھنے کے لئے پربھو سیوک کو نہایت ہوشیاری سے کام کرنا پڑتا تھا۔

لیکن جیوں جیوں یہ جماعت مشہور اور ہر دلعزیز ہوتی گئی۔ اس پر حکام کا شُبہ بھی زیادہ بڑھتا گیا۔ اب کنور صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں سرکار اس جماعت کا تشدد سے خاتمہ نہ کر دے۔ کچھ دنوں میں یہ افواہ بھی گرم ہوئی کہ حکام میں کنور صاحب کی ریاست کو ضبط کرنے کا چرچا ہو رہا ہے۔ کنور صاحب بے خوف آدمی تھے مگر یہ افواہ سُن کر اُن کی طبیعت بھی ڈانوا ڈول ہو گئی۔ وہ ثروت سے حظ نہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مگر ثروت کی خواہش کو ترک نہ کر سکتے تھے۔ اُن کو دوسروں کی بھلائی کرنے میں اُس سے کہیں زیادہ خوشی ملتی تھی جتنی کہ نفس پرستی میں۔ بھلائی کرنے میں عزت تھی۔ وہ عزت ہی نہ رہی تو جینے میں کیا مزہ رہا۔ وہ پربھو سیوک کو بار بار سمجھاتے ـــــ بھئی ذرا سوچ سمجھ کر کام کرو۔ حکام سے بچ کر چلو۔ ایسے کام ہی کیوں کرو۔ جن سے حکام کو تم پر شُبہ ہو۔ تمہارے لئے رفاہِ عام کا میدان کیا کم ہے کہ سیاسی جھگڑوں میں پڑو؟ ـــ لیکن پربھو سیوک

اُن کے مشورہ کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ دھمکاتے تھے کہ استعفیٰ دے دوں گا۔ ہمیں حکام کی کیا پرواہ؟ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ہم سے کچھ نہیں پوچھتے۔ پھر ہمیں کیوں اُن کا رُخ دیکھ کر کام کریں؟ ہم اپنے مجوزہ راستہ سے منحرف نہ ہوں گے۔ حکام کا جو جی چاہے کریں۔ خودداری کے احساس کو مٹا کر سمتی کو زندہ بھی رکھا تو کیا۔ ان کا رُخ دیکھ کر کام کرنے کا مطلب تو یہی ہے کہ ہم کھائیں پئیں۔ مقدمہ بازی کریں۔ ایک دوسرے کا بُرا چیتیں اور پڑے پڑے سوئیں۔ ہمارے اور اُن کے اغراض میں اختلاف ہے جس سے ہمارا فائدہ ہے اُس سے اُن کا نقصان ہے۔ اور ایسی حالت میں ان کا بدگمان ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ اگر ہم لوگ اس طرح ڈرتے رہیں گے تو پھر ہمارا عدم و وجود برابر ہے۔

ایک روز دونوں آدمیوں میں بحث کی نوبت آگئی۔ بندوبست کے حکام نے کسی صوبہ میں آراضی کا محصول اپنے حسب دلخواہ بڑھا دیا تھا۔ کاؤنسلوں اخباروں اور سیاسی جلسوں میں اس اضافہ کی مخالفت کی جا رہی تھی۔ مگر حکام متعلقہ پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ پریموسیوک کی رائے تھی کہ ہمیں جاکر اسامیوں سے کہنا چاہئے کہ سال بھر تک زمین کو پرتی پڑی رہنے دیں۔ کنور صاحب کہتے تھے کہ یہ کھلم کھلا حاکموں سے بیر مول لینا ہے۔

پریموسیوک۔ اگر آپ اتنا ڈر رہے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ اس جماعت کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ دو کشتیوں پر بیٹھ کر دریا کو عبور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ مجھے رئیسوں پر پہلے بھی اعتبار نہ تھا اور اب تو بالکل ہی مایوس ہو گیا ہوں۔

کنور۔ تم میرا شمار رئیسوں میں کیوں کرتے ہو۔ جب تمہیں خوب معلوم ہے کہ مجھے ریاست کی پرواہ نہیں ہے؟ لیکن کوئی کام روپیہ کے بغیر تو نہیں چل سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ دیگر قومی انجمنوں کی طرح اس انجمن کو بھی روپیہ کی کمی کے سبب ہم ٹوٹتا پھوٹتا دیکھیں۔

پربھو سیوک۔ میں بڑی سے بڑی جائداد کو بھی اصول پر قربان کر دینے سے دریغ نہ کروں گا۔

کنور۔ میں بھی نہ کرتا اگر جائداد میری ہوتی۔ لیکن جائداد میرے ورثا کی ہے۔ اور مجھے کوئی مجاز نہیں ہے کہ میں بلا اُن کی مرضی جائداد کو تلف کردوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اعمال کا خمیازہ میرے ورثا کو اٹھانا پڑے۔

پربھو سیوک۔ یہ روساء کی پرانی دلیل ہے۔ وہ اپنی ثروت پسندی کو اسی پردہ کی آڑ میں چھپایا کرتے ہیں۔ اگر آپ کو خوف ہے کہ ہمارے کاموں سے آپ کی جائداد کو نقصان پہنچے گا تو بہتر ہے کہ آپ اس انجمن سے قطع تعلق کریں۔

کنور صاحب نے متفکرانہ لہجے میں کہا — پربھو۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس تحریک کی بنیاد ابھی کتنی کمزور ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ حکام کی تیز نگاہی کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ میرا اور تمہارا مقصد ایک ہی ہے۔ میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو۔ لیکن میں سن رسیدہ ہوں۔ آہستہ چلنا چاہتا ہوں۔ اور تم جوان ہو۔ دوڑنا چاہتے ہو۔ میں بھی حکام کی مہربانیوں کا متمنی نہیں ہوں۔ میں بہت پہلے تجویز کرچکا ہوں۔ کہ ہماری قسمت ہمارے ہاتھ ہے۔ اپنے بہبود کے لئے جو کچھ کریں گے ہمیں کریں گے۔ دوسروں سے ہمدردی یا مدد کی امید رکھنا فضول ہے۔ لیکن کم از کم ہماری قومی تحریکات کو زندہ تو رہنا ہی چاہیئے۔ میں اس تحریک کو حکام کی بدگمانیوں کا شکار بنا کر اس کا خاتمہ نہیں کرنا چاہتا۔

پربھو سیوک [illegible] — مجھے جواب [illegible] دیا۔ بات [illegible] جانے کا خوف تھا۔ البتہ دل ہی دل میں طے کرلیا کہ [illegible] کنور صاحب [illegible] اسلئے [illegible] ان کو اس جماعت سے علیحدہ کردوں گا۔ روپیہ کا سوال اتنا مشکل نہیں [illegible] تحریک کی بیخ کنی کردی جائے۔ اندرمت نے بھی یہی صلاح دی۔ کنور صاحب کو الگ کر دینا چاہیئے۔ ہم دوائیں تقسیم کرنے اور قحط زدہ علاقوں میں مویشیوں کا چارہ ڈھونڈنے کے نہیں ہیں ہے وہ بھی ہمارا کام۔ اس سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن میں اُسے اتنا وزن دار نہیں سمجھتا۔ یہ

انہدام کا زمانہ ہے۔ تعمیر کا زمانہ بعد کو آئے گا۔ طاعون قحط اور سیلاب سے دنیا کبھی ویران نہیں ہوئی اور نہ ہو گی۔

شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اب کتنے ہی اہم معاملات میں یہ دونوں آدمی کنور صاحب سے رائے تک نہ لیتے۔ بیٹھ کر آپس ہی میں طے کر لیتے۔ ہر طرف سے مظالم کی خبریں ہر وقت دفتر سے آتی رہتی تھیں۔ کہیں کہیں تو لوگ اس جماعت کی مدد حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دینے کو تیار ہو جاتے۔ اس سے اس امر کا یقین ہوتا جاتا تھا کہ سمتی اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ اسے کسی مستقل سرمایہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کام کرنے والوں میں کافی حوصلہ اور جوش ہو تو کبھی روپیوں کا کال نہیں پڑ سکتا۔ جیوں جیوں یہ بات ظاہر ہوتی جاتی تھی۔ کنور صاحب کی ماتحتی ممبروں کو کھلتی تھی۔

پربھو سیوک کا کلام ان دنوں انقلابی جذبات سے مملو ہوتا تھا۔ قومیت۔ جدو جہد۔ کشمکش کا جذبہ ہر شعر سے مترشح ہوتا تھا۔ اس نے کشتی کے عنوان سے ایک نظم لکھی جسے بحر شاعری کا ایک گوہر نایاب کہنا بیجا نہ ہو گا۔ لوگ پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ پہلے ہی بند میں مسافر نے پوچھا تھا۔ کیوں مانجھی۔ کشتی ڈوبے گی یا پار لگے گی۔ مانجھی نے جواب دیا ــــ مسافر کشتی ڈوبے گی۔ کیونکہ تمہارے دل کو یہ اندیشہ اسی سبب سے ہوا ہے۔ کوئی ایسا جلسہ یا مجمع نہ تھا جہاں پر یہ نظم نہ پڑھی گئی ہو۔ ادبی دنیا میں ہل چل سی مچ گئی۔

خدمتی جماعت پر پربھو سیوک کا اقتدار دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ عموماً سبھی ممبروں کو اب اُن سے عقیدت ہو گئی تھی۔ سبھی دل و جان سے اُن کے اشاروں پر چلنے کو تیار تھے۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ قومیت کے نشہ میں چور۔ نہ دولت کی پرواہ۔ نہ گھر بار کی فکر۔ رُوکھا سُوکھا کھانے والے موٹا جھوٹا پہننے والے۔ زمین پر سو کر رات کاٹ دیتے تھے۔ گھر کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی کسی درخت کے نیچے پڑ رہتے۔ کبھی کسی چبوترے پر پڑے ہیں۔ ہاں اُن کے

دل میں اعلیٰ اور پاک حب الوطنی کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔

تمام ملک میں اس انجمن کے حسنِ انتظام کی دھوم تھی۔ پربھو سیوک ملک کے معزز اور ہردلعزیز لیڈروں میں سے تھے۔ اتنی کم عمری یہ ناموری! لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ جگہ جگہ سے قومی مجلسوں نے انہیں بلانا شروع کیا۔ جہاں جاتے لوگ اُن کی تقریر سُن کر از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔

پُونا میں قومی سبھا کا جلسہ تھا۔ پربھو سیوک کو نویدِ بلاوا۔ انہوں نے فوراً اندر دت کو اپنا کام سپرد کیا اور جنوبی علاقہ جات میں سفر کرنے کا ارادہ کرکے روانہ ہو گئے۔ پُونا میں ان کے استقبال کی خوب خوب تیاریاں کی گئی تھیں۔ یہ شہر قومی کارکنوں کا ایک مرکزی مقام بھی تھا۔ اُن کا افسر بڑے جیوٹ کا آدمی تھا جس نے برلن میں انجنیئری کی ڈگری حاصل کی تھی اور تین سال کے لئے اس جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کا تمام شہر میں بڑا رسوخ تھا۔ وہ اپنی جماعت کے ممبروں کو لئے ہوئے اسٹیشن پر کھڑا ہُوا تھا۔ پربھو سیوک کا دل اس دھوم دھام کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اُن کے دِل نے کہا — یہ میری سرگرمی کا اثر ہے۔ یہ لگن۔ یہ بے خوفی۔ یہ بیداری ان میں کہاں تھی! ہمیں نے ہی انہیں پیدا کیا تھا۔ اب اُمید ہوتی ہے۔ کہ زندہ رہا تو کچھ نہ کچھ کر دکھاؤں گا — آہ غرور!

شام کے وقت بڑے پنڈال میں جب وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تو کئی ہزار سامعین کو اپنی طرف عقیدتمندانہ نگاہوں سے تکتے ہوئے دیکھ کر اُن کا دِل بھر آیا۔ گیلری میں یورپین لیڈیاں بھی موجود تھیں۔ صوبہ کے گورنر بھی تشریف لائے تھے۔ جس کی تحریر میں یہ معجزہ ہے اس کی تقریر میں کیا کچھ جادو ہوگا۔ سب یہی دیکھنا چاہتے تھے۔

پربھو سیوک کا لکچر شروع ہُوا۔ کسی سے ان کا تعارف کرانے کی ضرورت نہ تھی۔ قانونِ سیاست کی فلسفیانہ تشریح کرنے لگے۔ وہ قانون کیا ہے۔ اُس کی ضرورت کیوں ہے۔ اُس کی پابندی کا کیا طریقہ ہے۔ کن حالتوں میں اُس کی

خلاف ورزی کرنا رعایا کا فرض ہو جاتا ہے۔ اُس میں کیا بھلائی بُرائی ہے؟ انہوں نے نہایت قابلیت اور بے خوفی سے ان سوالوں کی توضیح کی۔ ایسے پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کو اگر کوئی شخص سلیس اور دلکش بنا سکتا تھا تو وہ پربھو سیوک تھے۔ گو سیاست بھی دنیا کی ان مخصوص چیزوں میں ہے جو توضیح و تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اُس کی تشریح اُس کے حق میں سم قاتل ہے۔ اس پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہے۔ پربھو سیوک نے پردہ اُٹھا دیا۔ فوجوں کے بھرے نقلوں سے غائب ہو گئے۔ عدالتوں کے شاندار محل زمین دوز ہو گئے۔ ثروت و اقتدار کے نشانات مٹنے لگے۔ سامنے روشن اور جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "قانون کا نہ ہونا ہی بہترین قانون ہے۔" لیکن یوں ہی اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: "ہمارا ملک بلا قانون کا ہے۔ جمہوری اور پابندی میں بعد المشرقین ہے۔" اُسی وقت سامنے سے پستول دغنے کی آواز آئی۔ اور گولی پربھو سیوک کے کان کے پاس سے نکل کر پیچھے دیوار میں جا لگی۔ رات کا وقت تھا۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کس نے یہ وار کیا۔ شک ہوا کہ کسی یوروپین کی شرارت ہے۔ لوگ گیلریوں کی طرف دوڑے۔ معاً پربھو سیوک نے بلند آواز میں کہا — میں اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے مجھ پر وار کیا ہے۔ اُس کا جی چاہے تو وہ پھر مجھے نشانہ بنا سکتا ہے۔ میری جانب سے کسی کو بدلہ لینے کا اختیار نہیں ہے۔ میں اپنے خیالات کی اشاعت کرنے کے لئے آیا ہوں۔ زیادتیوں کے انتقام کے لئے نہیں۔

ایک سمت سے آواز آئی — یہ قانون کی ضرورت کا روشن ثبوت ہے۔

جلسہ برخاست ہو گیا۔ یوروپین اصحاب عقب کے دروازہ سے نکل گئے۔ باہر مسلح پولیس آپہنچی تھی۔

دوسرے روز شام کو پربھو سیوک کے نام ایک تار آیا کہ خدمتی انجمن کی انتظامی کمیٹی آپ کے لیکچر کو ناپسند کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ آپ اُسے واپس لیں ورنہ یہ کمیٹی آپ کے لکچروں کی ذمہ وار نہ ہوگی۔

پربھو سیوک نے تار کے کاغذ کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اُسے پیروں

سے کھینچتے ہوئے آپ آپ بولے ۔۔ مکار۔ بزدل۔ رنگا سیار۔ قومیت کا دم بھرتا ہے قوم کی خدمت کرے گا۔ ایک تقریر سے کایا پلٹ کر دی۔ خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتا ہے؟ قومی خدمت کو بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ سانپ سے کھیلنا ہے۔ شیر سے پنجہ لینا ہے۔ اگر اپنی جان اور دولت اتنی پیاری ہے تو یہ سوانگ کیوں بھرتے ہو؟ جاؤ تم جیسے قوم پرستوں کے بغیر ملک کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

انہوں نے اسی وقت تار کا جواب دیا ۔۔ میں انتظامیہ کمیٹی کے ماتحت ہو کر اپنے لیے ذلت آمیز سمجھتا ہوں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آدھ گھنٹہ کے بعد دوسرا خط آیا۔ اس پر سرکاری مہر تھی۔ لکھا تھا:۔

مائی ڈیر سیوک۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کل آپ کی تقریر سن کر مجھے کتنا حظ اور نفع حاصل ہوا۔ اسے مبالغہ نہ سمجھئے کہ سیاست کی ایسی عالمانہ اور باریک تنظر تک میں نے آج تک نہیں سوچی تھی۔ قواعد نے میری زبان بند کر رکھی ہے مگر میں آپ کے جذبات و خیالات کی عزت کرتا ہوں اور خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ دن جلد آئے جب ہم سیاست کا راز سمجھیں اور اس کے اعلیٰ ترین اصولوں پر کاربند ہو سکیں۔ صرف ایک ہی ایسا شخص ہے جسے آپ کی صاف گوئی شاق ہے اور مجھے افسوس و شرم کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ شخص یوروپین ہے میں یوروپین جماعت کی طرف سے اس وحشیانہ اور بزدلانہ حملہ پر اپنے رنج و نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کہاں یوروپین جماعت کو آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اگر میں اس شیطان کا پتہ لگانے میں کامیاب ہوا اس کا کل سے پتہ نہیں ہے، تو آپ کو اس کی اطلاع دینے میں مجھ سے زیادہ خوشی اور کوئی نہ ہوگا۔۔ آپ کا ایف وِلسن۔

پربھو سیوک نے اس خط کو دوبارہ پڑھا۔ اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ بڑی احتیاط سے اسے اپنے صندوق میں رکھ دیا۔ کوئی اور وہاں ہوتا۔

تو ضرور ہی اُسے پڑھ کر سُناتے۔ وہ گھمنڈیں آکر کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ یہ ہے زندہ قوموں کی فیاضی۔ فراخدلی اور قدردانی! انہوں نے آزادی کا لطف اٹھایا ہے آزادی کے لئے قربانیاں دی ہیں اور آزادی کی اہمیت سے واقف ہیں۔ جن کی ساری زندگی دوسروں کی خوشامد کرنے اور دوسروں کا منہ تکنے میں گذری ہو وہ آزادی کی اہمیت کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ مرنے کے دن سر پر آجاتے ہیں تو ہم لکھنے خداپرست بن جاتے ہیں۔ بھرت سنگھ بھی اُسی طرف گئے ہوتے۔ اب تک رام نام کی مالا پھیرتے ہوتے۔ وہ تو ونے سنگھ نے اس طرف گھما دیا۔ یہ اُنہیں کا اثر تھا۔ ونے اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ بڑی ضرورت ہے! تم کہاں ہو؟ آکر دیکھو تمہاری اِس کشت کا کیا حال ہے۔ اس کے محافظ ہی اسے اُجاڑ رہے ہیں۔

(۳۸)

صوفیا اور ونے ساری رات تو اسٹیشن پر پڑے رہے۔ سویرے قریب کے گاؤں میں گئے جو بھیلوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ صوفیا کو یہ مقام بہت پسند آیا۔ گاؤں کے سر پر پہاڑ کا سایہ تھا اور پیڑوں کے نیچے ایک پہاڑی چشمہ میٹھا راگ گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ بھیلوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے جن پر بیل ہوئی تھی، پریوں کے کھلونوں کی طرح خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ جب تک یہ نہ طے ہو جائے کہ کیا کرنا ہے کہاں جانا ہے کہاں رہنا ہے اُس وقت تک انہوں نے اُسی گاؤں میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک جھونپڑے میں جگہ بھی آسانی سے مل گئی۔ بھیلوں کی مہمان نوازی مشہور ہے اور یہ دونوں بھوک پیاس گرمی سردی برداشت کرنے کے عادی تھے۔ جو کچھ موٹا جھوٹا میسر ہوا کھا لیا۔ چاء اور مکھن مربے اور میووں کا چسکا نہ تھا۔ صاف اور سادہ غذا ان کی خوراک تھی۔ وہاں اُن کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس جھونپڑے میں صرف ایک بھیلنی رہتی تھی۔ اس کا لڑکا کہیں فوج میں ملازم تھا۔ بڑھیا ان لوگوں کی خدمت خوشی سے کرتی۔ یہاں انہوں نے مشہور کیا کہ

ہم دِلّی کے رہنے والے ہیں۔ تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے آئے ہیں۔ گاؤں کے باشندے اُن کا بڑا ادب اور لحاظ کرتے تھے۔

مگر اتنی خلوت اور آزادی کے باوجود بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت کم ملتے۔ دونوں ہی نہ جانے کیوں خائف رہتے تھے۔ ان میں ناچاقی نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ دونوں مضطرب تھے۔ دونوں بیقرار۔ دونوں بیتاب۔ مگر اخلاقی پابندیوں کا خیال انہیں باہم ملنے نہ دیتا تھا۔ عمیق مذہبی مطالعہ نے صوفیا کو فرقہ بندیوں کی تنگی سے آزاد کر دیا تھا۔ اُس کے دل میں اب کسی سے نفرت یا مخالفت نہ تھی۔ جس بے اطمینانی نے مہینوں تک اُس کے مذہبی اصولوں کا دہا رکھا تھا۔ وہ مفقود ہو گئی تھی۔ اب کل جاندار اس کے لئے اپنے ہی تھے۔ اگرچہ ونے کے خیالات اتنے وسیع نہ تھے۔ دنیا کی محبت اُن کی نگاہ میں ایک فلسفیانہ بحث سے زیادہ قیمتی تھی مگر صوفیا کی وسیع الخیالی کے سامنے اُس کے موروثی احساسات منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ واقعی دونوں کا روحانی ارتباط ہو چکا تھا اور مادی ارتباط میں بھی کوئی ٹھوس رُکاوٹ نہ تھی۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ دونوں جُدا رہتے تھے۔ تنہائی میں ساتھ ساتھ کبھی نہ بیٹھتے تھے۔ انہیں اب اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا۔ تقریر کا دور ختم ہو چکا تھا۔ تحریر کا دور آ گیا تھا۔ تقریر سے زبان نہیں کٹتی۔ تحریر سے ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔

لیکن تحریر سے ہاتھ چاہے کٹ جائیں پھر بھی اُس کے بغیر کوئی بات پختہ نہیں ہوتی۔ ذرا سا اختلاف۔ ذرا سی بے احتیاطی سے سمجھوتہ مسترد ہو سکتا ہے۔ اس لئے دونوں ہی اس غیر یقینی حالت کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے۔ کیسے کریں۔ یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کون اس تذکرے کو چھیڑے؟ شاید باتوں میں کوئی اعتراض پیدا ہو جائے۔ صوفیا کے لئے تو ونے کی قربت کافی تھی۔ وہ انہیں ہر وقت آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ اُن کے رنج اور خوشی میں شریک ہوتی تھی۔ انہیں اپنا سمجھتی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہ چاہتی تھی۔ ونے ہر روز آس پاس کے دیہاتوں میں گھومنے

چلے جاتے تھے۔ کوئی عورت ان سے اپنے پردیسی لڑکے یا شوہر کے نام خط لکھاتی کہیں
وہ مریضوں کو دوا دیتے۔ کہیں انہیں آپس کے جھگڑوں میں بیچ بننا پڑتا۔ صبح کے گئے
پھر رات گئے لوٹتے۔ یہ اُن کا روزمرہ کا دستور تھا۔ صوفیا چراغ جلائے اُن کی
راہ دیکھا کرتی جب وہ آجاتے تو اُن کے ہاتھ پیر دُھلا کر کھانا کھلواتی۔ دن بھر کی
باتیں اشتیاق سے سنتی اور پھر دونوں اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں سونے چلے جاتے۔ ہاں
ونے کو اپنا گھاس کا بچھونا بچھا ہوا ملتا۔ سرہانے پانی کی ہانڈی رکھی ہوتی۔ صوفیا اتنے
ہی سے مطمئن تھی۔ اگر اُسے یقین ہو جاتا کہ میری ساری زندگی اسی طرح کٹ جائے گی۔
تو اسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتی۔ یہی اس کی زندگی کا خواب شیریں تھا لیکن ونے
اتنے صابر اور بے نیاز نہ تھے۔ اُن کو محض روحانی ارتباط سے تسکین نہ ملتی تھی۔ صوفیا
کا بے مثال حسن۔ اُس کی شیریں کلامی اُس کے جسم کا سڈول پن اُن کے عشقیہ تخیل
کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ انہوں نے نامناسب حالات میں پڑ کر ایک بار اُسے کھو دیا تھا
وہ اب دوبارہ اس امتحان میں نہ پڑنا چاہتے تھے۔ جب اُس [illegible] مکان تھا اُن کے
دل کو کبھی سکون نہ مل سکتا تھا۔

یہ لوگ ریلوے اسٹیشن کے پتہ پر اپنے نام کے خطوط۔ اخبارات رسالے اور کتابیں
وغیرہ منگا لیا کرتے تھے۔ اُن سے دنیا کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ بھیلوں سے
اُنہیں کچھ محبت سی بھی ہو گئی تھی۔ یہاں سے کسی اور جگہ چلے جانے کی انہیں خواہش نہ ہوتی
تھی۔ دونوں کو خوف تھا کہ اس محفوظ مقام سے نکل کر ہمارا نہ جانے کیا حال ہو۔ نہ جانے
ہم کس بھنور میں جا پھنسیں۔ اس گوشۂ عافیت کو دونوں ہی غنیمت سمجھتے تھے۔
صوفیا کو ونے پر یقین تھا وہ اپنی کشش کی طاقت سے واقف تھی۔ ونے کو صوفیا
پر یقین نہ تھا۔ وہ اپنی مقناطیسی قوت سے بے خبر تھے۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ صوفیا ونے کو ناشتہ کرا کے انگیٹھی کے سامنے
بیٹھی ہوئی ایک کتاب دیکھ رہی تھی۔ کبھی اہم مقامات پر پنسل سے X کا
نشان لگاتی کبھی سوالیہ نشان لگاتی اور کہیں کہیں خط بھی کھینچ دیتی۔ ونے کو

اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ محویت سرد مہری کی علامت تو نہیں ہے۔ مطالعہ میں ایسی محو ہے کہ دوسری طرف دیکھتی بھی نہیں۔ انہوں نے کپڑے پہنے۔ وہ باہر جانا چاہتے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ سرمائی پارچے موجود تھے۔ کمبل کافی نہ تھا۔ آسودہ میں ہو کر انگیٹھی کے پاس آئے اور پاس ہی بیٹھ گئے۔ صوفیا کی نگاہیں کتاب کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ونسنٹ کی للچائی ہوئی نظر موقع پاکر آزادی سے اس کے حسن خداداد کا جلوہ دیکھنے لگی۔ دفعتاً صوفیا نے سر اٹھایا تو ونسنٹ کو اپنی طرف مخمور نگاہوں سے تاکتے دیکھا۔ اس نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا "آج تو بڑی سردی ہے۔ کہاں جاؤ گے، بیٹھو، تمہیں اس کتاب کے چند ابواب سناؤں۔ نہایت عمدہ کتاب ہے۔" یہ کہہ کر اس نے صحن کی طرف دیکھا۔ جھبلی غائب تھی۔ شاید لکڑیاں چننے چلی گئی تھی۔ اب دس بجے کے پہلے نہ آئے گی۔ صوفیا کچھ پریشان سی ہو گئی۔

ونسنٹ نے اشتیاق آمیز لہجہ میں کہا— "نہیں صوفی آج کہیں نہ جاؤں گا۔ تم سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب بند کر کے رکھ دو۔ تمہارے ساتھ رہ کر بھی تم سے باتیں کرنے کو ترستا رہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے صوفیا کے ہاتھوں سے کتاب چھین لینے کی کوشش کی۔ صوفیا کتاب کو مضبوط پکڑ کر بولی۔ "ٹھہرو ٹھہرو۔ کیا کرتے ہو؟ اب یہی شرارت مجھے بھلی نہیں لگتی۔ بیٹھو۔ اس فرانسیسی فلاسفر کے خیالات سناؤں۔ دیکھو اس نے مذہبی تفسیر میں کتنی وسیع النظری سے کام لیا ہے۔"

ونسنٹ۔ "نہیں آج دس منٹ کے لئے تم اس فلاسفر سے چھٹی مانگ لو اور میری دو باتیں سن لو جو کسی پنجرے میں بند چڑیا کی طرح باہر نکلنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ آخر میرے اس بن باس کی کوئی مدت ہے یا ہمیشہ مسرت کے خواب ہی دیکھتا رہوں گا؟"

صوفیا۔ "اس فلاسفر کے خیالات اس جواب سے کہیں دلچسپ ہیں جو میں تمہیں دے سکتی ہوں۔ مجھے ان پر کچھ شکوک ہیں۔ ممکن ہے۔ تبادلہ خیالات

سے وہ مفتوح ہو جائیں۔

ونے ۔ نہیں، یہ کتاب بند کرکے رکھ دو۔ آج میں تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن
کر حاضر ہوا ہوں۔ آج تم سے وعدہ لئے بغیر تمہارا دامن نہ چھوڑوں گا۔ کیا اب بھی میرا
امتحان لے رہی ہو؟

صوفیا نے کتاب بند کرکے رکھ دی اور متانت سے کہا — میں نے تو اپنے کو تمہارے
قدموں پر ڈال دیا۔ اب اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

ونے ۔ اگر میں دیوتا ہوتا تو تمہاری محبت آمیز پرستش سے قانع ہو جاتا۔ لیکن میں
بھی تو خواہشات کا تابع کمزور انسان ہوں۔ میں نے جو کچھ پایا ہے اس سے مطمئن نہیں
ہوں۔ میں اور چاہتا ہوں، سب چاہتا ہوں۔ کیا اب بھی تم میرا مطلب نہیں سمجھیں؟ میں
چڑیا کو اپنی منڈیر پر بیٹھی دیکھ کر آسودہ نہیں۔ میں اُسے اپنے پنجرے میں چہکتے
ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا اور بھی زیادہ صاف الفاظ میں کہوں؟ میں پھول کا رس
چاہتا ہوں۔ صرف پھول کی خوشبو سے میرا جی نہیں بھرتا۔

صوفیا ۔ ونے مجھے ابھی مجبور نہ کرو۔ میں بالکل تمہاری ہی ہوں۔ میں اِس وقت
یہ بات حقیقی صداقت اور خلوص سے کہہ رہی ہوں۔ اس سے زیادہ کسی مندر میں
یا کسی ہون کنڈ کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔ جس وقت میں نے تمہاری [illegible] کی
تھی اُس وقت بھی تمہاری تھی۔ لیکن معاف کرنا۔ میں کبھی کوئی ایسا کام نہ کروں گی
جس سے تمہاری سبکی۔ تمہاری ذلت یا تمہاری بُرائی ہو۔ میری یہ احتیاط اپنے
لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے ہے۔ روحانی اتصال کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔
مگر جسمانی اتصال کے لئے عزیز و اقارب کی منظوری اور سوسائٹی کے قواعد کی
پابندی لازمی ہے۔ ورنہ یہ اتصال خطرناک ہو جاتا ہے۔ میرا ضمیر مجھے کبھی
معاف نہ کرے گا۔ اگر میرے باعث تم پر تمہارے ماں باپ بالخصوص تمہاری
ماں کی ناخوشی ہو اور میرے ساتھ تمہیں بھی ننگ خاندان سمجھنے لگیں۔ میں
قیاس بھی نہیں کر سکتی کہ اس مجبوری کے لئے رانی جی تمہیں اور خصوصاً مجھے کیا سمجھ

وہ بھاگی۔ وہ ملتی ہیں۔ دیوی ہیں۔ اُن کا غصہ نہ جانے کیا غضب ڈھائے۔ میں اُن کی نگاہ میں کتنی ذلیل ہوں۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے اور تمہیں بھی انہوں نے انتہائی سزا دے دی جو اُن کے امکان میں تھی۔ ایسی حالت میں جب انہیں معلوم ہوگا۔ کہ میرے اور تمہارے درمیان صرف محبت کا رشتہ نہیں۔ عقد کا رشتہ قائم ہو گیا ہے تو عجب نہیں کہ وہ غصّہ سے مغلوب ہو کر خودکشی کر لیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت تم ان ساری پریشانیوں کے لئے تیار ہو جاؤ مگر میں مادی تعلق اتنا اہم نہیں سمجھتی۔

ونے نے اُداس ہو کر کہا — "اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ میری ساری عمر خوشی کا خواب دیکھتے ہی تمام ہو جائے؟"

صوفیا۔ نہیں ونے میں اتنی نا اُمید نہیں ہوں۔ مجھے اب بھی اُمید ہے کہ کبھی نہ کبھی رانی جی سے تمہارا اور اپنا قصور معاف کرا لوں گی اور پھر اُن کی دعاؤں کے ساتھ ہم دونوں کی متحد زندگی کا آغاز ہوگا۔ رانی جی کی خوشی اور ناخوشی دونوں انتہا پذیر ہوتی ہیں۔ ایک انتہا کا اندازہ ہم کر چکے۔ خدا نے چاہا تو دوسری انتہا کا بھی جلد ہی اندازہ ہو جائے گا۔ میں تم سے منت کرتی ہوں کہ اب اس معاملہ کا ذکر پھر نہ کرنا ورنہ مجھے کوئی دوسرا مامن تلاش کرنا پڑے گا۔

ونے نے آہستہ سے کہا — "وہ دن کبھی آئے گا جب یا تو اماں جی نہ ہوں گی۔ یا میں نہ ہوں گا۔"

پھر انہوں نے کمبل اوڑھا۔ ہاتھ میں لکڑی لی اور باہر چلے گئے جیسے کوئی کسان جہاجن کی ڈانٹ سن کر اُس کے گھر سے باہر نکلے۔

بدستور اسی طرح دن گذرنے لگے۔ ونے بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے۔ بے امکان گھر سے باہر ہی گھوما کرتے۔ آتے بھی تو کھانا کھا کر چلے جاتے۔ کہیں جانا ہوتا تو ندی کے کنارے پر جا بیٹھتے اور گھنٹوں نظارۂ آب سے دل بہلاتے رہتے۔ کبھی کاغذ کی ناؤیں بنا کر اس میں چھوڑتے اور ان کے پیچھے پیچھے وہاں تک جاتے جہاں کہ وہ غرقاب ہو جاتیں۔ انہیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ صوفیا کو اب بھی

مجھ پر یقین نہیں ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے مگر میری اخلاقی طاقت پر اُسے شک ہے۔

ایک روز وہ ندی کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ بڑھیا بھیلنی پانی بھرنے کو آئی۔ انہیں وہاں بیٹھے دیکھ کر اُس نے گھڑا رکھ دیا اور بولی۔ کیوں مالک تم یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟ گھر میں مالکن گھبراتی نہ ہوں گی؟ میں انہیں بہت روتے دیکھا کرتی ہوں کیا تم نے انہیں کچھ کہا ہے کیا؟ کیا بات ہے کہ کبھی تم دونوں کو بیٹھ کر ہنستے بولتے ہوئے نہیں دیکھتی؟

ونے نے کہا۔ کیا کروں ماتا۔ انہیں یہی تو بیماری ہے کہ مجھ سے رُوٹھی رہتی ہیں۔ یہ بیماری انہیں برسوں سے ہو گئی ہے۔

بھیلنی ۔ تو بیٹا۔ اس کا اوپائے میں کر دوں گی۔ ایسی جڑی دے دوں کہ تمہارے بِنا انہیں چھن بھر بھی چین نہ آئے۔

ونے نے کہا۔ کیا ایسی جڑی بھی ہوتی ہے؟

بڑھیا نے واقفیت کے لہجہ میں کہا۔ "بیٹا جڑیاں تو ایسی ایسی ہوتی ہیں۔ کہ چاہے آگ باندھ لو۔ پانی باندھ لو۔ مُردے کو جلا دو۔ ندی کو گھر بیٹھے مار ڈالو۔ ہاں جاننا چاہئے۔ تمہارا بِرتھیں بڑا گُنی تھا۔ راجوں کے دربار میں آیا جایا کرتا تھا۔ اُسی نے مجھے دو چار بوٹیاں بتا رکھی تھیں۔ بیٹا۔ ایک ایک بوٹی ایک ایک لاکھ کو سستی ہے۔ بیٹا

ونے ۔ تو میرے پاس اتنے روپے کہاں ہیں؟

بھیلنی ۔ نہیں بیٹا۔ تم سے میں کیا لوں گی۔ تم تو سُنا تھا پوری کے نواسی ہو۔ تمہارے درشن پا گئی۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔ وہاں جا کر میرے لئے تھوڑا سا گنگا جل بھیج دینا۔ بڑھیا تر جائے گی۔ تم نے مجھ سے پہلے نہ کہا نہیں تو میں نے وہی جڑی بوٹی تمہیں دے دی ہوتی۔ تم دونوں کی اَن بن دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔

شام کے وقت جب صوفیا بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ سبیلی نے ایک جڑی لا کر ونے سنگھ کو دی اور بولی "بیٹا۔ بڑے جتن سے رکھنا۔ لاکھ روپے خرچ کرنے پر تب بھی نہ ملے گی۔ اب تو پتہ یا ہی اُٹھ گیا۔ اس کو اپنے لہو میں پندرہ دن روز بھگو کر سکھاؤ۔ تب اس میں سے ایک ایک رتی کاٹ کر مالکن کو دھونی دو۔ پندرہ دن کے پیچھے جو بچ رہے وہ اُن کے جوڑے میں باندھ دو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ بھگوان چاہیں گے تو تم آپ اُن سے اوبنے لگو گے۔ وہ پرچھائیں کی طرح تمہارے پیچھے لگی رہیں گی۔" یہ کہہ کر اُس نے ونے کے کان میں ایک منتر بتایا جو کئی مہمل الفاظ کا مجموعہ تھا اور کہا کہ جڑی کو لہو میں ڈُوباتے وقت یہ منتر پانچ بار پڑھ کر جڑی پر پھونک دینا۔

ونے سنگھ توہم پرست نہ تھے۔ منتر جنتر پر اُن کا ذرا بھی اعتقاد نہ تھا۔ لیکن سُنی سنائی باتوں سے انہیں یہ معلوم تھا کہ نیچی ذاتوں میں اس قسم کے جادو ٹونے کا بڑا رواج ہے اور کبھی کبھی اُس سے حیرت انگیز نتائج بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ خود عمل میں کوئی طاقت نہیں۔ اگر کچھ نتیجہ ہوتا ہے تو وہ جہلاء کی دماغی کمزوری کے سبب۔ تعلیم یافتہ لوگوں پر جو عموماً شکی ہوتے ہیں۔ جو ایشور کی ہستی کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ان باتوں کا بھلا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ تو بھی انہوں نے عمل کا تہیہ کر لیا۔ انہیں کسی نتیجہ کی امید نہ تھی۔ وہ صرف امتحاناً ایسا کرنا چاہتے تھے

لیکن اگر کہیں واقعی اِس جڑی میں کوئی معجزہ ہو تو پھر کیا پوچھنا۔ اس کے خیال ہی سے اُن کا دل بے حد مسرور ہو گیا۔ صوفیا میری ہو جائے گی۔ اُس وقت اُس کی محبت میں کچھ اور ہی بات ہو گی۔

جوں ہی منگل کا دن آیا۔ وہ ندی پر گئے۔ اور چاقو سے اپنی ایک اُنگلی میں زخم کر کے جڑی کو خون سے تر کیا۔ پھر اُسے ایک بلند چٹان پر پتھروں سے ڈھک کر رکھ آئے۔ پندرہ دن تک متواتر یہی عمل کرتے رہے۔ سردی ایسی تھی کہ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جاتے تھے۔ برتنوں میں پانی جم جاتا تھا لیکن ونے روز مرہ

نہانے جاتے۔ صوفیا نے اُن میں اتنی پابندی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کہتی تھی کہ اتنے سویرے نہ نہاؤ کہیں سردی نہ لگ جائے۔ جنگلی لوگ بھی دن بھر آگ جلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ باہر منہ نہیں نکالا جاتا۔ ذرا دھوپ نکلنے پر غسل کیا کرو۔ اس پر ونے مسکرا کر کہہ دیتے کہ بیمار پڑوں گا تو کم از کم میرے پاس بیٹھو گی تو۔ ان کی کئی انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں مگر وہ زخموں کو چھپائے رہتے تھے۔

ان دنوں ونے کی نگاہ صوفیا کی ایک ایک بات، ایک ایک چال پر لگی رہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میرے عمل کا کچھ اثر ہو رہا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی ظاہر نتیجہ نہ دکھائی دیتا تھا۔ آخر ہفتہ پورا ہونے پر روزانہ انہیں صوفیا کے برتاؤ میں کچھ خفیف سا فرق نظر آیا۔ شاید کسی اور وقت اُن کا خیال بھی اُس طرف نہ جاتا۔ مگر آج کل تو اُن کی نگاہ بہت باریک بین ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر سے باہر جانے لگے تو صوفیا نادانستہ طریقہ پر نکل آئی اور کئی فرلانگ تک اُن سے باتیں کرتی ہوئی چلی گئی۔ جب ونے نے بہت اصرار کیا تو لوٹی۔ ونے نے سمجھا کہ یہ اُسی عمل کا اثر ہے۔

آج سے دوسری منزل کا کام شروع ہوتا تھا۔ ونے بہت متفکر تھے ـــ یہ عمل کیونکر پورا ہوگا۔ تنہا صوفیا کے کمرہ میں جانا تہذیب، شرافت اور انسانیت کے خلاف ہے۔ کہیں صوفیا جاگ پڑے اور مجھے دیکھ لے تو مجھ کو کتنا کمینہ سمجھے گی۔ شاید ہمیشہ کے لئے مجھ سے متنفر ہو جائے۔ وہ نہ بھی جاگے تو بھی یہ کون سا اخلاق ہے کہ کوئی مرد کسی نوجوان عورت کے کمرہ میں جائے۔ نہ جانے وہ کس حالت میں لیٹی ہوگی۔ ممکن ہے کہ بال کھلے ہوں، کپڑا ہٹ گیا ہو۔ اُس وقت میرے دل میں کیا کیا ناپاک خیالات پیدا ہوں گے۔ میں اخلاقی نقطۂ خیال سے کس درجہ گر جاؤں گا۔

تمام دن وہ انہیں پریشان کُن خیالات میں محو رہے لیکن شام ہوتے ہی وہ کمہار کے یہاں سے ایک کچا پیالہ لائے اور اُسے حفاظت سے رکھ دیا۔ انسانی فطرت میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکثر ہم ایسے کام کر ڈالتے ہیں جن کے کرنے کی ہمیں خواہش نہیں ہوتی۔ کوئی پوشیدہ ترغیب ہم کو اپنی مرضی کے خلاف کھینچ لے جاتی ہے۔

مجبور کرتی ہے۔

آدھی رات ہوئی تو رتنے پیالے میں آگ اور ہاتھ میں وہی لوبان جھلوکر سلگائی ہوئی جڑی لے کر صوفیا کی کوٹھڑی کے دروازہ پر پہنچے۔ کمبل کا پردہ پڑا ہُوا تھا۔ جھونپڑے میں کواڑ کہاں؟ کمبل کے پاس کھڑے ہو کر اُنہوں نے کان لگا کر سُنا۔ صوفیا میٹھی نیند سو رہی تھی۔ وہ تھر تھر کانپتے پسینہ سے تر اندر داخل ہوئے۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں صوفیا خواب میں مدہوش لیٹی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے دماغ میں نازک خیالی بس رہی ہو۔ رتنے کے دل پر رعب سا چھا گیا۔ کئی منٹ تک مسحور سے کھڑے رہے مگر اپنے کو سنبھالے ہوئے۔ گویا کسی دیوی کے مندر میں ہوں! نیک چلن دلوں میں حُسنِ خداداد کا نظارہ پرستش کے جذبات کو متحرک کر دیتا ہے اور خواہشات نفسانی کو ساکن۔ رتنے کچھ دیر تک صوفیا کو عقیدتمندانہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ آہستہ سے بیٹھ گئے۔ پیالہ میں جڑی کا ایک چھوٹا ٹکڑا توڑ کر رکھ دیا اور اُسے صوفیا کے سرہانے کی طرف کھسکا دیا۔ ایک لمحہ میں جڑی کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک گیا۔ عود اور عنبر میں یہ خوشبو کہاں؟ دھوئیں میں کچھ ایسا جوش افزا اثر تھا کہ رتنے کا دل بے قرار ہو گیا۔ جونہی دھواں بند ہُوا۔ رتنے نے پیالے سے جڑی کی راکھ نکال لی۔ بھیلنی کی ہدایت کے مطابق اُسے صوفیا پر چھڑک دیا اور باہر نکل گئے۔ لیکن اپنی کوٹھڑی میں جا کر وہ گھنٹوں بیٹھے پچھتاتے رہے۔ انہوں نے بار بار اپنے اخلاقی حسیات کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اپنے اس فعل کو دغا بازی اور عصمت دری کہہ کر دل میں نفرت پیدا کرنی چاہیئے۔ سوتے وقت قصد کر لیا کہ بس آج ہی سے اس عمل کا خاتمہ ہے۔ دوسرے روز وہ دن بھر غمگین اُداس اور پریشان رہے۔ جُوں جُوں رات نزدیک آتی تھی۔ انہیں اندیشہ ہوتا جاتا تھا کہ کہیں میں پھر اُسی عمل کو نہ کروں۔ وہ دو تین بھیلوں کو بُلا لائے اور اُنہیں اپنے پاس سُلایا۔ اُنہوں نے کھانا بھی دیر سے کھایا کہ بستر پر جاتے ہی نیند آ جائے۔ جب کھانا کھا کر اُٹھے تو صوفیا آ کر اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ وہ رات کو اُن کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بہت دیر تک اُن کے پاس

بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ آج کے اخبارات میں پربھو سیوک کی پونا والی تقریر شائع ہوئی تھی۔
صوفیا نے اُسے بلند لہجہ میں پڑھا۔ اُس کا سر غرور سے اُونچا ہو گیا۔ بولی — دیکھو کتنا
عشرت پسند شخص تھا جیسے ہمیشہ عمدہ کپڑوں اور عمدہ سامانوں کی دُھن لگی رہتی
تھی۔ اُس کی کتنی کایا پلٹ ہوئی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اِس سے کبھی کچھ نہ ہوگا۔ تن پروری
ہی میں اُس کی زندگی بسر ہوگی۔ انسانی دل کے بھید سمجھ میں نہیں آتے۔ اُس کے اِس پریم
اور تیاگ پر تعجب ہوتا ہے۔

ونے۔ جب پربھو سیوک اس جماعت کے مہتمم ہو گئے۔ تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔
ڈاکٹر گنگولی تو اُسے تقسیم کرنے والوں کی جماعت بنا کر چھوڑتے۔ بنا جی پر میرا یقین
نہیں ہے اور اندردت تو بالکل اُجڈ ہے۔ پربھو سیوک سے زیادہ قابل شخص نہ مل
سکتا تھا۔ وہ یہاں ہوتے تو بلائیں لیتا۔ یہ خدائی مرد ہے اور اب مجھے اُمید ہوتی
ہے کہ ہماری کوشش بیکار نہ جائے گی۔

بھیلوں کے خرّاٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ صوفیا چلنے کو اُٹھی تو اُس نے ونے کو
ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں محبت کے سوا اور بھی کچھ تھا۔ ایک تو خواہش
جھلک رہی تھی۔ ایک کشش بھی تھی جس نے ونے کو سر سے پیر تک ہلا دیا۔ جب وہ
چلی گئی تو اُنہوں نے ایک کتاب اُٹھالی اور پڑھنے لگے۔ لیکن جوں جوں عمل کا وقت
قریب آتا تھا اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جبراً اُنہیں
دھکیل رہا ہے۔ جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ صوفیا سو گئی ہوگی تو وہ آہستہ سے اُٹھے۔
پیالہ میں آگ لی اور چلے۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ خائف تھے۔ ایک بار جی میں آیا
کہ پیالہ کو پٹک دوں۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد ہی اُنہوں نے صوفیا کی کوٹھڑی میں قدم
رکھا۔ آج اُنہوں نے اپنی نگاہیں اوپر نہیں اُٹھائیں۔ سر نیچا کئے ہوئے دھونی سُلگائی
اور راکھ چھڑک کر چلے آئے۔ چلتی بار اُنہوں نے صوفیا کی چاند سی صورت دیکھی۔ ایسا
معلوم ہُوا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ سارے جسم میں سنسنی سی
دوڑ گئی۔ ایشور اب لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اِس نے دیکھ نہ لیا ہو۔ بڑی تیزی

سے اپنی کوٹھڑی میں آئے۔ چراغ بجھا دیا اور چارپائی پر گر پڑے۔ گھنٹوں دل دھڑکتا رہا!

اس طرح پانچ روز تک ونے نے بڑی دقت سے اس کام کو کیا اور اتنے ہی دنوں میں انہیں صوفیا پر اس کا اثر صاف نظر آنے لگا۔ حتیٰ کہ پانچویں دن وہ دوپہر تک اُن کے ساتھ بھیلوں کے جھونپڑوں کی سیر کرتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں متانت کی جگہ اب اشتیاق انگیز شوخی نمودار تھی۔ اور لبوں پر شیریں تبسم تھا۔ آج رات کو کھانے کے بعد وہ اُن کے پاس بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اُس نے اپنا سر ونے کی گود میں رکھ دیا اور اُن کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی —
"سچ بتاؤ ونے۔ ایک بات تم سے پوچھوں۔ بتاؤ گے نا؟ سچ بتانا۔ تم یہ تو نہیں چاہتے کہ یہ بلا سر سے ٹل جائے؟ میں کہے دیتی ہوں کہ جیتے جی نہ ٹلوں گی۔ نہ تمہیں چھوڑوں گی۔ تم بھی مجھ سے بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ کسی طرح نہ جانے دوں گی۔ جہاں جاؤ گے میں بھی چلوں گی۔ تمہارے گلے کا ہار بنی رہوں گی۔ یہ کہتے کہتے اس نے ونے کے ہاتھ چھوڑ دئے اور اُن کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔"

ونے کو ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیر اُکھڑ گئے ہیں اور میں لہروں میں بہا جا رہا ہوں۔ ایک عجیب خوف سے اُن کا دل کانپ اٹھا گویا انہوں نے کھیل میں شیرنی کو جگا دیا ہو۔ انہوں نے نامعلوم طریقہ پر خود کو صوفیا کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا اور بولے — صوفیا!

صوفیا چونک پڑی۔ خواب میں تھی۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی — مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اگلے جنم سے اُس کے قبل سے ابتدا ہی سے تمہاری ہوں۔ کچھ خواب سا یاد آتا ہے کہ ہم اور تم کسی ندی کے کنارے ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ سچ!
ونے نے خائف ہو کر کہا۔ "تمہارا جی کیسا ہے؟"

صوفیا۔ مجھے کچھ ہوا تھوڑا ہی ہے۔ میں تو اپنے اگلے جنم کی بات یاد کر رہی ہوں۔ مجھے ایسا یاد آتا ہے۔ تم مجھے جھونپڑے میں تنہا چھوڑ کر اپنی کشتی پر کہیں پردیس چلے

گئے تھے اور میں روز ندی کے کنارے بیٹھ کر تمہاری راہ دیکھتی رہتی تھی پر تم آتے نہ تھے۔

دِنے نے۔ صوفیا مجھے خوف ہو رہا ہے کہ تمہارا جی اچھا نہیں ہے۔ رات بہت گئی ہے۔ اب سو جاؤ۔

صوفیا۔ "میرا تو آج یہاں سے چلنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ کیا تمہیں نیند آ رہی ہے۔ تو سوؤ۔ میں بیٹھی ہوں۔ جب تم سو جاؤ گے میں چلی جاؤں گی۔" ایک لمحہ بعد پھر بولی — "مجھے نہ جانے کیوں خوف ہو رہا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ سچ بتاؤ کیا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟"

دِنے۔ صوفی اب ہم روز ابد تک جُدا نہ ہوں گے۔

صوفیا۔ تم اتنے بیدرد نہیں ہو۔ میں جانتی ہوں۔ میں رانی جی سے نہ ڈروں گی۔ صاف صاف کہہ دوں گی کہ وِنے میرے ہیں۔

دِنے کی حالت اس بھوکے ہوئے آدمی کی سی تھی جس کے آگے پروسی ہوئی تھالی رکھی ہو۔ بھوک سے طبیعت بے چین ہو۔ آنتیں قُل ہو اللہ پڑھ رہی ہوں۔ بھوک سے آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہو مگر تھالی میں ہاتھ نہ ڈال سکتا ہو۔ اس لئے پہلے کسی دیوتا کا بھوگ لگانا ہے۔ انہیں اب اس میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ صوفیا کی بیقراری اُن کے عمل کا نتیجہ ہے۔ انہیں تعجب ہوتا تھا کہ اُس جڑی میں ایسی کون سی تاثیر ہے۔ وہ اپنے فعل پر نادم تھے۔ دُکھی تھے اور سب سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ آسمان سے زمین پر ماتھا سے نہیں۔ صوفی سے! جب صوفیا کو معلوم ہو جائے گا کبھی نہ کبھی تو یہ نسخہ اُترے ہی گا۔ اُس وقت وہ مجھ سے اُس کا سبب پوچھے گی اور میں چھپا نہ سکوں گا۔ اُس وقت وہ مجھے کیا کہے گی۔

آخر جب انگیٹھی کی آگ ٹھنڈی ہو گئی اور صوفیا کو سردی معلوم ہونے لگی تو وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ عمل کا وقت بھی آ پہنچا۔ لیکن آج دِنے کو عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ انہیں جڑی کا امتحان ہی لینا تھا وہ ہو گیا اور انہیں ایسے عمل پہ

ہمیشہ کے لئے اعتقاد ہو گیا۔

صوفیا کو چارپائی پر بیٹھے ہی البادیم ہٹا کر رانی صاحبہ سامنے کھڑی ہوئی تاک رہی ہیں۔ اُس نے کمبل سے سر کو باہر کر کے دیکھا اور اپنی دماغی کمزوریوں پر جھنجھلا کر وہ سوچنے لگی ۔۔ آج کل مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے کیوں طرح طرح کے اندیشے ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں روز ناگوار واقعات کا خوف دل پر طاری رہتا ہے؟ جیسے مجھ میں تمیز ہی نہیں باقی رہی۔ ونے آج کل کیوں بہت کھینچے ہوئے ہیں؟ شاید وہ ڈر رہے ہیں کہ رانی جی کہیں انہیں بددعا نہ دے دیں یا خودکشی نہ کر لیں۔ ان کی باتوں میں پہلا سا جوش ہے اور نہ پہلی سی محبت۔ رانی میری زندگی کو تباہ و برباد کئے دیتی ہیں۔

انہیں خیالاتِ پریشان کے بہتے ہوئے وہ سو گئی۔ تو دیکھتی کیا ہیں۔ کہ واقعی رانی جی میرے سامنے کھڑی قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں ۔۔ ونے میرا ہے۔ وہ میرا بچہ ہے۔ اُسے میں نے پیدا کیا ہے۔ پالا پوسا ہے تو کیوں اُسے میرے ہاتھوں چھینے لیتی ہے؟ اگر تو نے اُس کو مجھ سے چھینا میرے خاندان کو داغ لگایا تو میں تم دونوں کو اس تلوار سے قتل کر دوں گی۔

صوفیا تلوار کی چمک سے گھبرا گئی۔ چلا اٹھی۔ نیند ٹوٹ گئی۔ اُس کا سارا بدن تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ دل مضبوط کر کے اُٹھی اور ونے کی کوٹھڑی میں میں جا کر اُن کے سینے سے لپٹ گئی۔ ونے کی آنکھیں لگ ہی رہی تھیں۔ انہوں نے چونک کر سر اُٹھایا۔

صوفیا۔ ونے ونے جاگو! میں ڈر رہی ہوں

ونے۔ فوراً چارپائی سے اُتر کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا ۔ کیا ہے صوفیا؟

صوفیا۔ رانی جی کو ابھی ابھی میں نے اپنے کمرہ میں دیکھا۔ ابھی وہیں کھڑی ہیں۔

وسنتی۔ صوفیا۔ اطمینان رکھو۔ تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

صوفیا۔ خواب نہیں تھا وسنتی! میں نے رانی جی کو مجسم دیکھا۔

وسنتی۔ وہ یہاں کیسے آجائیں گی؟ وہ تو نہیں ہیں۔

صوفیا۔ تم ان باتوں کو نہیں جانتی۔ وسنتی! ہر شخص کے دو قالب ہوتے ہیں۔ ایک کثیف دوسرا لطیف۔ دونوں مشابہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے۔ کہ دوسرا پہلے سے کہیں زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ وہ معمولی حالتوں میں نظر نہیں آتا۔ مگر مراقبہ یا خواب کی حالت میں کثیف جسم کا عوض بن جاتا ہے۔ رانی جی کا لطیف جسم یہاں ضرور ہے۔

دونوں نے بیٹھ کر ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ صوفیا کو اب وسنتی کے بغیر ایک لمحہ بھی چین نہ آتا۔ اسے صرف دماغی بے چینی تھی۔ نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لئے بھی بے چین رہتی۔ جن باتوں کے محض خیال سے اُسے نفرت ہوتی تھی۔ جن باتوں کی نقطہ یاد سے اُس کے چہرہ پر شرم کی سُرخی دوڑ جاتی تھی۔ وہی باتیں اب ہر وقت اُس کے دل میں موجود رہتیں۔ اُسے اپنی اس دلی کثافت پر تعجب ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ عیش و عشرت کے تصور میں محو ہو کر اُس دائرہ میں قدم رکھتی جو تاہل ہی کے لئے مخصوص ہے۔ تو رانی جی کی وہی غضب ناک صورت اُس کے رُوبرُو آکر کھڑی ہو جاتی اور وہ چونک کر کمرہ سے نکل بھاگتی۔ اس طرح اُس نے دس بارہ یوم گزارے۔ شمشیر برہنہ کے نیچے کھڑے ہوئے مجرم کی حالت بھی اتنی بُری نہ ہوتی ہوگی۔

ایک روز وہ گھبرائی ہوئی وسنتی کے پاس آئی اور بولی۔ وسنتی میں بنارس جاؤں گی۔ میں بڑی پریشانی میں ہوں۔ رانی جی یہاں مجھے چین نہ لینے دیں گی۔ اگر یہاں رہی۔ تو شاید مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مجھ پر ضرور کوئی نہ کوئی عمل کیا گیا ہے۔ میں اتنی پریشان حال کبھی نہ تھی۔ مجھے خود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں وہ نہیں رہی۔ کوئی اور ہی ہو گئی ہوں۔ میں جا کر رانی جی کے پیروں پڑوں گی۔ اُن سے اپنی خطا معاف

کرا دوں گی اور انہیں کی اجازت سے تمہیں حاصل کروں گی۔ اُن کی مرضی کے بغیر میں
تمہیں نہیں پا سکتی۔ ورنہ میرے دن تو خیریت سے نہ گزریں گے۔ میں نے مجھے خواب
میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ میں تمہارے لئے اتنی اُکتانے والی چیز ہو جاؤں گی۔ میرا
دل اتنا کمزور۔ اتنا گرویدہ کبھی نہ تھا۔

ونے نے متردد ہو کر کہا۔ صوفیا۔ مجھے اُمید ہے کہ چند روز میں تمہارے
دل کو قرار ہو جائے گا۔

صوفیا۔ نہیں ونے ہرگز نہیں۔ رانی جی نے تمہیں ایک اعلےٰ مقصد کے لئے
وقف کر رکھا ہے۔ موقوفہ شے سے مستفید ہونا مضرت رساں ہوا کرتا ہے۔ میں اُن
سے بھیک مانگوں گی۔

ونے۔ تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔

صوفیا۔ نہیں نہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میں تمہیں رانی جی کے سامنے
نہ لے جاؤں گی۔ مجھے تنہا جانے دو۔

ونے۔ اس حالت میں میں تمہیں تنہا کبھی نہ جانے دوں گا۔ اگر ایسا ہی ہے
تو میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔

صوفیا۔ وعدہ کرو کہ بلا میری اجازت رانی جی کے پاس نہ جاؤ گے۔

ونے۔ ہاں صوفیا یہ منظور ہے۔ وعدہ کرتا ہوں۔

صوفیا۔ پھر بھی دل نہیں مانتا۔ ڈر لگتا ہے۔ کہ وہاں تم جوش میں آ کر کہیں
رانی جی کے پاس نہ چلے جاؤ۔ تم یہیں کیوں نہیں رہتے؟ میں تمہیں روزمرہ خط لکھا
کروں گی۔ اور جلد سے جلد واپس آ جاؤں گی۔

ونے نے اُسے تسکین دینے کے لئے تنہا جانے کی اجازت دے دی۔ مگر اُن کا
محبت میں ڈوبا ہُوا دل یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ صوفیا اس اضطراب کی حالت
میں اتنا طویل سفر تنہا کرے۔ سوچا اُس کی نگاہ بچا کر گاڑی کے کسی دوسرے
کمرہ میں بیٹھ جاؤں گا۔ انہیں واپسی کی بہت کم اُمید تھی۔ سہیلیوں نے سُنا۔ تو

انواع واقسام کے تحفے دے کر انہیں رخصت کرنے کو آموجود ہوئے۔ مہر فوان کی کھالیں شیروں کے ناخون اور نہ جانے کیسی کیسی جڑی بوٹیوں کا انبار لگ گیا۔ ایک بھیل نے اپنی بجاری کمان نذر کی۔ صوفیا اور ونے دونوں ہی کو اس مقام سے رخصت ہوتے ہوئے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ کہ وہاں کے باشندوں کی سیدھی سادی اور سچی زندگی انہیں ایسی پسند آگئی تھی۔ کہ چھوڑ کر جاتے ہوئے دلی رنج ہوتا تھا۔ بھیل لوگ کھڑے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ کہ جلد آنا۔ ہمیں بھول نہ جانا۔ بڑھیا سیلینی تو انہیں کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔ سب کے سب اسٹیشن تک انہیں پہنچانے آئے۔ لیکن جب گاڑی کے آ جانے پر ونے سے جدا ہونے کا وقت آیا تو صوفیا ان کے گلے سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔ ونے چاہتے تھے کہ نکل جائیں اور کسی دوسری گاڑی میں بیٹھیں مگر ان کو چھوڑتی ہی نہ تھی گویا آخری ملاقات تھی۔ جب انجن نے سیٹی دی تو وہ دلی صدمے سے بیتاب ہو کر بولی — ونے مجھ سے اتنے دنوں تک کیسے رہا جائے گا؟ رو رو کر مر جاؤں گی۔ ایشور میں کیا کروں؟

ونے۔ صوفیا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔

صوفیا۔ نہیں نہیں۔ خدا کے لئے۔ میں اکیلی ہی جاؤں گی۔

ونے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے اور گاڑی چل دی۔ ذرا دیر بعد صوفیا نے کہا — تم نہ آتے تو میں شاید گھر تک نہ پہنچتی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جان نکلی جا رہی ہے۔ سچ بتانا! تم نے مجھ پہ جادو تو نہیں کر دیا۔ میں اتنی بے صبر کیوں ہوں۔

ونے نے شرمندہ ہو کر کہا۔ کیا جانے صوفی۔ میں نے ایک عمل تو کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ جادو تھا یا کچھ اور۔

صوفیا۔ سچ؟

ونے۔ ہاں بالکل سچ۔ میں تمہاری سرد مہری سے خائف ہو گیا تھا کہ مبادا تم پھر میرا امتحان لو۔

صوفیا نے ونے کی گردن میں ہاتھ ڈال دئے اور بولی — تم بڑے چھلیا ہو۔ اپنا جادو اتار لو۔ مجھے کیوں نرم چارہ بنا رہے ہو؟

ونے نے۔ کیا کبھی آتارنا نہیں سیکھا۔ یہ تو غلطی ہوئی۔

صوفیا۔ تو مجھے بھی وہی منتر کیوں نہیں سکھا دیتے؟ نہ میں اُتار سکوں گی۔ نہ تم اُتار سکو گے ––– ایک کے بعد لیکن تمہارے بن [illegible] نہ ہو پائی۔ دو میں سے ایک کو تو ہوش رہنا ہی چاہیئے۔ دونوں بے ہوش ہو جائیں گے تو بُرا ہوگا۔ اچھا بتاؤ۔ کون سا عمل کیا ہے؟

ونے نے اپنی جیب سے اس جڑی کو نکال کر دکھاتے ہوئے کہا ––– بس اس کی دھونی دیتا تھا۔

صوفیا۔ جب میں سو جاتی تھی؟

ونے۔ (زیادہ شرمندہ ہوکر) ہاں صوفیا جی۔

صوفیا۔ تم بڑے گستاخ ہو۔ اچھا وہ بوٹی مجھے دے دو۔ [illegible] ی محبت کم ہوتے دیکھوں گی تو میں بھی وہی عمل کروں گی۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے جڑی لے کر رکھ لی۔ ذرا دیر بعد اُس نے پوچھا۔ یہ تو بتاؤ۔ کہ وہاں تم رہو گے کہاں؟ میں تمہیں رانی کے پاس نہ جانے دوں گی۔

ونے۔ اب میرا کوئی دوست نہیں رہا۔ سبھی مجھ سے بدظن ہو رہے ہونگے۔ نایک رام کے گھر چلا جاؤں گا۔ تم وہیں آکر مجھ سے مل لیا کرنا۔ وہ تو اپنے گھر پہنچ ہی گیا ہوگا۔

صوفیا۔ کہیں جا کر نہ کہہ دے۔

ونے۔ نہیں۔ وہ احمق ہو مگر دغاباز نہیں ہے۔

صوفیا۔ اچھی بات ہے۔ دیکھیں رانی صاحبہ سے مراد ملتی ہے یا موت!

(۳۹)

تیسرے روز سفر ختم ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ صوفیا اور ونے دونوں ڈرتے ہوئے گاڑی سے اُترے کہ کہیں کسی شناسا سے ملاقات نہ ہو جائے۔ سونیلے پیوا جیون

چاہیں۔ اطلاع کرانی ہے۔ بہت دنوں کے بعد آپ کے درشن ہوئے۔

صوفیا۔ میں بہت اچھی طرح کھڑی ہوں۔ تم جاکر اطلاع تو کر دو۔

دربان۔ سرکار۔ ان کا حال تو آپ جانتی ہی ہیں۔ بگڑ اٹھیں گی کہ ساتھ کیوں نہ لایا۔ اطلاع کیوں دینے آیا؟

صوفیا۔ میری خاطر سے دو چار باتیں سن لینا۔

دربان اندر گیا تو صوفیا کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے کوئی پتا ہل رہا ہو۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں رانی صاحبہ غصہ میں میری وجہ سے بگڑتی ہوئی نہ آئیں یا کہلا دیں۔ کہ چلی جا۔ میں نہیں ملنا چاہتی۔ ایک مرتبہ ان سے ملے بغیر تو میں جانے کی نہیں۔ چاہے وہ ہزار بار دھتکاریں

ایک منٹ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ رانی جی شال اوڑھے ہوئے دروازہ پر آ گئیں اور اس سے لپٹ کر گلے ملیں جیسے کوئی ماں سسرال سے آئی ہوئی بیٹی کو گلے لگا لے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ روندھے ہوئے گلے سے بولیں ——— تم یہیں کیوں کھڑی رہ گئیں۔ بیٹی اندر کیوں نہ چلی آئیں؟ میں تو روز ہی تمہاری راہ دیکھتی رہتی تھی۔ تم سے ملنے کو جی تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ مجھے امید ہی تھی کہ تم آ رہی ہو پر تم آتی نہ تھیں۔ کتنی بار ریلوے اسٹیشن تک گئی کہ شاید تمہیں دیکھ سکوں۔ ایشور سے رو رو کے دعائیں کرتی تھی کہ ایک بار تم سے ملاقات ہو۔ چلو اندر چلو۔ میں نے تمہارے ساتھ جو سخت کلامی کی تھی اُسے بھول جاؤ۔ اور بات ہے، یہ بیگمنہ نکلے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ مس صوفیا کا اپنا کمرہ صاف کر دے۔ بیٹی تمہارے کمرہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ دل بھر آتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے وہ صوفیا کا ہاتھ پکڑے اپنے کمرہ میں آئیں اور اُسے اپنی بغل میں مسند پر بٹھا کر بولیں۔ آج تو میری مراد پوری ہو گئی۔ تم سے ملنے کو دل بہت بے چین تھا۔

سوفیا کا شکر دلیا اس بے لوث محبت کے اظہار سے بیقرار ہو گیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی ـــــ مجھے بھی آپ کے درشن کی بڑی خواہش تھی۔ آپ سے اپنی خطائیں معاف کرانے آئی ہوں۔

رانی: بیٹی تم دیوی ہو۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ میں نے تمہیں پہچانا نہ تھا۔ مجھے سب معلوم ہے بیٹی۔ سب سن چکی ہوں۔ تمہارا دل اتنا پاک و صاف ہے۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ آہ اگر میں پہلے سے جانتی!

یہ کہتے کہتے رانی صاحبہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ جب طبیعت ٹھہری تو پھر بولیں ـــــ اگر پہلے سے جان لی ہوتی تو آج اس گھر [illegible] کلیجہ ٹھنڈا ہوتا۔ آہ میں نے ونے کے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ تمہیں [illegible] معلوم ہوگا بیٹی جب تم نے . . . [illegible] یہ بالک سنگھ بھی [illegible] تھا؟ ہاں جب تم نے اس بے کھرے [illegible] وقت ونے کو ملامت کی تو وہ نادم ہو کر ریاست کے حکام کے پاس قیدیوں پر رحم کرنے کے لئے دوڑتا رہا۔ وہ دن دن بھر بھوکا پیاسا پڑا رہتا۔ رات رات بھر رویا کرتا۔ کبھی دیوان کے پاس جاتا۔ کبھی ایجنٹ کے پاس کبھی پولیس افسر اعلیٰ کے پاس۔ کبھی خود مہاراجہ صاحب کے پاس۔ سب سے [illegible] کر ہار گیا۔ کسی نے نہ سنی۔ [illegible] کی بات پر کسی کو ترس نہ آیا۔ [illegible] مایوس ہو کر اپنے ڈیرے پر آیا۔ [illegible] وہ [illegible] سوچتا تھا کہ میرا خط [illegible] اور کر [illegible] نہیں خط زہر کا پیالہ تھا۔ جسے [illegible] ہاتھوں سے پلایا۔ تیز خنجر تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں اس کی گردن پر پھیرا۔ میں نے لکھا تھا کہ اس [illegible] نہیں ہو تو میں تمہیں اپنا بیٹا نہ سمجھوں گی۔ تم مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ اللہ مجھ نہ جانے کتنی سخت باتیں لکھی تھیں۔ یاد کرتی ہوں تو چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ یہ خط پاتے ہی [illegible] ـــــ [illegible] نائک رام کے ساتھ یہاں آنے کو تیار ہو گیا۔ [illegible] اس کے ساتھ آئے۔ پھر [illegible] اب [illegible] آنکھیں کھلیں۔

تو ونے کو کسی گاڑی میں چھپنا تھا۔ انہوں نے ساری گاڑی میں ڈھونڈھ مارا۔ پھر اودے پور تک گئے۔ راستے میں ایک ایک اسٹیشن پر اتر کر دریافت کیا۔ مگر سب بے سود۔ بیٹی یہ ہے اس دکھیا کی رام کہانی ہے۔ میں ہتیارنی ہوں۔ مجھ سے زیادہ ابھاگنی دنیا میں کون ہوگی۔ نہ جانے ونے کا کیا حال ہوا۔ کچھ پتہ نہیں۔ وہ بڑا غیرت مند ہے بیٹی۔ بات کا بڑا دھنی۔ میری باتیں اس کے دل میں لگ گئیں۔ میرے پیارے لعل نے کبھی آرام نہ پایا۔ اس کی ساری زندگی تپسیا ہی میں گذری۔

یہ کہہ کر رانی پھر رونے لگیں۔ صوفیا بھی رو رہی تھی۔ مگر دونوں کے خیالات میں کتنا فرق تھا۔ ماں کے آنسو فکر و غم کے تھے اور صوفیا کے آنسو مسرت و جوش کے۔

ایک لمحہ بعد رانی جی نے پوچھا —— کیوں بیٹی تم نے اسے جیل میں دیکھا تھا، بہت دُبلا ہو گیا تھا؟

صوفیا۔ جی ہاں۔ پہچانے نہ جاتے تھے۔

رانی۔ اس نے سمجھا کہ باغیوں نے نہ جانے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا ہو۔ بس اسی بات پر آمادہ ہو گیا۔ آرام سے بیٹھو بیٹی۔ اب یہی تمہارا گھر ہے۔ اب میرے لئے تمہیں ونے کی جگہ پر ہو۔ اب یہ بتاؤ تم اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟ اندر دت تو کہتا تھا کہ تم ونے کو لعنت و ملامت کرنے کے تین ہی چار روز بعد وہاں سے چلی گئی تھیں۔ اتنے دن کہاں رہیں؟ سال بھر سے زیادہ تو ہو گیا ہوگا۔

صوفیا کا دل فرطِ مسرت سے اچھل رہا تھا۔ جی میں تو آیا کہ اسی وقت سارا ماجرا بیان کر دوں اور مادر کی آتشِ غم کو بجھا دوں۔ مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کا مذہبی جذبہ پھر متحرک ہو جائے۔ ونے کی طرف سے تو اب وہ بے فکر ہو گئی تھی۔ اب اسے صرف اپنی ہی فکر تھی۔ دیوتا کو نہ پا کر ہم پتھر پوجتے ہیں۔ دیوتا مل جائے۔ تو پتھر کون پوجے؟ بولی —— کہاں جاتی؟ ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی تھی۔ مایوس ہو کر یہاں چلی آئی ہوں۔

رانی۔ تم ناحق اتنے دنوں تک تکلیف اٹھاتی رہیں۔ تمہارا کیا یہ گھر نہ تھا؟

پڑا نہ بلنا پڑتی۔ تم نے بیٹے کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ اتنی بے رحمی نہ کرتے۔ تمہاری بات
اُسے اور بھی زیادہ لگی۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا تھا ہمارے ہی فائدے کے لئے کیا تھا۔
میں تو اپنے بیٹے کے ساتھ اتنی بے رحمی کبھی نہ کر سکتی۔ اب تم خود اپنی بھول پر پچھتا رہے
ہوگے۔ ہم دونوں ہی ابھاگنی ہیں۔ آہ بیچارے ونے کو تمہیں سکھ نہ ملا۔ تمہارا دل بہت
سخت ہے۔ سوچو۔ اگر تمہیں خبر ملتی کہ ونے کو ڈاکوؤں نے پکڑ کر قتل کر ڈالا ہے۔ تو
تمہاری کیا حالت ہو جاتی۔ شاید تم بھی اتنی ہی بے رحم ہو جاتیں۔ یہ انسانی خاصہ ہے
مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے؟ میں آپ ہی ہر وقت پچھتایا کرتی ہوں۔ اب تو اس
کام کو سنبھالنا ہے جو اُسے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ تم نے
اُس کے لئے بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ ذلت بدنامی سختی بھی اٹھائیں۔ اب
اُس کا کام سنبھالو۔ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھو۔ تمہیں کیا خبر ہوگی۔ کچھ
دنوں تک پربھو سیوک اس سیوا سمتی کے نائب رہے۔ کام کرنے والا ہو تو ایسا ہو۔
تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے سارا ملک چھان ڈالا اور پورے پانچ سو والنٹیر
جمع کر لئے۔ بڑے بڑے شہروں میں شاخیں قائم کر دیں۔ بہت سا روپیہ بھی جمع
کر لیا۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ ونے نے جس تحریک پر اپنی زندگی
قربان کر دی وہ پھل پھول رہی ہے۔ مگر ایشور کو نہ جانے کیا منظور تھا۔ پربھو سیوک
اور کنور صاحب میں اَن بن ہو گئی۔ پربھو سیوک اُسے ٹھیک اُسی راستہ پر لے جا
رہا تھا جس پر ونے لے جانا چاہتا تھا۔ کنور صاحب اور ان کے خاص دوست
ڈاکٹر گنگولی اُسے دوسرے ہی راستہ پر لے جانا چاہتے تھے۔ آخر پربھو سیوک نے
استعفا دے دیا۔ جب سے سمتی ڈانوا ڈول ہو رہی ہے۔ نہ جانے بچتی ہے یا
جاتی ہے۔ کنور صاحب میں ایک عجیب تبدیلی ہو گئی ہے۔ وہ اب حکام سے خائف
رہنے لگے ہیں۔ افواہ تھی کہ سرکار ان کی کل جائداد ضبط کرنے والی ہے۔ حکام کی
بدگمانیاں رفع کرنے کے لئے انہوں نے پربھو کے مجوزہ پروگرام سے اپنا اختلاف
شائع کروا دیا۔ یہی باہمی ناچاقی کا خاص سبب تھا۔ ابھی دو ماہ بھی نہیں گزرے۔

لیکن طبیعت نکھر گیا۔ سینکڑوں مشغلات۔ پیاس بھوک اپنے کام دھندوں میں لگ گئے
مشکل سے جو سو والفقیر اور ہوں گے۔ چلو بیٹی۔ تمہارا فکر و اب صاف ہو گیا
ہوگا۔ تمہارے کھانے کا بندوبست کر کے پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ ٹھہرا جن
سے، انہیں پہچانتی ہے نہ؟ پہلے یہ میری مہمان تھیں۔ اب یہ میری بہو ہیں۔ جا
ان کے لئے بعد چار نئی چیزیں تیار کرلا۔ آہ۔ آج وہ نے ہوتا تو میں اپنے ہاتھوں سے
اسے اُس کے گلے لگا دیتی۔ بیاہ رچاتی۔ شاستروں میں اس کی اجازت ہے۔

ضوفشاں کی زبردست خواہش ہوئی کہ راز کو افشا کر دوں۔ بات ہونٹوں تک آئی۔
اور رُک گئی۔ اسی وقت دفعتاً شور اُٹھا کہ لال صاحب آ گئے۔ لال صاحب آ گئے بھیا
ونے سنگھ آ گئے۔ نوکر چاکر ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ لونڈیاں باندیاں کام چھوڑ چھوڑ
کر بھاگیں۔ ایک لمحہ میں ونے نے کمرہ میں قدم رکھا۔ رانی نے انہیں سر سے پیر تک
دیکھا گویا یقین کر رہی تھیں کہ میرا ہی ونے ہے یا کوئی اور۔ پھر رانی صاحبہ اُٹھ کھڑی
ہوئیں اور بولیں۔ بہت دنوں میں آئے بیٹا۔ آؤ چھاتی سے لگا لوں۔ لیکن ونے نے
فوراً اُن کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ رانی صاحبہ کو آنسوؤں کی کثرت سے نہ کچھ سوجھتا تھا
اور نہ محبت کے انتہائی جوش کے سبب کوئی بات منہ سے نکلتی تھی۔ وہ جھکی ہوئیں ونے
کا سر پکڑ کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بھگتی اور ممتا کا کیسا قابل دید
نظارہ تھا!

لیکن ونے کو رانی کی باتیں بھولی نہ تھیں۔ ماں کو دیکھ کر اُس کے دل میں جوش
پیدا ہوا کہ اُن کے قدموں پر جان دے دوں۔ ایک مجنونانہ خیال تھا۔ جان دے
دینے کے لئے وہیں ماں کے قدموں پر زندگی کا خاتمہ کر دینے کے لئے یہ دکھلا دینے
کے لئے کہ اگرچہ میں نے قصور کیا ہے مگر بالکل بے غیرت نہیں ہوں۔ جینا نہیں جانتا
لیکن مرنا جانتا ہوں۔ اُس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سامنے دیوار پر تلوار
لٹک رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر تلوار کو اتار لایا اور اُسے یکدم کھینچ کر بولا۔ ماں
اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ کا بیٹا کہلاؤں لیکن آپ کے آخری حکم کی تعمیل میں اپنی

ساری غلطیوں کا پراسچت (کفارہ) کئے دیتا ہوں۔ مجھے آشیرواد دیجئے۔

صوفیا چیخ مار کر ونے سے لپٹ گئی۔ رانی نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی — میرے ایشور گواہ ہے۔ کہ میں تمہیں کب کا معاف کر چکی۔ تلوار چھوڑ دو۔ صوفیا۔ تو اِن کے ہاتھوں سے تلوار چھین لے۔ میری مدد کر!

ونے کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ گردن پر تلوار پھیر لینا کتنا آسان ہے۔ صوفیا نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ اور آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔ ونے مجھ پر رحم کرو۔

اُس کی نگاہ میں اتنا درد اتنا انکسار تھا کہ ونے کا دل پسیج گیا۔ اُن کی مُٹھی ڈھیلی پڑ گئی۔ صوفیا نے تلوار لے کر کھونٹی پر لٹکا دی۔

اتنے میں کنور بھرت سنگھ آکر کھڑے ہو گئے اور ونے کو سینہ سے لگاتے ہوئے بولے۔ تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے۔ مونچھیں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ اتنے دُبلے کیوں ہو؟ بیمار تھے کیا؟

ونے۔ جی نہیں۔ بیمار تو نہیں تھا۔ ایسا دُبلا بھی نہیں ہوں۔ اب ماں کے ہاتھوں کا پکوان کھا کر موٹا ہو جاؤں گا۔

کنور۔ تم دور کیوں کھڑی ہو صوفیا۔ آؤ تمہیں بھی پیار کر لوں۔ روز ہی تمہاری یاد آتی تھی۔ ونے بڑا خوش نصیب ہے کہ اُس نے تم جیسی استری پائی۔ دُنیا میں تو ملتی نہیں۔ بہشت کی میں نہیں جانتا۔ یہ بھی حُسن اتفاق ہے کہ تم دونوں ایک ہی روز آئے۔ بیٹی میں تم سے ونے کی سفارش کرتا ہوں۔ تم نے انہیں جو ملامت کی تھی اُسے سُن کر بیچارہ نایک رام عورتوں سے اتنا ڈر گیا ہے کہ میرے کی کرائی شادی سے انکار کر گیا۔ عمر بھر عورت کے لئے ترستا رہا۔ پر اب تو نام بھی نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ یہ ذات بے وفا ہوتی ہے۔ بیچارے ونے سنگھ نے جس کے لئے بدنامی سہی۔ جان پر کھیلے۔ وہی اُن سے آنکھیں پھیرے! کان پکڑے۔ اب تو مر جاؤں گا پر بیاہ نہ کروں گا۔ اپنا ہاتھ بڑھاؤ ونے! صوفیا۔ یہ ہاتھ لو تو مجھے اطمینان ہو جائے کہ تمہارے دل صاف ہو گئے۔

جاہوی۔ چلو۔ ہم لوگ باہر چلیں۔ انہیں ایک دوسرے کو منانے دو۔ انہیں کتنی ہی شکایتیں کرنی ہوں گی۔ دونوں باتیں کرنے کے لئے بے قرار ہو رہے ہوں گے۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔

جب تخلیہ ہو گیا تو صوفیا نے پوچھا — تم اتنی جلد کیسے آ گئے؟

ونے نے مسکراتے ہوئے کہا — صوفیا مجھے وہاں منہ چھپا کر بیٹھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ جان کے خوف سے چھپ رہنا بزدلوں کا کام ہے۔ ماتا جی کی جو مرضی ہو وہی سہی۔ نایک رام کہتا رہا کہ پہلے جس صاحب کو آ جانے دو پر مجھ سے نہ رہا گیا۔

صوفیا۔ خیر اچھا ہی ہوا۔ خوب آ گئے۔ ماتا جی تمہاری چرچا کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھیں۔ اُن کا دل تمہاری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔

ونے۔ تمہیں تو کچھ نہیں کہا؟

صوفیا۔ مجھ سے تو ایسا لپٹ کر گلے ملیں کہ میں متحیر ہو گئی۔ یہ انہیں سخت الفاظ کا اثر ہے جو میں نے تم سے کہے تھے۔ ماں خود چاہے بیٹے کو جتنا ڈانٹے۔ مگر اُسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا شخص اُسے کڑی نگاہوں سے بھی دیکھے۔ میری بے انصافی نے اُن کے منصفانہ جذبہ کو بیدار کر دیا۔

ونے۔ ہم لوگ بڑی اچھی ساعت میں چلے تھے۔

صوفیا۔ ہاں ونے۔ ابھی تک تو خیریت ہے۔ گوری۔ آگے کی ایشور جانے۔

ونے۔ ہم اپنا دُکھ کا حصہ بھگت چکے۔

صوفیا نے شک کے لہجہ میں کہا۔ ایشور کرے ایسا ہی ہو۔

لیکن صوفیا کو اپنے دل کے آئینہ میں کسی آنے والی ناگہانی مصیبت کا عکس نظر آ رہا تھا۔ تو وہ اُسے ظاہر نہ کر سکتی تھی مگر وہ ملول تھی۔ ممکن ہے کہ آبائی مذہب کو ترک کر دینے کا غم اس کا سبب ہو یا وہ اسے ایسی بارش خیال کر رہی ہو جو اپنی کثرت سے آئندہ ہونے والی بارش کی قلت کی خبر دیتی ہے۔ معلوم نہیں جو بات ہو۔ مگر صوفیا رات کو کھانا کھا کر سوئی۔ تو اُس کا دل کسی بوجھ سے دبا ہوا تھا۔

(۴۰)

پل کے تیار ہونے میں اب بہت تھوڑی کسر رہ گئی تھی۔ باہر سے تمباکو کی گاڑیاں لدی چلی آتی تھیں۔ کسانوں کو تمباکو کی کاشت کے لئے تقاوی تقسیم کی جا رہی تھی۔ گورنر سے پل کی افتتاحی رسم ادا کرنے کی استدعا کی گئی تھی اور انہوں نے منظور بھی کر لیا تھا تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اس لئے تعمیری کام کو اُس دن تک ختم کر دینے کے لئے بڑی مستعدی سے کام کیا جا رہا تھا۔ اُس وقت کوئی کام باقی نہ رہنا چاہئے۔ مزہ تو جب آئے کہ دعوت میں اسی پل کا بنا ہُوا سگار بھی رکھا جا وے۔ مسٹر جان سیوک صبح سے شام تک انہیں تیاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی دُونی اُجرت دے کر کام کرایا جا رہا تھا۔ پل کے قریب پختہ مکانات تیار ہو چکے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اور پاس کے کھیتوں میں مزدوروں نے جھونپڑیاں ڈال لی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف ایک میل تک جھونپڑیوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ دوکان دار لوگ بھی اپنے چھپّر ڈال لیتے تھے۔ پان مٹھائی۔ اناج۔ گڑ۔ گھی۔ ساگ۔ ترکاری اور منشی اشیاء کی دوکانیں کھل گئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بازار ہے۔ پل کے پردیسی مزدور جنہیں نہ برادری کا خوف تھا نہ رشتہ داروں کا لحاظ۔ دن بھر تو پل میں کام کرتے تھے اور رات کو تاڑی شراب وغیرہ پیتے تھے۔ جُوا روز ہوتا تھا۔ ایسے مقامات پر بدچلن عورتیں بھی آ ہی پہنچتی ہیں۔ یہاں بھی ایک چھوٹا موٹا چکلا آباد ہو گیا تھا۔ پانڈے پور کا پرانا بازار سرد ہوتا جاتا تھا۔ مٹھوا۔ گھیسو۔ ودیا دھر تینوں اکثر اس طرف سیر کو آتے اور جُوا کھیلتے۔ گھیسو تو دُودھ بیچنے کے بہانے آتا۔ ودیا دھر نوکری تلاش کرنے کے بہانے آتا اور مٹھوا صرف ان دونوں کا ساتھ دینے کے لئے آتا۔ کوئی چاٹ کھا رہا ہے۔ کوئی تنبولی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہے۔ کوئی بیشرم عورتوں سے مذاق کر رہا ہے۔ غرض مذاق حیا سوز نظر بازیاں۔ شہوانی طور طریق۔ ان سب کا ایک مدہوش کرنے والا بہاؤ سا جاری رہتا تھا۔ پانڈے پور

بھلا یہ دلچسپیاں کہاں؟ لڑکوں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تاڑی کی دوکان کے سامنے کھڑے ہوں۔ کہیں گھر کا کوئی آدمی نہ دیکھ لے۔ نوجوانوں کی مجال نہ تھی کہ کسی عورت کو چھیڑیں۔ کہیں میرے گھر جا کر کہہ نہ دے۔ سبھی ایک دوسرے سے رشتہ رکھتے تھے۔ یہاں وہ رکاوٹیں کہاں؟ ہر شخص آزاد تھا۔ اُسے نہ کسی کا خوف تھا نہ لحاظ۔ کوئی کسی پر ہنسنے والا نہ تھا۔ تلیوں کو منع کیا جاتا تھا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ اور جاؤ بھی تو اپنا کام کر کے چلے آیا کرو۔ مگر جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ کون کسی کی سُنتا تھا؟ سب سے بری حالت بجرنگی کی تھی۔ گھیسو روز ہی روپیہ بارہ آنے اُڑا لیا کرتا اور پوچھنے پر بگڑ کر کہتا۔ کیا [illegible] ہوں؟

ایک روز بجرنگی نے سُورداس سے کہا۔ سُورداس لڑکے برباد ہوئے جاتے ہیں۔ جب دیکھو چکلے ہی میں ڈٹے رہتے ہیں۔ گھیسو میں چوری کی بات کبھی نہ تھی۔ اب ایسا ہتھ لپکا ہو گیا ہے کہ سو جتن سے پیسے رکھ دو۔ کھوج کر نکال لیتا ہے۔

جگدھر سُورداس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہ باتیں سُن کر بولا۔ میری بھی وہی دُسا ہے بھائی۔ ودیادھر کو کتنا پڑھایا لکھایا۔ مڈل تک کھینچ کھانچ کر لے گیا۔ آپ بھوکا رہتا تھا۔ گھر کے لوگ کپڑوں کو ترستے تھے پر اُس کے لئے تو کسی بات کی کمی نہ تھی۔ آس تھی کہ چار پیسے کمائے گا۔ میرا بڑھاپا کٹ جائے گا۔ گھر بار سنبھالے گا۔ برادری میں مرجاد بڑھائے گا۔ سو وہ اب روج وہاں جا کر جوا کھیلتا ہے۔ مجھ سے بہانہ کرتا ہے کہ وہاں ایک بابو کے پاس کام سیکھنے جاتا ہوں۔ سُنتا ہوں کسی عورت سے اُس کی آسنائی ہو گئی ہے۔ ابھی تیلی گھر کے کئی مجور اُسے کھوجتے ہوئے میرے پاس آئے تھے۔ اُسے پا جائیں تو مار پیٹ کریں۔ وہ بھی اُسی عورت کے آسنا ہیں۔ میں نے ہاتھ پیر جوڑ کر ان کو بدا کیا۔ یہ کارکھانا کیا کھلا ہماری تباہی آ گئی۔ بھلا [illegible] چار پیسے کی آمدنی ہے۔ پہلے ایک ہی کھونچہ نہ بکتا تھا۔ اب تین تین بک جاتے ہیں۔ لیکن ایسا سونا کس کام کا جس سے کان پھٹیں؟

بجرنگی۔ ارے جوا ہی کھیلتا تب تک غنیمت تھی۔ یہاں گھیسو تو آوارہ ہو گیا

ہے۔ دیکھتے نہیں ہو صورت کیسی بگڑ گئی ہے۔ کیسی دیہہ نکل آئی تھی! مجھے پورا آسا تھی کہ اب کی دنگل مار لے گا۔ اکھاڑے کا کوئی پٹھا اُس کے جوڑ کا نہیں ہے۔ مگر جب سے چھلی چاٹ پڑ گئی ہے دن بدن گھلا جاتا ہے۔ دادا کو تم نے دیکھا تھا نا؟ دس پانچ کوس کے گرد میں کوئی کوئی اُن سے ہاتھ ملا سکتا تھا۔ چیل سے ساری توڑ دیتے تھے۔ میں نے بھی جوانی میں کتنے ہی دنگل مارے۔ تم نے تو دیکھا ہی تھا اُس پنجابی کو کیسا مارا کہ پانچ سو روپے انعام پائے اور اکھاڑوں میں دور دور تک نام ہو گیا۔ کبھی کسی مائی کے لال نے میری پیٹھ میں دھول نہیں لگائی۔ تو بات کیا تھی؟ لنگوٹ کے سچے تھے۔ مونچھیں نکل آئی تھیں۔ تب تک کسی استری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ بیاہ بھی ہو گیا۔ تب بھی محنت کسرت کی دھن میں استری کا دھیان ہی نہ کرتے تھے۔ اُسی کے بل پر اب بھی دعوے ہے کہ دس پانچ کا سامنا ہو جائے تو چھکے چھڑا دوں۔ پر اس لونڈے نے ڈونگا ڈبا دیا۔ گھورے اُستاد کہتے تھے کہ اس میں تو دم ہی نہیں ہے۔ جہاں دو پکڑیں ہوئیں نہ بھینسے کی طرح ہانپنے لگتا ہے۔

سورداس۔ میں اندھا آدمی۔ لونڈوں کے یہ چرتر کیا جانوں۔ پر سبھاگی کہتی تھی کہ مٹھوا کے ڈھنگ بھی اچھے نہیں ہیں۔ جب سے ٹیشن پہ قلی ہو گیا ہے روپیہ آٹھ آنے روج کماتا ہے۔ مدّ کسم ہے جو گھر میں ایک پیسہ بھی دیتا ہو۔ بھوجن میرے ماتھے ہے۔ جو کچھ پاتا ہے نشہ پانی میں اڑا دیتا ہے۔

جگدھر۔ تم بھی جھوٹ موٹ لاج ڈھو رہے ہو۔ نکال کیوں نہیں دیتے گھر سے؟ اپنے سر پڑے گی تو آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اپنا لڑکا ہو تو ایک بات ہے۔ بھائی بھتیجے کس کے ہوتے ہیں؟

سورداس۔ پالا تو لڑکے ہی کی طرح ہے۔ دل نہیں مانتا۔

جگدھر۔ اپنا بنانے سے تھوڑے ہی اپنا ہو جائے گا۔

ٹھاکردین بھی آ گیا تھا۔ جگدھر کی اِتی سُن کر بولا۔ بھگوان نے کیا تمہارے کرم میں کانٹے ہی بونا لکھا ہے؟ کسی کا بھی بھلا نہیں دیکھ سکتے۔

شبھو۔ وہ اپنا من کے من میں جو آئے کرے پر میرے کئے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کھا کر سوؤں اور اُس کی بات نہ پوچھوں۔

متّھا کر دیتی۔ کوئی بات کہنے کے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ سننے والے کو اچھی لگے گی یا بُری۔ جب لڑکے کو بچپنے سے پالا پوسا اس طرح کہ کوئی اپنے بیٹے کو بھی نہ پالتا، اُسے اب کیسے چھوڑ دے۔

جھنی۔ آپ کے کل جگی لڑکے جو کچھ نہ کریں تھوڑا ہے۔ ابھی دودھ کے دانت نہیں اُکھڑے۔ سبھاگی نے گھیسو کو گود میں کھلایا ہے۔ سو آج وہ اُسی سے دل لگی کرتا ہے۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ اُٹھ گیا۔ یہ تو کہو سبھاگی کی کاٹھی اچھی ہے نہیں بال پکے ہوئے ہوتے تو گھیسو سے جیٹھے ہوتے۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں اُدھر تینوں لونڈے نایک رام کے دالان میں بیٹھے ہوئے منصوبے باندھ رہے تھے۔ گھیسو نے کہا سبھاگی مارے ڈالتی ہو۔ دیکھ کر یہی جی چاہتا ہے کہ گلے لگا لوں۔ سر پر ساگ کی ٹوکری رکھ کر بل کھاتی ہوئی چلتی ہے۔ سو جان لے لیتی ہے۔ بڑی کا پھر ہے۔

ودیا دھر۔ تم تو ہو گنوار۔ پڑھے لکھے تو ہو نہیں۔ بات کیا سمجھو۔ معشوق کبھی اپنے منہ سے تھوڑا ہی کہتا ہے کہ میں راجی ہوں۔ اُس کی آنکھوں سے تاڑ جانا چاہیے۔ جتنی ہی بگڑے اتنی ہی دل سے راجی سمجھو۔ کچھ پڑھے ہوتے تو جانتے۔ عورتیں کیسے نکھرے کرتی ہیں۔

مٹھوا۔ پہلے سبھاگی مجھ سے بھی اسی طرح بگڑتی تھی۔ کسی طرح ہتھے ہی نہ چڑھے۔ بات ہی نہ سنے۔ پر میں نے ایک دن ہمت کر کے کلائی پکڑ لی اور کہا اب نہ چھوڑوں گا چاہے مار ہی ڈالو۔ مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ تیرے ہی ہاتھوں مروں گا تو سیدھے سُرگ جاؤں گا۔ وہ تو بگڑ کر گالیاں دینے لگی۔ پھر کہنے لگی — چھوڑ دو۔ کہیں کوئی دیکھ لے تو غضب ہو جائے۔ میں تیرے پاؤں لگتی ہوں۔ پر میں نے ایک نہ سنی۔ بس پھر کیا تھا۔ اُسی دن سے اُس کے چنگل میں ہوں۔

متھوا اپنی عشقیہ فتوحات کی فرضی داستانیں گھڑنے میں بڑا ہوشیار تھا۔ جاہل ہوتے پر بھی غپ مارنے میں ۔۔۔ ودیادھر کو مات کر دیا تھا۔ اپنی گزر صفتوں میں کچھ ایسا رنگ بھرتا تھا کہ دوستوں کو ان گپوڑوں پر یقین آجاتا تھا۔
گھیسو بولا۔ کیا کروں۔ میری تو ہمت ہی نہیں پڑتی۔ ڈرتا ہوں کہیں شور نہ مچادے تو آفت آجائے۔ تمہاری ہمت کیسے پڑ گئی۔
ودیادھر۔ تمہارا سر۔ جاہل جیسے تو ہو معشوق اپنے عاشق کو آجماتا ہے۔ کہ اس میں کچھ چھوٹ بھی ہے یا یونہی چھیلا بنا پھرتا ہے۔ عورت اسی کو پیار کرتی ہے جو دلاور ہو نڈر ہو۔ آگ میں کود پڑے۔
گھیسو۔ تم تیار ہو۔
ودیادھر۔ ہاں آج ہی۔
متھوا۔ گھر دیکھ لیا دادا دوار پر نیم کے نیچے سوتے ہیں۔
گھیسو۔ اس کا کیا ڈر؟ ایک دھکا لگا دوں گا۔ دور جا کر گرے گا۔
تینوں مشورہ کر کے اس سازش کے داؤں پیچ سوچتے۔ گلی بازار کی طرف چلے گئے۔ وہاں تینوں نے شراب پی۔ دس گیارہ بجے رات تک بیٹھے گانا بجانا سنتے رہے۔ شراب خانوں میں نغمہ سے ناآشنا کانوں کے لئے گانے کی کمی کبھی نہیں رہتی۔ تینوں بدمست ہو کر لوٹے تو گھیسو بولا۔ صلاح پکی ہے نا؟ آج وارا نیارا ہو جائے۔ جیت پڑے یا پٹ۔
آدھی رات گذر چکی تھی۔ چوکیدار پہرہ دے کر جا چکا تھا۔ گھیسو اور ودیادھر سورداس کے دروازہ پر گئے۔
گھیسو تم آگے چلو۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔
ودیادھر۔ نہیں تم جاؤ۔ تم گنوار آدمی ہو۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا تو بات بھی نہ بنا سکو گے۔
نشہ نے گھیسو کو آپے سے باہر کر رکھا تھا۔ کچھ یہ دکھانا بھی منظور تھا کہ

تم لوگ مجھے احمق سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں۔ وہ جھونپڑی میں گھس ہی پڑا اور جا کر شبھاگی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شبھاگی چونک کر اٹھ بیٹھی اور زور سے بولی — کون ہے؟ چل ہٹ!

گھسیو۔ چپ چپ بیٹھا ہوں۔

شبھاگی۔ چور چور! چور چور!

سُور داس جاگا۔ وہ اٹھ کر جھونپڑی میں جانا چاہتا تھا کہ کسی نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔ کون ہے؟ جب کچھ جواب نہ ملا۔ تو اس نے بھی اس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور چلایا "چور چور!" محلہ والے یہ آوازیں سنتے ہی لاٹھیاں لے کر نکل پڑے۔ بجرنگی نے پوچھا۔ کہاں گیا؟ ہاں؟ شبھاگی بولی میں پکڑے ہوئے ہوں۔ لوگوں نے جا کر پوچھا تو اندر شبھاگی گھسیو کو پکڑے ہوئے ہے اور باہر سور داس وِدیادھر کو۔ مٹھوا نایک رام کے دروازہ پہ کھڑا تھا۔ یہ شور و غل سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک دم میں سارا محلہ ٹوٹ پڑا۔ چور کے پکڑنے کو شاید ہی کوئی نکلے مگر پکڑے ہوئے چور پر زور آزمائی کے لئے سبھی پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں آکر دیکھتے ہیں تو نہ چور نہ چور کا بھائی بلکہ اپنے ہی محلہ کے لونڈے ہیں۔

ایک عورت۔ یہ زمانے کی خوبی ہے کہ گاؤں گھر کا بچار بھی اٹھ گیا۔ کسی کی آبرو بچے گی؟

ٹھاکر دین۔ ایسے لونڈوں کا سر کاٹ لینا چاہئے۔

نایک رام۔ چپ رہو۔ ٹھاکر دین۔ یہ گُسّا کرنے کی بات نہیں۔ رونے کی بات ہے۔

جگدھر۔ بجرنگی۔ جمنی سر جھکائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ بجرنگی کو تو ایسا غصہ آ رہا تھا کہ گھسیو کا گلا دبا دے۔ یہ بھیڑ اور پہل چل دیکھ کر کئی کانسٹیبل بھی آ پہنچے۔ اچھا شکار پھنسا۔ مٹھیاں گرم ہوں گی۔ فوراً دونوں نوجوانوں کی کلائیاں پکڑ لیں۔ جمنی نے رو کر کہا۔ یہ لونڈے منہ میں کالکھ لگانے

والے ہیں۔ اچھا ہوگا۔ جو چھ مہینے کی سجا کاٹ آئیں گے تب اُن کی آنکھیں کھلیں گی۔ سمجھاتے سمجھاتے ہار گئی کہ بیٹا۔ مدرا مت پیو۔ پر کون سُنتا ہے۔ اب جاکر چکی پیسو۔ اس سے اچھا تھا کہ بانجھ ہی رہتی۔

نایک رام۔ اچھا۔ اب اپنے اپنے گھر جاتے جاؤ۔ جمعدار لونڈے ہیں چھوڑ دو۔ آؤ چلیں۔

جمعدار۔ ایسا نہ کہو پنڈا جی۔ کوتوال صاحب کو معلوم ہو جائے گا تو سمجھیں گے کہ ان سبھوں نے کچھ لے کر چھوڑ دیا ہوگا۔

نایک رام۔ کیا کہتے ہو سُورداس۔ اب یہ لوگ جائیں نا؟

ٹھاکر دین۔ ہاں اور کیا۔ لڑکوں سے بھُول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ کام تو بُرا کیا پر اب جانے دو۔ جو ہُوا سو ہُوا۔

سُورداس۔ میں کون ہوتا ہوں کہ جانے دوں؟ جانے دیں کوتوال ڈپٹی حاکم لوگ۔

بجرنگی۔ سورداس۔ بھگوان جانتا ہے جان کا ڈر نہ ہوتا تو اس دُشٹ کو گلا ہی چبا جاتا۔

سُورداس۔ اب تو حاکم لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ چھوڑیں چاہے ڈنڈ دیں۔

بجرنگی۔ تم کچھ نہ کہوگے تو کچھ نہ ہوگا۔ جمعداروں کو ہم منا لیں گے۔

سُورداس۔ تو بھیا۔ صاف صاف بات یہ ہے کہ میں بنا سرکار میں رپٹ کئے نہ مانوں گا۔ چاہے سارا محلہ میرا دُشمن ہو جائے۔

بجرنگی۔ کیا یہی ہوگا۔ سُورداس؟ گاؤں گھر اور محلے کا کچھ لحاج نہ کروگے؟ لڑکوں سے بھُول تو ہو ہی گئی۔ اب اُن کی جندگانی کھراب کرکے کیا ملے گا؟

جگدھر۔ سبھاگی ہی کہاں کی دیبی ہے۔ جب سے بھیرو نے چھوڑ دیا۔ سارا محلہ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہے۔ بنا پہلے کسی سانٹھ گانٹھ کے کوئی کسی کے گھر میں نہیں گھُستا۔

سُور داس۔ تو یہ سب مجھ سے کیا کہتے ہو بھائی؟ سبھاگی دیبی ہو چاہے ہرجائی۔ وہ جانے اس کا کام جانے۔ میں نے اپنے گھر میں چوروں کو پکڑا ہے۔ اس کی تھانے میں رپٹ جرور کروں گا۔ تھانہ والے نہ سُنیں گے تو حاکم سے کہوں گا۔ لڑکے لڑکیوں کی راہ میں روڑے نہیں۔ شہیدوں کی راہ چلیں تو شہدے ہیں۔ بدمعاشوں کے اور کیا سینگ پونچھ ہوتی ہے؟

بجرنگی۔ سور کہے دیتا ہوں۔ سکھون ہو جائے گا۔

سُور داس۔ تو کیا ہو جائے گا؟ کون میرے نام کو کوئی رونے والا بیٹھا ہُوا ہے؟

نایک رام نے وہاں ٹھہرنا بیفائدہ سمجھا۔ کیوں نیند خراب کریں۔ چلنے لگے تو جگدھر نے کہا۔ پنڈا جی تم بھی جاتے ہو۔ یہاں کیا ہوگا؟

نایک رام نے جواب دیا۔ بھائی سُور داس مانے گا نہیں۔ چاہے لاکھ کہو۔ میں بھی تو کہہ چکا۔ کہو اور ہاتھ پیر پڑوں پر بھنا ہوا تو کچھ نہیں۔ بھیسو اور ودیا کی تو بات ہی کیا۔ متھوا بھی ہوتا تو سُور داس اُس کو بھی نہ چھوڑتا۔ ہٹیلا آدمی ہے۔

جگدھر۔ ایسا کہاں کا دھنا سیٹھ ہے کہ اپنے من ہی کی کرے گا۔ تم چلو۔ ذرا ڈانٹ کر کہو تو۔

نایک رام لوٹ کر سُور داس سے بولے۔ سُور کبھی کبھی گاؤں گھر کے ساتھ ملاہیا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لڑکوں کی جندگانی برباد کر کے تم کیا پاؤ گے؟

سُور داس۔ پنڈا جی۔ تم بھی اوروں کی سی کہنے لگے۔ دُنیا میں کہیں نیاؤ ہے کہ نہیں؟ کیا عورت کی آبرو کچھ ہوتی ہی نہیں؟ سُبھاگی گریب ہے۔ اَبلا ہے۔ مجوُری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہے۔ اس لئے جو کوئی چاہے اُس کی آبرو بگاڑ دے؟ جو چاہے اُسے ہرجائی سمجھ لے؟

سارا محلہ ایک ہو گیا۔ یہاں تک کہ دونوں کانسٹبل بھی محلہ والوں کی سی کہنے لگے۔ ایک بولا۔ عورت کھُد (خود) ہرجائی ہے۔

دوسرا۔ محلّہ کے آدمی چاہیں تو کھوٹ نکالیں۔ یہ کون سا بڑا جرم ہے۔
پہلا۔ سہادت ہی نہ ملے گی تو جرم کیا ثابت ہوگا۔
سُور داس۔ سہادت تو جب نہ ملے گی جب میں مر جاؤں گا۔ کیا کہا، وہ ہرجائی ہے؟
کانسٹیبل۔ ہرجائی تو ہے ہی۔ ایک بار نہیں سو بار اُسے بازار میں ترکاری بیچتے ہنستے دیکھا ہے۔
سُور داس۔ تو بازار میں ترکاری بیچنا اور ہنسنا ہرجائیوں کا کام ہے؟
کانسٹیبل۔ ارے تو جاؤ گے تو تھانہ ہی تک نا؟ وہاں بھی تو ہمیں سے رپٹ کرو گے۔
نایک رام۔ اچھی بات ہے۔ اسے رپٹ کرنے دو۔ میں دیکھ لوں گا۔ درو گا جی کوئی گیر آدمی نہیں ہیں۔
سُور داس۔ ہاں۔ درو گا جی کے چوٹ[illegible] آئے کریں۔ دھرم پاپ اُن کے ساتھ ہے۔
نایک رام۔ کہتا ہوں، محلّہ میں نہ رہنے پاؤ گے۔
سُور داس۔ جب تک جیتا ہوں۔ تب تک رہوں گا۔ مرنے کے بعد دیکھی جائے گی۔
کوئی سُور داس کو سمجھاتا تھا کوئی دھمکاتا تھا۔ وہاں وہی لوگ رہ گئے تھے۔ جو اس معاملہ کو دبا دینا چاہتے تھے۔ جو لوگ اسے بڑھانا چاہتے تھے وہ نایک رام کے خوف سے کچھ کہہ نہ سکنے کے سبب اپنے گھر کو چلے گئے تھے۔ ان وفادق دیوں سے بیچ میں پڑنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ پر سُور داس اپنی بات پر ایسا اڑا تھا کہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ اسے تھانہ میں جا کر رپٹ لکھوانے دو۔ ہم لوگ تھانہ دار ہی کو راضی کر لیں گے۔ دس بیس روپے سے کم کھائیں گے۔
نایک رام۔ ارے وہی لالہ تھانہ دار ہیں نا؟ انہیں تو میں چٹکی بجاتے

بھاگتے ... لگا۔ میری پرانی جان پہچان ہے۔

جگدھر۔ پنڈا جی میرے پاس تو روپے بھی نہیں ہیں۔ میری جان کیسے بچے گی؟

نایک رام۔ میں بھی پردیس سے لوٹا ہوں۔ ہاتھ خالی ہے۔ جا کر کہیں روپے کی فکر کرو۔

جگدھر۔ میں سورداس کو اپنا ہیرا سمجھتا تھا۔ جب کبھی کام پڑا ہے۔ اُس کی مدد لی ہے۔ اسی کے پیچھے بھیرو سے میری دشمنی ہو گئی۔ اور اب بھی یہ میرا ہی ہوا۔

نایک رام۔ یہ کسی کا نہیں ہے اور سب کا ہے۔ جا کر دیکھو۔ جہاں سے سو پچیس روپے لے سکے ہی آؤ۔

جگدھر ... روپے کس سے مانگنے جاؤں؟ کون پتیائے گا۔

نایک ... ستے ودیا کی اماں سے کوئی گہنا ہی مانگ لو۔ اس بکھت تو پران بچیں۔ پھر ... دینا۔

جگدھر بہانے کرنے لگا۔ وہ چھلا تک نہ دے گی۔ میں مر بھی جاؤں تو کفن کے لئے روپے نہ نکالے گی۔ یہ کہتے کہتے وہ رونے لگا۔

نایک رام کو اس پر ترس آ گیا۔ روپے دینے کا وعدہ کر لیا۔

سورداس بڑے سویرے تھانے کی طرف چلا تو بجرنگی ... نے کہا۔ سورداس تمہارے سر پر موت کھیل رہی ہے۔ جاؤ۔

جمنی سورداس کے پیروں سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی بولی۔ سورداس تم ہمارے بیری ہو جاؤ گے۔ یہ کبھی آسا نہ تھی۔

بجرنگی نے کہا۔ نیچ ہے اور کیا۔ ہم اس کو پالتے ہی چلے آتے ہیں۔ بھوکوں کبھی نہیں سونے دیا۔ بیماری آرامی میں کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب کبھی دودھ مانگنے آیا خالی ہاتھ نہیں جانے دیا۔ اس نیکی کا یہ بدلہ! سچ کہا ہے کہ اندھوں میں سیل مروت نہیں ہوتی۔ ایک پاسین کے پیچھے۔

نایک رام پہلے ہی لپک کر تھانہ جا پہنچے اور تھانہ دار کو سارا ماجرا سنا کر

کہا۔ پچاس کا ڈول ہے۔ کم نہ زیادہ۔ رپٹ ہی نہ لکھئے۔

داروغہ نے کہا۔ پنڈت جی۔ جب تم درمیان میں ہو تو سو پچاس کی کوئی بات نہیں لیکن اندھے کو معلوم ہو جائے گا کہ رپٹ نہیں لکھی گئی تو سیدھا ڈپٹی صاحب کے پاس جا پہنچے گا۔ پھر میری جان آفت میں پڑ جائے گی۔ نہایت روکھا افسر ہے۔ پولیس کا تو جانی دشمن ہی سمجھو۔ اندھایوں ملنے والا اسامی نہیں ہے۔ جب اس نے چتاری کے راجہ صاحب کے ناکوں چنے چبوا دئے تو دوسروں کی کیا گنتی ہے؟ بس یہی ہو سکتا ہے کہ جب میں تحقیقات کے لئے آؤں تو آپ لوگ کسی کو شہادت نہ دینے دیں۔ عدم ثبوت میں معاملہ خارج ہو جائے گا۔ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تمہارے لئے کسی کو مجبور نہ کروں گا اور گواہوں کے بیانات میں کبھی کچھ کانٹ چھانٹ کر دوں گا۔

دوسرے روز شام کے وقت داروغہ جی تحقیقات کرنے گئے۔ محلّے کے سب لوگ جمع ہوئے مگر جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے رات کو کسی کی "چور چور" کی آواز نہیں سُنی۔ میں نے کسی کو سورداس کے دروازہ پر نہیں دیکھا۔ میں تو گھر میں دروازہ بند کئے پڑا سوتا تھا۔ یہاں تک کہ ٹھاکردین نے بھی صاف کہا۔ صاحب میں کچھ نہیں جانتا۔

داروغہ نے سورداس پر بگڑ کر کہا۔ جھوٹی رپٹ کرتا ہے۔ بدمعاش!

سُورداس۔ رپٹ جھوٹی نہیں ہے۔ سچی ہے۔

داروغہ۔ تیرے کہنے سے سچی مان لوں۔ کوئی گواہ بھی ہے؟

سورداس نے محلّہ والوں کو مخاطب کر کے کہا۔ یارو سچی بات کہنے سے مت ڈرو۔ میلا مروّت اسے نہیں کہتے کہ کسی عورت کی آبرو بگاڑ دی جائے اور لوگ اس پر پردہ ڈال دیں۔ کسی کے گھر میں چوری ہو جائے اور لوگ چھپا لیں۔ اگر یہی حال رہا تو سمجھ لو کہ کسی کی آبرو نہ بچے گی۔ بھگوان نے سبھی کو بہو بیٹیاں دی ہیں۔ کچھ ان کا بھی خیال کرو۔ عورت کی آبرو کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے پیچھے سر کٹ جاتے ہیں۔ لہو کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ میں اور کسی سے نہیں پوچھتا۔ ٹھاکردین

تمہیں بھگوان کا ڈر ہے۔ پہلے تمہیں آئے تھے۔ تم نے یہاں کیا دیکھا؟ کیا میں اور سبھاگی دونوں گھیسو اور ہریا دھر کا ہاتھ نہیں پکڑے ہوئے تھے؟ دیکھو منہ دیکھی نہیں۔ ساتھ کوئی نہ جائے گا۔ جو کچھ دیکھا ہے سچ سچ کہہ دو۔

ٹھاکر دین دھرم سے ڈرتا تھا۔ یہ باتیں سن کر خوفزدہ ہو گیا۔ بولا۔ چوری ڈاکے کی بات تو میں کچھ نہیں جانتا۔ یہی پہلے بھی کہہ چکا۔ بات بدلنی نہیں آتی۔ ہاں جب میں آیا تو تم اور سبھاگی دونوں لڑکوں کو پکڑے چلا رہے تھے۔

سورداس۔ میں ان دونوں کو ان کے گھر سے تو نہیں پکڑ لایا تھا؟

ٹھاکر دین۔ یہ بھگوان جانیں۔ ہاں چور چور کی آواز میرے کان میں پڑی تھی۔

سورداس۔ اچھا اب میں تم سے پوچھتا ہوں جمعدار۔ تم آئے تھے نا؟ بولو یہاں جھاڑ تھا کہ نہیں۔

کانسٹیبل نے ٹھاکر دین کو بدلتے دیکھا تو ڈرا کہ اندھا دو چار آدمیوں کو اور لائے گا تو ہم جھوٹے بنیں گے۔ بولا۔ ہاں جھاڑ کیوں نہیں تھا۔

سورداس۔ گھیسو کو سبھاگی پکڑے ہوئے تھی کہ نہیں؟ ہریا دھر کو میں پکڑے ہوئے تھا کہ نہیں؟

کانسٹیبل۔ چوری ہوتے ہم نے نہیں دیکھی۔

سورداس۔ ہم ان دونوں لڑکوں کو پکڑے ہوئے تھے کہ نہیں؟

کانسٹیبل۔ ہاں پکڑے ہوئے تھے پر چوری ہوتے نہیں دیکھی۔

سورداس۔ داروغہ جی۔ ابھی کو ابھی ملی کہ اور دوں؟ یہاں ننگے لچے نہیں بستے۔ بھلے مانسوں ہی کی بستی ہے کہئے۔ بجرنگی سے کہلا دوں۔ کہئے گھیسو سے کہلا دوں۔ کوئی جھوٹی بات نہیں کہے گا۔ مروت مروت کی جگہ ہے۔ محبت محبت کی جگہ ہے۔ مروت اور محبت کے پیچھے کوئی اپنا پرلوک بگاڑے گا۔

بجرنگی نے دیکھا۔ اب لڑکے کی جان نہیں بچتی تو اپنا ایمان کیوں بگاڑیں۔ داروغہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا — داروغہ جی۔ سورداس جو بات

کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے جیسے نے جیسی کرنی کی ہے ویسی بھوگے۔ ہم کیوں اچھا پر لوک بگاڑیں؟ لڑکا ایسا نالائق نہ ہوتا تو آج کیوں منہ میں کالکھ لگتی؟ جب اُس کا چلن ہی بگڑ گیا تو میں کہاں تک بچاؤں گا؟ ڈنڈ ہوئے گا تو آپ آنکھیں کھلیں گی۔ ہوا بدل گئی۔ ایک لمحہ میں شہادتوں کا تانتا بندھ گیا۔ دونوں ملزم حراست میں لے لئے گئے۔ مقدمہ چلا اور تین تین مہینے کی سزا ہو گئی۔ بجرنگی اور جگدھر دونوں سورداس کے معتقد تھے۔ نایک رام کا یہ کام تھا کہ سب سے سورداس کے گن گایا کھان کیا کرے۔ اب یہ تینوں اُس کے دشمن ہو گئے۔ دو بار پہلے بھی وہ اپنے محلہ سے برے چکا تھا۔ مگر اُن دونوں موقعوں پر کسی کو اُس کی ذات سے اتنا صدمہ نہ پہنچا تھا۔ اب کے تو اُس نے بڑا زبردست قصور کیا تھا۔ جمنی جب سورداس کو دیکھتی تو سو کام چھوڑ کر اُسے کوستی۔ سُبھاگی کو گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک ہُوا کہ مٹھوا نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ رات کو بھی اسٹیشن ہی پر رہ جاتا۔ اپنے ساتھیوں کی حالت دیکھ کر اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ نایک رام تو اتنے برہم تھے کہ سورداس کے دروازہ کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ چکر کھا کر آتے جاتے۔ بس اُس کے ساتھیوں میں لے دے کے ایک بھیرو رہ گیا۔ ہاں کبھی کبھی دوسروں کی نظر بچا کر ٹھاکر دین بھی خیریت کا حال پوچھ جاتا۔ اور تو اور دیا گر بھی اُس سے کنارہ کرنے لگے کہ کہیں لوگ اُس کا دوست سمجھ کر مجھے دان دچھنا دینا بند نہ کر دیں۔ سچائی کے دوست کم ہوتے ہیں۔ دشمنوں کی تعداد سے کہیں کم۔

(۱۴)

پربھو سیوک نے تین سال تک امریکہ میں رہ کر اور ہزاروں روپے خرچ کر کے جو تجربہ اور ہنر حاصل کیا تھا وہ مسٹر جان سیوک نے اُن کی صحبت سے اتنے ہی مہینوں میں حاصل کر لیا تھا۔ اتنا ہی نہیں پربھو سیوک کی طرح وہ صرف خیالات ہوائی راستہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے پر قانع نہ تھے۔ اُن کی نگاہ آگے پیچھے دائیں بائیں

بھی رہتی تھی۔ ماہرین میں ایک تنگ دلی ہوتی ہے جو اُن کی نگاہوں کو محدود رکھتی ہے۔ وہ کسی مسئلہ پر آزاد ہو کر وسیع نگاہ نہیں ڈال سکتے۔ ضابطہ اصول اور روایات اُن کی نگاہوں کو پھیلنے نہیں دیتیں۔ طبیب ہر مرض کی دوا کتابوں میں تلاش کرتا ہے۔ وہ صرف تشخیص کا بندہ ہے اور علامات کا غلام۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کتنے ہی مریضوں کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ عقل سلیم اگر تفصیلات پر قادر نہیں۔ تو تعصبات سے بھی آزاد ہوتی ہے۔ وہ کسی مسئلہ پر مجموعی حیثیت سے غور کر سکتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی یہی باعث ہے کہ دفتر وزارت میں بیٹھا ہوا فوجی وزیر سپہ سالار پر حکومت کرتا ہے۔ پربھو سیوک کی علیحدگی سے مسٹر جان سیوک ذرا بھی برداشتہ خاطر نہیں ہوئے۔ وہ دوگنے حوصلے سے کام کرنے لگے۔ کاروباری شخص تھے۔ جتنی آسانی سے دفتر میں بیٹھ کر بہی کھاتہ لکھ سکتے تھے۔ اُتنی ہی آسانی سے موقع پڑنے پر وہ انجن کے پہیوں کو بھی چلا سکتے تھے۔ پہلے کبھی کبھی سرسری نگاہوں سے مل کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ اب باقاعدگی کے ساتھ اوقات معینہ پر جاتے۔ اکثر دن کا کھانا وہیں کھاتے اور شام کو گھر جاتے کبھی کبھی رات کے نو دس بج جاتے۔ وہ پربھو سیوک کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ میں نے تمہارے ہی بھروسہ پر یہ کام نہیں شروع کیا۔ کتّے کے نہ بولنے پر بھی سویرا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ اُن کی زر پرستی اولاد کی محبت پر مبنی نہ تھی۔ وہ ان کی زندگی کا خاص جزو اور اُن کے چشمۂ حیات کا اصلی منبع تھی۔ دنیا کی اور سبھی باتیں ضمنی تھیں۔

مزدوروں اور کاریگروں کے لئے مکانات تعمیر کرانے کا مسئلہ ابھی حل نہ ہوا تھا۔ اگرچہ مجسٹریٹ ضلع سے اُنھوں نے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا مگر چتاری کے راجہ صاحب کی طرف سے اُنہیں بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ صاحب ایک بار عوام کی مرضی کے خلاف چل کر اس قدر بدنام ہو چکے تھے کہ اُس سے کہیں زیادہ اہم نتیجے کی اُمید بھی اُنہیں ایسی فضیحت کے لئے تیار نہ کر سکتی تھی۔

مِل بھی مزدوروں پر چل رہی تھی مگر مزدوروں کے مکانات کا سد باب ہوتا اُس کی توقع نہیں
رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ جان سیوک اسی اُدھیڑ بن میں پڑے رہتے تھے۔
اتفاقاً وقتی حالات میں کچھ ایسا تغیر ہوا کہ یہ مشکل مسئلہ بھی کسی خاص کوشش
کے بغیر ہی حل ہو گیا۔ پربھو سیوک کی علیحدگی نے وہ کام کر دکھایا جو شاید اُن کی مخالفت
سے نہ ہو سکتا۔
جب سے صوفیا اور ونے آ گئے تھے سمتی خوب ترقی کر رہی تھی۔ اُس کی سیاسی رفتار
روز بروز تیز ہو جاتی تھی۔ کنور صاحب نے جتنی آسانی سے پہلی مرتبہ حکام کے شکوک
رفع کر دئیے تھے اتنی آسانی سے اب کے نہ کر سکے۔ اب مسئلہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہو گیا
تھا۔ پربھو سیوک کو استعفا دینے کے لئے مجبور کرنا مشکل نہ تھا۔ مگر ونے کو گھر
سے بدر کر کے اُسے حکام کے رحم پر چھوڑ دینا کہیں زیادہ مشکل تھا۔ اس میں شبہ
نہیں کہ کنور صاحب بے خوف آدمی تھے۔ حب الوطنی کے رنگ میں رنگے ہوئے
آزاد۔ بے لوث اور دُور اندیش۔ اُن کی زندگی اتنی سادہ اور صاف تھی کہ لوگ
اُنہیں تارک الدنیا کہا کرتے تھے۔ اُنہیں عیش و عشرت کے لئے اتنی بڑی جائداد
کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔ مگر ظاہرا طریقہ پر وہ حکام کے مورد عتاب بننے کے
لئے تیار نہ تھے۔ وہ قومی کام کے لئے اپنا سب کچھ دے سکتے تھے۔ مگر اس طرح
کہ امانت کی باگ ڈور اُن کے ہاتھوں میں رہے۔ اُن میں اُس قربانی کی ہمت نہ تھی۔
جو بالکل بے غرضی اور بے لوثی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اُنہیں یقین تھا کہ ہم آڑ میں رہ
کر اس سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں جتنا کہ سامنے آ کر۔ ونے کی اور ہی
رائے تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ہم جائداد کے لئے اپنے ضمیر کی آزادی کا خون کیوں کریں۔
ہم جائداد کے مالک بن کر رہیں گے نہ اس کے غلام بن کر نہیں۔ اگر دولت پرستی
سے نجات پا سکے تو اس ریاضت کا نتیجہ کیا ہوا۔ یہ تو گناہ بے لذت ہے۔ بے
نیازی کے لئے ہی تو یہ ریاضت اختیار کی گئی ہے۔ کنور صاحب اس کا یہ جواب
دیتے کہ ہم جائداد کے مالک نہیں بلکہ محافظ ہیں۔ یہ جائداد آئندہ نسلوں کی امانت

ہے ہمیں کیا اختیار ہے کہ ہم اُن نسلوں سے وہ آلام چھین لیں جو اُنہیں وراثتاً ملنا
چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اتنے معیار پسند نہ ہوں یا اُنہیں وقتی حالات کے
تبدیل ہو جانے سے نفس کشی کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے۔ کہ
اُن میں وہ فطرتی اوصاف نہ ہوں جن کے سامنے جائداد کوئی چیز نہیں۔ ایسے ہی دلائل
سے وہ ونے کی تشفی کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ انچ فنڈ کا جبر
دولت وشہرت سے آرام وعزت حاصل کرنے کے بعد وہ ترک اور استغناء کا
واقعی مطلب ہی نہ سمجھ سکتے تھے۔ وہ اولاد کے لیے جائداد نہ چاہتے تھے۔ جائداد کے
لئے اولاد چاہتے تھے۔ جائداد کے مقابلہ میں اولاد کی حیثیت ثانوی تھی۔ اُنہیں
حکام کی خوشامد سے نفرت تھی۔ وہ حکام کے ہاں میں ہاں ملانا معیوب سمجھتے تھے۔
مگر حکام کی نظروں میں مشتبہ ہو جانا اس حد تک کہ وہ دشمنی پر آمادہ ہو جائیں
انہیں محض حماقت معلوم ہوتی تھی۔ کنور صاحب کے ہاتھوں میں ونے کو راہ راست
پر لانے کی ایک ہی تدبیر تھی۔ وہ یہ کہ صوفیا سے اُس کی شادی ہو جائے۔ اس طرح
زنجیروں میں جکڑ کر وہ اُس کے اُٹھتے ہوئے جوش کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن
اب جو تاخیر تھی وہ صوفیا کی طرف سے۔ صوفیا کو اب بھی اندیشہ تھا کہ اگرچہ رانی صاحبہ
اس وقت مجھ پر خصوصاً مہربان ہیں مگر اُنہیں دل سے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔
اُس کا یہ اندیشہ بالکل بے بُنیاد بھی نہ تھا۔ رانی بھی صوفیا سے محبت کر سکتی تھیں
اور کرتی تھیں۔ وہ اس کی عزت کر سکتی تھیں۔ اور کرتی تھیں۔ مگر وہ اپنی بہو میں
ترک تعلق و استغناء خود غرض کی بہ نسبت حیا۔ سادگی اور خاندانی شرافت
کا ہونا زیادہ ضروری خیال کرتی تھیں۔ وہ چھوڑنے والی بہو نہیں بلکہ لپٹنے والی
بہو چاہتی تھیں۔ مگر وہ اپنے دلی خیالات کو بھول کر بھی زبان پر نہ لاتی تھیں۔
نہیں۔ بلکہ وہ ایسے خیالات کو اپنے دل میں آنے ہی نہ دینا چاہتی تھیں۔ وہ
ایسے احسان فراموشی سمجھتی تھیں۔

کنور صاحب کئی روز تک اسی فکر میں مُبتلا رہے۔ مسٹر جان سیوک سے

گفتگو کئے بغیر شادی کیسے طے ہوتی؟ آخر ایک دن اپنی مرضی کے خلاف ہونے پر بھی وہ مجبوراً اُن کے پاس گئے۔ شام ہو گئی تھی۔ مسٹر سیوک ابھی ابھی مِل سے واپس آئے تھے۔ اور مزدوروں کے مکانات کی تجویز کو سامنے رکھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ کنور صاحب کو دیکھتے ہی اُٹھے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔

کنور صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے بولے۔ آپ ونے اور صوفیا کی شادی کے متعلق کیا تجویز کرتے ہیں؟ آپ میرے دوست اور صوفیا کے والد ہیں اور دونوں ہی رشتوں کے سبب مجھے آپ سے یہ کہنے کا حق ہے کہ اب اس کام میں دیر نہ کیجئے۔

جان سیوک۔ دوستی کے تعلق سے آپ مجھ سے جو چاہے خدمت لے سکتے ہیں۔ لیکن (متانت سے) صوفیا کا والد ہونے کے تعلق سے مجھے کچھ تجویز کرنے کا حق نہیں ہے۔ اُس نے مجھے اِس حق سے محروم کر دیا ہے۔ ورنہ اُسے یہاں آئے اتنے دن ہو گئے کیا ایک مرتبہ بھی یہاں تک نہ آتی؟ اس نے ہم سے یہ حق چھین لیا ہے۔ اتنے ہی میں مسز سیوک بھی آگئیں اور شوہر کی باتیں سُن کر بولیں۔ میں تو مر جاؤں گی پر اُس کی صورت نہ دیکھوں گی۔ ہمارا اُس سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔

کنور۔ آپ لوگ صوفیا کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ جب سے وہ یہاں آئی ہے ایک روز بھی گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اس کا سبب فقط شرم ہے اور کچھ نہیں۔ شاید ڈرتی ہے کہ باہر نکلوں اور کسی شناسا سے ملاقات ہو جائے تو اُس سے کیا باتیں کروں گی۔ ذرا دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ ہم میں سے کوئی بھی اُس کی جگہ ہوتا تو اُس وقت دل میں کیسے خیالات ہوتے۔ اس بارہ میں وہ قابل معافی ہے۔ میں تو اِسے اپنی بدقسمتی سمجھوں گا۔ اگر آپ لوگ اُس سے اِس طرح بے تعلق ہو جائیں گے۔ اب شادی میں تاخیر نہ ہونی چاہیئے۔

مسز سیوک۔ خدا وہ دن نہ لائے۔ میرے لئے تو وہ مر گئی۔ میں اُس کا فاتحہ پڑھ چکی اور اُس کے نام کو جتنا رونا تھا رو چکی۔

کنور۔ یہ زیادتی آپ لوگ میری ریاست کے ساتھ کر رہے ہیں۔ شادی

ہی ایک ایسی تدبیر ہے جو ونے کی خود سری کو زائل کر دے گی۔

جان سیوک۔ میری تو رائے ہے کہ آپ ریاست کو کورٹ آف وارڈ کے سپرد کر دیجیے۔ گورنمنٹ عالیہ آپ کی تجویز کو بخوشی منظور کرے گی اور آپ کے متعلق اس کا سارا شبہ دور ہو جائے گا۔ اس وقت کنور ونے سنگھ کی سیاسی بدعنوانیوں کا ریاست پر ذرا بھی اثر نہ پڑے گا۔ اور اگرچہ اس وقت ان کو آپ کی یہ تجویز بری معلوم ہو گی۔ مگر کچھ روز بعد جب ان کے خیالات میں پختگی آ جائے گی۔ تو وہ آپ کے ممنون ہوں گے اور آپ کو اپنا سچا بہی خواہ خیال کریں گے۔ ہاں اتنی عرض اور ہے کہ اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے آپ اپنے کو خوب مضبوط بنا لیں۔ اس وقت اگر آپ کی طرف سے ذرا بھی پس و پیش ہوا تو آپ کی ساری کوشش بیکار جائے گی۔ آپ گورنمنٹ کی بدگمانیوں کو رفع کرنے کی بجائے اور بھی بڑھا دیں گے۔

کنور۔ میں جائداد کی حفاظت کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میری خواہش صرف اتنی ہے کہ ونے کو کسی قسم کی مالی تکلیف نہ ہونے پاوے۔ بس اپنے لئے میں اور کچھ نہیں چاہتا۔

جان سیوک۔ آپ ظاہرا تو کنور ونے سنگھ کے لئے کوئی انتظام نہیں کر سکتے ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ کہ آپ اپنے وثیقہ میں سے جو مناسب سمجھیں انہیں بھی دے دیا کریں۔

کنور۔ اچھا۔ مان لیجیے کہ ونے اسی راستہ پر بڑھتے ہی گئے تو؟

جان سیوک۔ تو انہیں ریاست پر کوئی اختیار نہ ہو گا۔

کنور۔ لیکن ان کی اولاد کو تو یہ اختیار رہے گا؟

جان سیوک۔ ضرور۔

کنور۔ گورنمنٹ صاف لفظوں میں اس شرط کو منظور کرے گی؟

جان سیوک۔ نہ منظور کرنے کا تو کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا۔

کنور۔ ایسا تو نہ ہو گا کہ ونے کے اعمال کا نتیجہ ان کی اولاد کو بھگتنا پڑے؟

سرکار ریاست کو ہمیشہ کے لئے ضبط کرلے۔ دو ایک مقامات پر ایسا ہُوا بھی ہے۔ مگر ہمی کو لیجئے۔

جان سیوک۔ کوئی خاص بات پیدا ہو جائے تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سرکار کا یہ وطیرہ کبھی نہیں رہا۔ برآر کی بات جانے دیجئے۔ وہ اتنا بڑا صوبہ ہے کہ کسی ریاست میں اُس کا شامل ہو جانا ملکی انتظامات میں مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔

کنور۔ تو میں کل ڈاکٹر گنگولی کو شملہ سے تار بھیج کر بُلائے لیتا ہوں۔

جان سیوک۔ آپ چاہیں تو بُلا لیں۔ میری رائے میں تو بہیں سے مسودہ بنا کر اُن کے پاس بھیج دیا جائے یا کہئے تو میں خود چلا جاؤں اور ساری باتیں آپ کی مرضی کے موافق طے کر آؤں۔

کنور صاحب نے شکریہ ادا کیا اور گھر چلے آئے۔ تمام رات وہ اسی حیص بیص میں پڑے رہے کہ دونے اور جاہنوی سے اس تجویز کا تذکرہ کروں یا نہیں۔ اُن کا جواب اُنہیں معلوم تھا۔ اُن سے ناپسندیدگی اور انکار کے سوا ہمدردی کی ذرا بھی اُمید نہیں۔ کہنے سے فائدہ کیا؟ ابھی تو دونے کو کچھ خوف بھی ہے۔ یہ حال سُنے گا تو اور بھی دلیر ہو جائے گا۔ آخر کار انہوں نے یہی طے کیا کہ ابھی راز فاش کر دینے سے کوئی نفع نہیں بلکہ خلل پڑ جائے گا۔ کام پورا ہو جائے پر کہنے سُننے کے لئے کافی وقت ملے گا۔

مسٹر جان سیوک پیروں تلے گھاس نہ اُگنے دینا چاہتے تھے۔ دوسرے ہی روز اُنہوں نے ایک بیرسٹر سے درخواست کا مسودہ تیار کرایا اور اُسے کنور صاحب کو بھی دکھلایا۔ اُسی روز وہ کاغذ ڈاکٹر گنگولی کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر گنگولی نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور خود شملہ سے آئے۔ یہاں کنور صاحب سے مشورہ کیا۔ اور دونوں اصحاب صوبہ کے گورنر کے پاس جا پہنچے۔ گورنر کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ریاست پر ایک کوڑی کا بھی قرض نہ تھا۔ سرکاری عمّال نے ریاست کے حساب وغیرہ کی جانچ شروع کی اور ایک ماہ کے اندر ریاست پر سرکار کا قبضہ ہو گیا۔ کنور صاحب ندامت و پشیمانی کے سبب ان دنوں ونے سے

بہت کم بولتے۔ گھر میں بہت کم جاتے۔ آنکھیں چرائے رہتے تھے۔ کہ کہیں یہ گفتگو نہ چھڑ جائے۔ جس روز تمام شرائط طے ہو گئیں۔ کنور صاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔ ونے سنگھ سے بولے۔ ریاست پر سرکاری قبضہ ہو گیا۔

ونے نے چونک کر دریافت کیا۔ کیا ضبط ہو گئی؟

کنور۔ نہیں میں نے کورٹ آف وارڈز کے سپرد کر دیا۔

یہ کہہ کر انہوں نے شرائط کا ذکر کیا اور انکسار کے ساتھ کہا۔ معاف کرنا۔ میں نے تم سے اس بارہ میں صلاح نہیں کی۔

ونے۔ مجھے اس کا ذرا بھی غم نہیں ہے۔ لیکن آپ نے فضول ہی اپنے کو گورنمنٹ کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔ اب آپ کی حیثیت محض ایک وثیقہ دار کی ہے جس کا وثیقہ کسی وقت بھی بند کیا جا سکتا ہے۔ کنور۔ اس کا الزام تمہارے سر ہے۔

ونے۔ آپ نے یہ تجویز کرنے کے پیشتر ہی مجھ سے پوچھ لیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آنے پاتی۔ میں تمام عمر ریاست سے دست بردار رہنے کا اقرار نامہ تحریر کر دیتا۔ اور آپ اُسے شائع کر کے حکام کو خوش رکھ سکتے تھے۔

کنور۔ (سوچ کر) اُس حالت میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ میں پوشیدہ طور پر تمہاری مدد کر رہا ہوں۔ اس شبہ کو مٹانے کا میرے پاس اور کون ذریعہ تھا؟

ونے۔ تو میں اس گھر سے نکل جاتا اور آپ سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیتا۔ اب بھی اگر آپ اس انتظام کو منسوخ کرا سکیں تو بہتر۔ ورنہ میں اپنے خیال سے نہیں۔ آپ ہی کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے گذر بسر کی کوئی صورت پیدا کر لوں گا۔

کنور صاحب آبدیدہ ہو کر بولے۔ ونے مجھ سے ایسی سخت باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری ملامت کا نہیں۔ تمہاری ہمدردی اور رحم کا مستحق ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ صرف سوشل خدمات سے ہماری نجات نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم آزادی سے ان خدمات کو بھی انجام نہیں دے سکتے۔ کوئی تحریک

جس سے ملک میں اپنی حالت کے احساس کی قابلیت پیدا ہو تو یت اور اہمیت کہ
جذبات کی بیداری سے اقتباسات سے نہیں ملتی۔ یہ سب ؟ ہوئے تھے۔ ذہنی
دائرہ میں قدر جانتا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ یہ تحریک جلد ہی سرد ہو صورت اختیار کر
لے گی ناکام ہوگا۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ میں ظاہر نہ ہو کر بھی اس کا
انتظام کرتا رہوں گا۔ نہ جانتا تھا کہ اس کے لئے مجھے اپنا سب کچھ اپنا ہی نہیں بلکہ
آنے والی نسلوں کا بھی سب کچھ سُوا کر دینا پڑے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ
میں اس قدر ایثار کی ہمت نہیں ہے۔

نے نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ انہیں اپنی یا صوفیا کی کوئی فکر نہ تھی۔ ہاں
اُسے فکر تھی تحریک کو جاری رکھنے کی۔ اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ انہیں
کبھی دان مانگنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ عوام سے روپے کس
طرح ملتے ہیں۔ کم از کم پانچ ہزار ماہوار کا صرفہ تھا۔ اتنا روپیہ فراہم کرنے کے
لئے ایک علیحدہ جماعت کی ضرورت تھی۔ اب اُنہیں معلوم ہوا کہ دولت اتنی حقیر
شے نہیں ہے۔ پانچ ہزار روپے ماہوار یا ساٹھ ہزار روپے سالانہ کے لئے بارہ لاکھ
کے مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے۔ کچھ عقل کام نہ کر سکتی تھی۔ جا ہو وہ سب پاس
کچھ ان کی بچی کھچی پونجی تھی سے وہ دینا نہ چاہتی تھیں۔ اب تو اُسے محفوظ رکھنے کی
اور بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ وہ ونے کو مفلس نہیں بنانا چاہتی تھیں۔
سہ پہر کا وقت تھا۔ ونے اور اندردت دونوں روپے کے لئے متفکر بیٹھے ہوئے
تھے۔ دفعتاً صوفیا نے آکر کہا۔ میں ایک تدبیر بتلاؤں۔

اندردت۔ چندہ مانگنے چلیں؟

صوفیا۔ کیوں نہ ایک ڈراما کھیلا جائے۔ ایکٹر موجود ہی ہیں۔ کچھ پردے
تیار کرا لئے جائیں۔ ساتھی تیاری میں مدد دیں گے۔

ونے۔ رائے تو صائب ہے۔ مگر ڈراما کی ہیروئن تمہیں کو بننا پڑے گا۔

صوفیا۔ ہیروئن کا پارٹ اندو رانی لیں گی اور میں اُن کی سکھی کا۔

اندر دت۔ اچھا کون سا ناٹک کھیلا جائے؟ بھنڈی ناٹک گاوتی ناٹک؟
ونے۔ مجھے تو پرساد کا "اجات شاستر" بہت پسند ہے۔
صوفیا۔ مجھے کربلا بہت پسند آیا۔ اس میں رزم کا بھی شائبہ ہے اور شوق کا بھی۔ دونوں کی نفیس آمیزش ہے۔
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ کہ ایک چٹھی رساں اندر آیا اور ایک مُہر بند رجسٹرڈ لفافہ ونے کے ہاتھ میں دے کر چلا گیا۔ لفافہ لندن سے آیا تھا۔ اور اُس پر پربھو سیوک کے نام کی مُہر تھی۔
ونے۔ اچھا بتاؤ اس میں کیا ہوگا؟
صوفیا۔ روپے تو ہوں گے نہیں اور چاہے جو ہو۔ وہ غریب روپے کہاں پائے گا۔ وہاں ہوٹل کا خرچ ہی بمشکل ادا کرتا ہوگا۔
ونے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس میں روپیوں کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔
اندر دت۔ کبھی نہیں۔ کوئی نئی تصنیف ہوگی۔
ونے۔ تو رجسٹری کرانے کی کیا ضرورت تھی؟
اندر دت۔ روپے ہوتے تو بیمہ نہ کرایا ہوتا۔
ونے۔ میں کہتا ہوں روپے ہیں۔ چاہے شرط بد لو۔
اندر دت۔ میرے پاس کُل پانچ روپے ہیں۔ پانچ پانچ کی بازی ہے۔
ونے۔ یہ نہیں۔ اگر اس میں روپے ہوں تو میں تمہاری گردن پر سوار ہو کر کمرے کے اُس سرے تک جاؤں گا۔ نہ ہوئے تو تم میری گردن پر سوار ہونا۔ بولو؟
اندر دت۔ اچھا منظور ہے۔ کھولو لفافہ۔
لفافہ کھولا گیا۔ تو ایک چیک نکلا۔ پورے دس ہزار کا۔ لندن بینک کے نام۔
ونے خوشی سے اچھل پڑے۔ بولے ــــ میں کہتا نہ تھا۔ یہاں علم الغیب پڑھے ہوئے ہیں۔ آئیے لائیے گردن۔
اندر دت۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ گردن توڑ دو گے کیا؟ ذرا خط تو پڑھو۔ کیا لکھا

ہے وکہاں ہیں؛ کیا کر رہے ہیں؛ گلے سواری کا منٹھنے۔
دنے۔ جی نہیں۔ یہ نہیں ہونے کا۔ آپ کو سواری کا دنی ہوگی۔ گردن ٹوٹے یا
رہے۔ اس کا میں ذمہ وار نہیں۔ گھوڑ بے چلے تو ہو نہیں۔ خاصے دیو بنے ہوئے ہیں
اندر دت۔ بھئی آج منگل کے دن نظر نہ لگاؤ۔ کل دو من ۳۵ سیر تورہ گیا
ہوں۔ راجپوتانہ جانے کے قبل تین من سے زیادہ تھا۔
دتے۔ خیر دیر نہ کیجئے۔ آپئے گردن جھکا کر کھڑے ہو جائیے۔
اندر دت۔ صوفیا میری حفاظت کرو۔ تمہیں نے پہلے کہا تھا کہ اس میں
روپے نہ ہوں گے۔ وہی سُن کر میں نے بھی کہہ دیا تھا۔
صوفیا۔ میں تمہارے جھگڑوں میں نہیں پڑتی۔ تم جانو وہ جانیں۔ یہ کہہ کر
اُس نے خط پڑھنا شروع کیا۔
پیارے بھائی۔ میں نہیں جانتا کہ یہ خط کس کو لکھ رہا ہوں۔ کچھ خبر
نہیں کہ آج کل مینجر کون ہے۔ مگر سیوا سمتی سے مجھے اب بھی وہی محبت ہے
جو پہلے تھی۔ اُس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ میری خیریت کا حال
جاننے کے لئے مشتاق ہوں گے۔ میں پونا ہی میں تھا کہ وہاں کے گورنر نے مجھے
ملنے کے لئے بلایا۔ اُن سے دیر تک علم ادب کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ وہ ایک ہی
ماہرِ فن ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ کم نکلیں گے۔ ونے (اس کا کچھ حال نہیں
معلوم ہوا) کے سوا میں نے اور کسی کو بھی اتنا سخن فہم نہیں پایا۔ کتنا جاندار اخلاق
تھا۔ گورنر صاحب کے اصرار سے میں یہاں آیا اور جب سے آیا ہوں میری تواضع
تکریم بجا ہو رہی ہے۔ واقعی زندہ اقوام ہی ماہرینِ فن کی قدر کرنا جانتے ہیں۔
بڑے خلیق۔ فراخدل اور ملنسار آدمی ہیں۔ مجھے اس قوم سے اب عقیدت ہو گئی
ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس قوم کے ہاتھوں ہمارا نقصان کبھی نہیں ہو
سکتا۔ کل یونیورسٹی کی جانب سے مجھے ایک سپاس نامہ دیا گیا تھا خادمانِ ادب
کا ایسا ہجوم میں نے کا ہیکو کبھی دیکھا تھا۔ عورتوں کا اخلاق اور احترام آمیز

سلوک دیکھ کر میں دنگ ہو گیا۔ دو دن پہلے انڈیا یونین نے دعوت دی تھی۔ آج ادبی انجمن نے مدعو کیا ہے۔ کل لبرل ایسوسی ایشن دعوت دے گا۔ پرسوں پارسی سماج کا نمبر ہے۔ اس کے بعد یونین کلب کی جانب سے پارٹی دی جائے گی۔ مجھے خواب میں بھی اُمید نہ تھی کہ میں اتنی جلد بڑا آدمی ہو جاؤں گا۔ میں شہرت اور عزت کی بُلندی کے زینوں میں پہنچ گیا ہوں۔ اس کے سوا اہل کمال کو اور کیا صلہ مل سکتا ہے؟ مجھے اب معلوم ہوا کہ میں کیا کرنے کے لئے دُنیا میں آیا ہوں۔ میری زندگی کا کیا مقصد ہے۔ اب تک وہم میں پڑا ہوا تھا۔ اب میری زندگی کا مشن ہوگا مغرب و مشرق میں رشتہ اتحاد قائم کرنا اور اُسے پائدار بنانا۔ باہمی اختلافات کو مٹانا اور دونوں میں یکسانیت کے جذبہ کو پیدا کرنا۔ میں اسی بات کا عہد کروں گا۔ کسی زمانہ میں مشرق نے مغرب کو مذہب و ایمان کا راستہ دکھلایا تھا۔ اب وہ اسے اتحاد کا نغمہ سُنائے گا۔ اتحاد کا راستہ دکھلائے گا۔ میرے کلام کے پہلے حصہ کو میکملن کمپنی جلد ہی شائع کرے گی۔ خود گورنر صاحب اُس کا دیباچہ لکھیں گے۔ اس مجموعۂ کلام کے لئے کمپنی نے مجھے چالیس ہزار روپے دئے ہیں۔ تمنا تو یہی تھی کہ یہ ساری رقم اپنی پیاری سمتی کے نذر کرتا مگر ارادہ ہے کہ امریکہ کی سیر بھی کر لوں۔ اس لئے اس وقت جو کچھ بھیجتا ہوں اُسے قبول کیجئے۔ میں نے محض اپنا فرض ادا کیا ہے اس لئے شکریہ کی اُمید نہیں رکھتا۔ البتہ اتنا عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آپ کو خدمت کے معیارانہ اصولوں پر عمل کرنا چاہئے۔ اور سیاسی معاملات سے الگ ہو کر انسانی اخوت کی اشاعت کو اپنا معیار بنانا چاہئے۔ میری تقریروں کی رپورٹ آپ کو یہاں کے اخبارات میں ملے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ میرے سیاسی خیالات میں کتنا فرق آ گیا ہے۔ میں اب ایک مُلک کا نہیں بلکہ سب ملکوں کا ہوں۔ اب ساری دنیا میرا مُلک ہے۔ کُل انسان میرے بھائی ہیں۔ اور جغرافیائی نیز قومی حدود کو مٹا دینا میری زندگی کا خاص مقصد ہے۔ خدا سے دعا کیجئے کہ امریکہ سے بخیریت واپس آ جاؤں۔

آپ کا سچا بھائی۔ پربھو سیوک۔

صوفیا نے خط میز پر رکھ دیا۔ متانت سے بولی — اس کے دونوں ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ روحانی کمال یا زوال۔ میں تو زوال ہی سمجھتی ہوں۔

ونے۔ کیوں کمال کیوں نہیں؟

صوفیا۔ اس لئے کہ پربھو سیوک آرائش و زیبائش کا دلدادہ ہے۔ وہ ایک بات پر کبھی قائم نہیں رہتا۔ جو شخص اپنی عزت ہونے پر اتنا پُر اُمید ہو سکتا ہے وہ اپنی ذلت سے اتنا ہی نا اُمید بھی ہو جائے گا۔

ونے۔ یہ کوئی بات نہیں۔ شاید اسی طرح میں بھی مسرور ہو جاتا۔ یہ تو بالکل قدرتی بات ہے۔ یہاں ان کی کیا قدر ہوئی؟ مرتے دم تک گمنام بنے رہتے۔

اندرودت۔ جب ہمارے کام کے نہیں رہے تو مشہور ہوا کریں۔ ایسے دنیا سے محبت کرنے والوں کے ہاتھوں نہ کسی کی بھلائی ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ جس میں اپنا پن نہیں اس میں پرایا پن کیا ہوگا؟

صوفیا۔ یہی محبت ہمارے۔ کتنی شعرا کرے دنیا اور وہ انہیں بھی ہے ... کی ان کا عدم وجود ہمارے لئے یکساں ہے بلکہ مجھے تو اب ان سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ میں ابھی جا کر اس خط کا جواب لکھتی ہوں۔

یہ کہتے ہوئے صوفیا اُس خط کو ہاتھ میں لئے اپنے کمرہ میں چلی گئی

ونے نے کہا۔ کیا کروں؟ روپے واپس کر دوں؟

اندرودت۔ روپے کیوں واپس کرو گے۔ اُنہوں نے کوئی شرط تو نہیں لگائی ہے محض دوستانہ صلاح دی ہے اور بہت عمدہ صلاح دی ہے۔ ہمارا بھی تو وہی مقصد ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مساوات کے بغیر ہی اخوت کی اشاعت کرنی چاہتے ہیں۔ اور ہم اخو... کے لئے مساوات کا ہونا لازمی خیال کرتے ہیں۔

ونے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اخوت کا مساوات ہی پر دار و مدار ہے۔

اندرودت۔ شریمتی صوفیا اُن کی خوب خبر لیں گی۔

ونے۔ اچھا میں یہ رکھ لیتا ہوں۔ پھر دیکھا جائے گا۔

اندروت۔ دو چار ایسے ہی دوسرے مل جائیں تو ہمارا کام چل نکلے۔

ونے۔ صوفیا کے ڈرامے کا کچھ معاملہ کیسا ہے؟

اندروت۔ کیا پوچھنا ان کا پارٹ دیکھ کر لوگ دنگ رہ جائیں گے۔

ونے۔ تم میری جگہ ہوتے تو اُسے اسٹیج پر لانا پسند کرتے؟

اندروت۔ ہمیشہ کے لئے تو نہیں لیکن رفاہِ عام کے لئے اسٹیج پر لانے میں شاید مجھے اعتراض نہ ہوتا۔

ونے۔ تو تم مجھ سے کہیں زیادہ فراخ دل ہو۔ میں تو یہ بات کسی حالت میں بھی پسند نہ کروں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہیں صوفیا آج کل کچھ اُداس سی معلوم ہوتی ہے؟ کل اس نے مجھ سے جو باتیں کیں وہ بہت مایوس کن تھیں۔ اُس کو اندیشہ ہے کہ اُسی کے سبب ریاست کا یہ حشر ہوا ہے۔ اماں جی تو اُس پر جان دیتی ہیں مگر وہ اُن سے دور بھاگتی ہے۔ پھر وہی روحانی باتیں کرتی ہے جس کا مطلب آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ "میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بننا چاہتی۔ میرے لئے صرف تمہاری محبت کی نظر کافی ہے۔" اور خدا جانے کیا کیا بکتی ہے۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ گھنٹہ بھر بھی اُسے نہ دیکھوں تو دل بیقرار ہو جاتا ہے۔

اتنے ہی میں موٹر کی آواز سنائی دی اور ایک لمحہ بعد اندو وہاں آ پہنچی۔

اندروت۔ آئیے۔ اندو رانی آئیے۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔

اندو۔ مجھے بناتے ہو۔ میری اس وقت ذرا بھی چاہ نہ تھی۔ روپے کے تردّد میں مبتلا ہوں۔

اندروت۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ لائی ہیں۔ لائیے۔ واقعی ہم لوگ بہت متردّد ہیں۔

اندو۔ مجھ سے مانگتے ہو؟ میرا مال جان کر ہی ایک بار چندہ دے کر ہمیشہ کے لئے سبکدوش ہو گئی۔ ونے بھیا صوفیا کہاں ہے؟ اماں جی تو اب راضی ہیں نا؟

ودّے نے۔ کسی کے دل کی بات کوئی کیا جانے؟

اندو۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ماتا جی بھی راضی ہو جائیں تو بھی تم صوفیا کو نہ پا سکو گے
تمہیں ان باتوں سے رنج تو ضرور ہوگا مگر کسی صدمہ کے لئے پیشتر سے تیار رہنا اس
سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ اُسے ناگہانی طریقہ پر برداشت کرنا پڑے

ودّے نے آنسو پی کر کہا ــــ مجھے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

اندو۔ صوفیا کل مجھ سے ملنے گئی تھی۔ اُس کی باتوں نے اُسے بھی رولایا۔ اور
مجھے بھی۔ وہ بڑی کشمکش میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ تمہیں مایوس کرنا چاہتی ہے اور نہ ماتا
جی کو ناخوش کرنا چاہتی ہے۔ نہ جانے کیوں اُسے اب بھی شک ہے کہ ماتا جی اُسے اپنی بہو
نہیں بنانا چاہتیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ صرف اُس کا خیال ہے۔ وہ خود اپنے دل راز
کو نہیں سمجھتی۔ وہ عورت نہیں ہے ایک خیال محض ہے۔ جذبات اور حسیات سے
معمور۔ تم اُس کے لطف اندوز ہو سکتے ہو مگر اُسے عملاً محسوس نہیں کر سکتے۔ اُسے
مجسّم نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر اپنے عمیق ترین جذبات کو ادا نہیں کر سکتا۔ زبان
میں اتنی سکت ہی نہیں ہے۔ صوفیا بھی وہی عمیق ترین جذبہ ہے۔

ودّے۔ اور آپ کی یہ ساری باتیں بھی شاعرانہ ہیں صوفیا؛ شاعرانہ خیال
ہے نہ کوئی غیبی راز۔ وہ نہ دیوی ہے نہ فرشتہ۔ نہ حور ہے نہ پری۔ جیسی اور عورتیں ہوتی ہیں
ویسی ہی ایک عورت وہ بھی ہے۔ وہی اُس کے جذبات ہیں اور وہی اُس کے خیالات۔
آپ لوگوں نے کبھی شادی کی کوئی تیاری کی۔ کوئی بھی ایسی بات کی جس سے معلوم ہوتا
کہ آپ لوگ یہ شادی کر دینا چاہتے ہیں؟ تو جب آپ لوگ خود ہی بے فکر بیٹھے ہوئے
ہیں تو اُسے کیا غرض ہے کہ خواہ مخواہ شادی کا تذکرہ کرتی پھرے۔ میں تو اکھڑ آدمی
ہوں۔ اُسے ودّے سے لاکھ محبت ہو مگر وہ اپنے منہ سے تو شادی کی بات نہ کہے گی۔
آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں جو کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس نے بھی حیا وانکسار
کی راہ سے یہ تدبیر نکالی ہے۔ آپ لوگ تیاریاں کیجئے۔ پھر اس کی طرف سے انحراف
ہو تو البتہ اُس سے شکایت ہو سکتی ہے۔ جب دیکھتی ہے کہ آپ لوگ خود ہی

پیس و پیش کر رہے ہیں تو وہ بھی اُن والوں سے اپنی عزت قائم رکھنا چاہتی ہے۔

اندو۔ ایسا کبھی قبول کروں نہ کرتا ورنہ وہ اس مکان میں بھی نہ رہے گی۔

اتنے میں صوفیا اس خط کے لئے ہر طرف آئی نظر پڑی جو اس نے پربھو سیوک کو لکھا تھا اندو نے بات پلٹ دی اور کہا تم لوگوں کو ابھی خبر نہ ہوگی۔ اور مسٹر سیوک کو پانڈے پور مل گیا۔

صوفیا نے تعجب سے ملتے ہوئے پوچھا پاپا اس گاؤں کو لے کر کیا کریں گے؟

اندو۔ ابھی تمہیں معلوم ہی نہیں؟ وہ محلہ کھدوا کر پھینک دیا جائے گا۔ اور وہاں مل کے مزدوروں کے لئے مکانات بنائے جائیں گے۔

اندر دت۔ راجہ صاحب نے منظور کر لیا؟ اتنی جلدی بھول گئے۔ اب کے شہر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔

اندو۔ سرکار کا حکم تھا۔ کیسے نہ منظور کرتے؟

اندر دت۔ صاحب نے بڑی دوڑ لگائی۔ سرکار پر بھی منتر چلا دیا۔

اندو۔ کیوں اتنی بڑی ریاست پر سرکار کا قبضہ نہیں کرا دیا؟ ایک باغی راجہ کو مجہول نہیں بنا دیا؟ ایک انقلابی تحریک کی بیخ کنی نہیں کر دی؟ سرکار پر اتنے احسانات کر کے اُسے یونہی جانے دیتے۔ کاروباری شخص نہ ہوتے کوئی راجہ نواب ہوتے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کمپنی نے پچیس فی صدی نفع دے کر کثیر التعداد ممبروں کو اپنی مٹھی میں کر لیا۔

دت۔ تو راجہ صاحب کو استعفےٰ دے دینا چاہئے تھا۔ اتنی بڑی ذمہ داری سر پر لینے سے تو یہی بہتر ہوتا۔

اندو۔ کچھ سوچ سمجھ کر تو منظور کیا ہوگا۔ سُنا کہ پانڈے پور کے لوگ اپنے مکانات چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔

اندر دت۔ نہ ہونا چاہئے۔

صوفیا۔ ذرا چل کر دیکھنا چاہئے۔ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے لیکن کہیں مجھے پاپا نظر آ گئے تو؟ نہیں میں نہ جاؤں گی۔ تمہیں لوگ جاؤ۔

تینوں آدمی پانڈے پور کو روانہ ہوئے۔

(۴۲)

عدالت نے اگر دونوں لڑکوں کو سخت سزا دی تو عوام نے بھی شور داس کو اُس سے کم سخت سزا نہیں دی۔ اُس پر ہر طرف سے تھڑی تھڑی ہونے لگی۔ محلہ والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ آس پاس کے گاؤں والے بھی دو چار کھری کھوٹی سُنا جاتے تھے — مانگتا تو ہے بھیک۔ پر اپنے کو کتنا لگاتا ہے۔ ذرا چار بھلے مانسوں نے منہ لگا لیا تو گھمنڈ کے مارے دھرتی پر پاؤں ہی نہیں دھرتا — شور داس کو شرم کے مارے گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ اُس کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ بجرنگی اور جگدھر کا غصہ فرو ہو گیا۔ بجرنگی نے سوچا کہ اب کیا ماروں پیٹوں۔ اُس کے منہ میں تو یوں ہی کالکھ لگ گئی۔ جگدھر کی تنہا اتنی ہمت کہاں۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ سبھاگی بھیرو کے گھر جانے پر رضامند ہو گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ بلا کسی آڑ کے میں ان جھونکوں سے بچ نہیں سکتی۔ شور داس کی آڑ صرف ٹٹی کی آڑ تھی۔

ایک روز شور داس بیٹھا ہوا دُنیا کی ہٹ دھرمی اور بے انصافی کا دکھڑا رو رہا تھا کہ سبھاگی بولی — بھیا تمہارے اور میرے کارن چاروں طرف سے بوچھاڑ پڑ رہی ہے۔ بجرنگی اور جگدھر دونوں مارنے پر اُتارو ہیں۔ نہ ہو تو مجھے بھی اب میرے گھر پہنچا دو۔ یہی نہ ہوگا۔ مار سے پیٹے گا۔ کیا کروں گی۔ سہہ لوں گی۔ اس بے آبروئی سے تو بچوں گی۔

بھیرو تو پہلے ہی سے منہ پھیلائے ہوئے تھا۔ بہت خوش ہوا۔ آکر سبھاگی کو بڑے آنند سے لے گیا۔ سبھاگی جا کر بڑھیا کے پیروں پر گر پڑی اور خوب روئی۔ بڑھیا نے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بیچاری اب آنکھوں سے بھی معذور ہو گئی تھی۔ بھیرو جب کہیں چلا جاتا تو دوکان پر کوئی بیٹھنے والا نہ رہتا۔ لوگ اندھیرے

لکڑیاں اُٹھا لے جاتے تھے۔ کھانا تو خیر کسی طرح پکا لیتی تھی۔ مگر اس لوٹ کھسوٹ
کا نقصان نہ سہا جاتا تھا۔ سبھاگی گھر کی دیکھ بھال تو کرے گی۔ رہا بھیرو۔ سو
اُس کے دل میں اب دغا و فریب کا نام بھی نہ تھا۔ اُسے سورداس سے اتنی
عقیدت ہو گئی تھی کہ شاید کسی دیوتا سے بھی نہ ہوگی۔ اب وہ اپنی پچھلی باتوں پر
پچھتاتا اور کھلے دل سے سورداس کی سراہنا کرتا تھا۔

اتنے دنوں تک سورداس کو گھر بار کی فکر سے نجات تھی۔ پکی پکائی روٹیاں
مل جاتی تھیں۔ برتن دھل جاتے تھے۔ گھر میں جھاڑو لگ جاتی تھی۔ اب پھر
وہی پہلی مصیبت سر پر سوار ہوئی۔ متھوا اب اسٹیشن پر ہی رہتا تھا۔ گھیسو اور
ودیا دھر کی سزا سے اُس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اُس نے کان پکڑے کہ اب
کبھی جوا اور چرس کے قریب نہ جاؤں گا۔ بازار سے چیز تن لے کر بیچتا اور اسٹیشن
کے احاطے میں پڑا رہتا تھا۔ دو روز تین چار پیسے مل جاتے؟ ذرا بھی فکر نہ تھی۔ کہ
سورداس کی کیسی کٹتی ہے۔ اب میرے ہاتھ پیر ہوئے کچھ میرا فرض بھی اس
کے متعلق ہے یا نہیں۔ آخر کس دن کے لیے اُس نے مجھے اپنے لڑکے کی طرح پالا
پوسا تھا؟ سورداس کئی مرتبہ خود اسٹیشن پر گیا اور اس سے کہا کہ شام کو گھر
چلا آیا کر۔ کیا اب بھی بھیک مانگوں؟ مگر اس کی بلا سنے۔ ایک مرتبہ اُس نے
صاف کہہ دیا کہ یہاں میرا گزر تو ہوتا ہی نہیں۔ تمہارے لیے کہاں سے لاؤں؟
میرے لیے تم نے کون سی بڑی تپسیا کی تھی؟ ایک ٹکڑا روٹی دے دیتے تھے۔
سے تنے کر دیا بھی تو دیا۔ تم سے میں کہنے گیا تھا کہ مجھے کھلاؤ پلاؤ؟ چھوڑ کیوں نہ
دیا؟ کیا جن لڑکوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ سب مر ہی جاتے ہیں؟ جیسے تم
ایک ٹکڑا دے دیتے تھے۔ ویسے بہت ٹکڑے مل جاتے۔ ان باتوں سے
سورداس ایسا دل شکستہ ہو گیا کہ پھر اُس نے گھر آنے کو نہ کہا۔

ادھر سبھاگی بار بار سورداس سے مل چکی تھی۔ وہ اندر کبھی نہ جاتی تھی۔ وقت
نکال کر سورداس سے ملنے ضرور جاتی۔ ایسے موقع سے پہنچتی کہ سیوک صاحب

سے دوچار ہونے کی نوبت نہ آنے پائے۔ وہ جب آتی تو سُوُرداس کے لئے کوئی نہ کوئی سوغات ضرور لاتی۔ اُس نے اندو سے اس کا سارا حال سُنا تھا۔ اس کا عدالت میں عوام سے اپیل کرنا۔ چندہ کے روپے خود نہ لے کر دوسرے کو دے دینا۔ زمین کا معاوضہ جو سرکار سے ملا تھا اُسے خیرات کر دینا۔ اُس وقت سے اُس کو سوُرداس سے اور بھی زیادہ عقیدت ہو گئی تھی۔ جہلا کا مذہبی شوق اینٹ پتھر کی پرستش سے پورا ہو جاتا ہے۔ روشن خیالوں کا اولیائے کرام کی خدمت سے۔ انہیں ہر مجذوب انکے جسم کا کوئی رشی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اُس کی گالیاں سُنتے ہیں۔ اُس کے جھوٹے برتن دھوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے گرد آلود پیروں کو دھو کر پی جاتے ہیں۔ انہیں اُس کے قالب میں کوئی مقدس ترین روح بیٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صوفیا کو سوُرداس سے کچھ ایسی ہی عقیدت ہو گئی تھی۔ ایک بار وہ اس کے لئے سنترے اور سیب لے گئی۔ سُوُرداس گھبرا گیا۔ مگر اِس نے خود نہ کھایا۔ مٹھوا کی یاد آئی۔ وہ اُس کی بدکلامی کو بھول گیا۔ سویرے پھلوں کو لے کر اسٹیشن گیا اور اُسے دے آیا۔ ایک بار صوفیا کے ساتھ اندو بھی آئی تھی۔ سردی کے دن تھے۔ سُوُرداس کھڑا کانپ رہا تھا۔ اندو نے وہ کمبل جسے وہ اپنے پیروں پر ڈالے ہوئے تھی سوُرداس کو دے دیا۔ سُوُرداس کو وہ کمبل ایسا اچھا معلوم ہوا کہ اُسے خود نہ اوڑھ سکا۔ میں بوڑھا بھکاری۔ یہ کمبل اوڑھ کر کہاں جاؤں گا؟ کون بھیک دے گا؟ رات کو زمین پر پڑ رہوں۔ دن بھر سڑک کے کنارے کھڑا رہوں۔ مجھے یہ کمبل لے کر کیا کرنا ہے۔ جا کر مٹھوا کو دے آیا۔ اِدھر تو اب بھی اتنی محبت تھی اُدھر مٹھوا اتنا خود غرض تھا کہ کھانے کو بھی نہ پوچھتا۔ سوُرداس سمجھتا کہ لڑکا ہے۔ یہی اس کے کھانے پہننے کے دن ہیں۔ میری خبر نہیں لیتا نہ سہی۔ خود تو آرام سے کھاتا پہنتا ہے۔ اپنا ہے تو کبھی کام آئے گا۔

پھاگن کا مہینہ تھا اور شام کا وقت۔ ایک عورت گھاس بیچ کر جا رہی تھی۔ مزدوروں نے ابھی ابھی کام سے فراغت پائی تھی۔ دن بھر چھپ چاپ

چڑیوں کے سامنے کھڑے کھڑے اُکتا گئے تھے۔ تفریح کے لئے بیقرار تھے۔ گھسیا کو دیکھتے ہی اس پر گندی گیتوں کی بوچھار شروع کر دی۔ سُورداس کو یہ بات بُری لگی۔ بولا۔ سیارو کیوں اپنی جبان کھراب کرتے ہو۔ یہ وہ بچاری تو اپنی راہ چلی جاتی ہے اور تم لوگ اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ بھی تو کسی کی بہو بیٹی ہو گی۔

ایک مزدور نے کہا۔ بھیک مانگو بھیک۔ جو تمہارے کرم میں بدا ہے۔ ہم گاتے ہیں تو تمہاری نانی کیوں مرتی ہے؟

سُورداس۔ گانے کو تھوڑے ہی کوئی منع کرتا ہے۔

مزدور۔ تو ہم کیا لاٹھی چلاتے ہیں؟

سُورداس۔ اُس عورت کو چھیڑتے کیوں ہو؟

مزدور۔ تو تمہیں کیوں بُرا لگتا ہے؟ تمہاری بہن ہے کہ بیٹی؟

سُورداس۔ بیٹی بھی ہے۔ بہن بھی ہے۔ ہماری ہوئی تو۔ کسی دوسرے بھائی کی ہوئی تو۔

اُس کے مُنہ سے جملہ کا آخری لفظ نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک مزدور نے پیچھے سے جاکر اُس کی ایک ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ بیچارہ بے خبر کھڑا تھا۔ اتنی زور سے مُنہ کے بل گرا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ منہ میں بڑی چوٹ آئی۔ ہونٹ کٹ گئے۔ غشی سی آگئی۔ پندرہ بیس منٹ تک وہیں بیہوش پڑا رہا۔ کوئی مزدور پاس بھی نہ آیا۔ سب اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ اتفاقاً نایک رام اسی وقت شہر سے آرہے تھے۔ سورداس کو سڑک پر پڑا دیکھا تو گھبرائے کہ ماجرا کیا ہے۔ کسی نے مارا پیٹا تو نہیں؟ بجرنگی کے سوا اور کس میں اتنا دم ہے۔ بگڑا کیا۔ کتنا ہی ہو اپنے ایمان کا سچا ہے۔ انہیں رحم آگیا۔ قریب جاکر ہلایا تو سُورداس کو ہوش آیا۔ اُس نے اٹھ کر نایک رام کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا۔

نایک رام نے پوچھا۔ کسی نے مارا ہے کیا۔ سُور۔ منہ سے لہو بہہ رہا ہے۔

سُورداس۔ نہیں بھیّا۔ ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔

نایک رام۔ چھپاؤ مت۔ اگر بجرنگی یا جگدھر نے مارا ہو تو بتا دو۔ دونوں کو سال سال بھر کے لئے بھجوا نہ دوں تو برہمن نہیں۔

سُورداس۔ نہیں بھیّا کسی نے نہیں مارا؟ جھوٹ کیسے لگا دوں؟

نایک رام۔ پل والوں میں سے تو کسی نے نہیں مارا؟ یہ سب بہت راہ چلتے آدمیوں کو چھیڑا کرتے ہیں۔ کہتا ہوں۔ لٹوا دوں گا۔ ان جھونپڑوں میں آگ نہ لگا دوں تو کہنا۔ بتاؤ کس نے یہ کام کیا۔ تم تو آج تک کبھی ٹھوکر کھا کر نہیں گرے ساری دیہہ لہو میں لت پت ہو گئی ہے۔

سُورداس نے کسی کا نام نہ بتلایا۔ جانتا تھا کہ نایک رام غصّہ میں آ جائے گا۔ تو مرنے مارنے کو تیار ہو جائے گا۔ گھر پہنچا تو سارا محلّہ دوڑ پڑا۔ ہائے ہائے کس دشمن نے بیچارے اندھے کو مارا؟ دیکھو تو مُنہ کتنا سُوج گیا ہے۔ لوگوں نے سُورداس کو بستر پر لٹا دیا۔ بھیرو دوڑا۔ بجرنگی نے آگ جلائی۔ افیون اور تیل کی مالش ہونے لگی۔ سبھی کے دل اُس کی طرف سے نرم پڑ گئے۔ تنہا جگدھر خوش تھا۔ جمنی سے بولا۔ بھگوان نے ہمارا بدلا لیا ہے۔ ہم صبر کر گئے۔ پر بھگوان تو نیائے کرنے والے ہیں۔

جمنی چڑھ کر بولی۔ چُپ بھی رہو۔ آئے ہو بڑے نیائی کی پونچھ بن کے۔ سپت میں بیری پر بھی نہ ہنسنا چاہئے۔ وہ ہمارا بیری نہیں ہے۔ سچی بات کے پیچھے جان دے دے گا۔ چاہے کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ آج ہم میں سے کوئی بیمار پڑ جائے تو دیکھو کہ رات کی رات بیٹھا رہتا ہے کہ نہیں۔ ایسے آدمی سے کیا بیر۔

جگدھر شرمندہ ہو گیا۔

پندرہ روز تک سُورداس گھر سے نکلنے کے قابل نہ ہوا۔ کئی دن تک مُنہ سے خون آتا رہا۔ سبھاگی دن بھر اُس کے پاس بیٹھی رہتی اور بھیرو رات کو اُس کے پاس سوتا۔ جمنی بڑے سویرے گرم دودھ لے کر آتی اور اُسے اپنے ہاتھوں سے پلا جاتی۔ بجرنگی بازار سے دوائیں لاتا۔ ہاں اگر کوئی اُسے دیکھنے

نہ آیا تو وہ متھوا تھا۔ اُس کے پاس تین مرتبہ آدمی گیا مگر اُس کی اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ دنیاداری کے لیے نہیں تو کم از کم اُس کی خیر و عافیت کا حال ہی دریافت کرنے کے لیے آ جاتا۔ ڈرتا تھا کہ جاؤں گا تو لڑکوں کے کھٹے بیٹھنے سے کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑے گا۔ اسے اب روپے کا چسکا لگ گیا تھا۔ سورداس کے منہ سے بھی اتنا نکل ہی گیا۔ دنیا اپنے مطلب کی ہے۔ باپ ننھا سا چھوڑ کر مر گیا۔ تو اپنے لڑکے کی طرح پرورش کی۔ آپ لنگوری کی طرح بن گیا۔ اُس کی نیند سوتا تھا۔ اُس کی نیند جاگتا تھا۔ آج چار پیسے کمانے لگا تو بات بھی نہیں پوچھتا۔ کیسے ہمارے بھی بھگوان ہیں۔ جہاں رہے سکھی رہے۔ اُس کی قسمت اس کے ساتھ۔ میری نیت میرے ساتھ۔ اُسے میری کلک نہ ہو۔ مجھے تو اُس کی کلک ہے۔ میں کیسے بھول جاؤں؟ میں نے لڑکے کی طرح اُسے پالا ہے۔

اِدھر تو سورداس بستر علالت پر پڑا ہوا تھا اُدھر پانڈے پور کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ ایک روز علی الصباح راجہ مہیندر کمار۔ مسٹر جان سیوک۔ افسر تخمینہ۔ پولیس کے چند سپاہی اور ایک داروغہ پانڈے پور آ پہنچے۔ راجہ صاحب نے محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے کہا۔ سرکار کو ایک خاص سرکاری کام کے لئے اس محلہ کی ضرورت ہے۔ اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو معقول معاوضہ دے کر یہ زمین حاصل کر لی جائے۔ لاٹ صاحب کا حکم آ گیا ہے۔ افسر تخمینہ صاحب اِسی کام کے لئے تعینات کئے گئے ہیں۔ کل سے اِن کا اجلاس یہیں ہوا کرے گا۔ وہی سب مکانوں کی قیمت کا تخمینہ کریں گے اور اُسی کے مطابق تم لوگوں کو معاوضہ مل جائے گا۔ تمہیں جو کچھ عرض معروض کرنا ہو انہیں سے کرنا۔ آج سے تین ماہ کے اندر تمہیں اپنے مکان خالی کر دینے پڑیں گے۔ معاوضہ بعد کو ملتا رہے گا۔ جو شخص اتنے دنوں کے اندر مکان خالی نہ کرے گا اُس کے معاوضہ کے روپے ضبط کر لئے جاویں گے۔ اور وہ جبراً گھر سے نکال دیا جاوے گا۔ اگر کوئی روک ٹوک کرے گا تو پولیس اُس کا چالان کرے گی۔ اُسے سزا ہو گی۔ سرکار تم لوگوں کو

بلا وجہ تکلیف نہیں دے رہی ہے۔ اُس کو اس زمین کی سخت ضرورت ہے۔ میں
صرف سرکاری حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔

گاؤں والوں کو پہلے ہی سے اُس کی کچھ خبر مل چکی تھی۔ لیکن اس خیال سے دل کو
تسکین دے رہے تھے کہ کون جانے خبر ٹھیک ہے یا نہیں۔ جیوں جیوں دیر ہوتی تھی
ان کی کاہل الوجود طبیعتیں بے فکر ہو جاتی تھیں۔ کسی کو اُمید آتی کہ حکام سے کہہ سُن
کر اپنا گھر بچا لوں گا۔ کوئی کچھ دے دلا کر اپنے بچاؤ کی فکر کر رہا تھا۔ کوئی عذرداری
کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے تھا۔ کوئی یہ سوچ کر خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ نہ جانے کیا ہو گا۔
پہلے سے کیوں اپنی جان ہلکان کریں۔ جب سر پر پڑے گی۔ دیکھی جائے گی۔ اس پر
بھی آج جب لوگوں نے یکایک یہ حکم سُنا تو گویا ان پر بجلی سی گر پڑی۔ سب کے
سب دست بستہ راجہ صاحب کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ــــ سرکار
یہاں بستے ہماری پیڑھیاں بیت گئیں۔ اب سرکار ہم کو نکال دے گی تو کہاں
جائیں گے؟ دو چار آدمی ہوں تو کہیں گھس پڑیں۔ محلّہ کا محلّہ اُجڑ کر کہاں
جائے گا؟ سرکار جیسے ہمیں نکالتی ہے ویسے کہیں کوئی ٹھکانا بھی بتا دے۔

راجہ صاحب بولے۔ مجھے خود اس بات کا سخت افسوس ہے اور میں نے
تمہاری طرف سے سرکار کی خدمت میں عذر بھی کیا تھا۔ مگر سرکار کہتی ہے کہ اس
زمین کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ مجھے تمہارے ساتھ سچی ہمدردی ہے مگر
مجبور ہوں۔ کچھ کر نہیں سکتا۔ سرکار کا حکم ہے۔ ماننا ہی پڑے گا۔

اس کا جواب دینے کی کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو
کہنیوں سے ڈھکے دیتے تھے کہ آگے بڑھ کر پوچھو۔ معاوضہ کس حساب سے
ملے گا مگر کسی کے قدم آگے نہ بڑھتے تھے۔ نایک رام یوں تو بہت ہی چلتے ہوئے
آدمی تھے مگر اس موقع پر وہ بھی خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔ وہ راجہ
صاحب سے کچھ کہنا سُننا فضول سمجھ کر افسر تخمینہ سے تخمینہ کی شرح میں کچھ
بیشی کرا لینے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔ کچھ دے دلا کر اُن سے کام نکالنا زیادہ

آسان معلوم ہوتا تھا۔ اس مصیبت میں سبھوں کو سُورداس کی یاد آتی تھی وہ ہوتا تو ضرور ہی ہماری طرف سے کچھ کہتا سنتا۔ اتنا گردہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ کئی آدمی دوڑے ہوئے سُورداس کے پاس گئے۔ اور اُس سے یہ سارا حال کہا۔

سُورداس نے کہا۔ اور سب لوگ تو موجود ہیں۔ میں چل کر کیا کروں گا۔ ٹھیکہ دار کیوں سامنے نہیں آتے؟ یوں تو بہت گرجتے ہیں۔ اب کیوں منہ نہیں کھلتا؟ محلہ ہی میں رعب دکھانے کو ہیں؟

ٹھاکر دین۔ سب کی دیکھ لی گئی۔ سب کے مُنہ میں دہی جما ہُوا ہے۔ حاکموں سے بولنے کو ہمت چاہئے۔ اُکل چاہئے۔

شیو سیوک بنیا نے کہا ـــ میرے تو اُن کے سامنے کھڑے ہوتے پیر تھر تھر کانپتے ہیں۔ نہ جانے کوئی کیسے حاکموں سے بات کرتا ہے؟ مجھے تو جرا ڈانٹ دیں تو دم ہی نکل جائے۔

جھینگر تیلی بولا۔ حاکموں کا بڑا رُعب ہوتا ہے۔ اُن کے سامنے تو اُکل ہی غفت ہو جاتی ہے۔

سُورداس۔ مجھ سے تو اٹھا ہی نہیں جاتا۔ چلنا بھی چاہوں تو کیسے چلوں؟

سُورداس یوں لاٹھی کے سہارے گھر سے باہر آنے جانے لگا تھا۔ پر اس وقت یکایک اُسے کچھ مان کرنے کی خواہش ہوئی۔ کچھ سے دھوبی گدھے پر نہیں چڑھتا۔

ٹھاکر دین۔ یہ کون کٹھن کام ہے۔ ہم لوگ تمہیں اٹھائے چلیں گے۔

سُورداس۔ بھائی سب لوگ کرو گے اپنے اپنے من ہی کی۔ مجھے کیوں نکو بناتے ہو؟ جو سب کی گت ہوگی وہی میری بھی ہوگی۔ بھگوان کی جو مرضی ہے وہ ہوگی۔

ٹھاکر دین نے بہت منت کی۔ پر سُورداس جانے کو راضی نہ ہُوا۔ ٹھاکر دین کو بھی غصہ آگیا۔ بے لاگ بات کہتے تھے۔ بولے۔ اچھی بات ہے۔ مت جاؤ۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ جہاں مُرگا نہ ہوگا وہاں سویرا ہی نہ ہوگا؟ چار آدمی سراہنے لگے تو تو سب
بجا ج ہی نہیں سلتے۔ سچ کہا ہے۔ کوّا دھونے سے بگلا نہیں ہوتا۔

آٹھ بجتے بجتے حاکم لوگ رخصت ہوگئے۔ اب لوگ نایک رام کے گھر آکر پنچایت کرنے لگے کہ کیا کیا جائے۔

جمنی۔ تم لوگ یونہی بکواس کرتے رہوگے اور کسی کا کیا کچھ نہ ہوگا۔ سُورداس کے پاس جاکر کیوں نہیں صلاح کرتے؟ دیکھو کیا کہتا ہے؟

بجرنگی۔ تو جاتی کیوں نہیں۔ تجھی کو ایسی کیا گرج پڑی ہوئی ہے؟

جمنی۔ تو پھر چل کر اپنے اپنے گھر بیٹھو۔ بکواس سے کیا ہوتا ہے؟

بھیرو۔ بجرنگی یہ سیکڑی دکھانے کا اوسر نہیں ہے۔ سُورداس کے پاس سب مل کر چلو۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ جرُور نکالے گا۔

ٹھاکر دین۔ میں تو اب کبھی اُس کے دوار پہ نہ جاؤں گا۔ اتنا کہہ سُن کر ہار گیا پر نہ اُٹھا نہ اٹھا۔ اپنے کو کچھ للانے لگا ہے

جگدھر۔ سورداس کیا کوئی دیوتا ہے؟ حاکم کا حکم پلٹ دے گا؟

ٹھاکر دین۔ میں تو گود میں اٹھا لانے کو تیار تھا۔

بجرنگی۔ سیکھی ہے سیکھی اور کوئی کیوں نہیں آئے۔ گیا کیوں نہیں حاکموں کے سامنے؟ ایسا مَر تھوڑے ہی رہا ہے۔

جمنی۔ کیسے جاتا؟ وہ تو حاکموں سے بُرا بنے۔ یہاں تم لوگ اپنے اپنے مَن کی کرنے لگو تو اُس کی بھَد ہو۔

بھیرو۔ ٹھیک تو کہتی ہو۔ ہدتمی سُست تو گواہ چُپت ہوگا؟ پہلے چل کر پوچھو۔ اُس کی صلاح کیا ہے؟ اگر ماننے لائک ہو تو مانو۔ نہ ماننے لائک ہو تو نہ مانو۔ ہاں ایک بات جوٹے ہو جائے اس پر ٹکنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ کہا تو کچھ اور۔ اور پیچھے سے نکل بھاگے۔ سردار تو بھرم میں پڑا رہے کہ آدمی پیچھے ہیں اور آدمی اپنے اپنے گھر کی راہ لیں۔

بجرنگی۔ چلو پنڈا جی۔ پُوچھ ہی دیکھیں۔
نایک رام۔ دیکھے جا کر بڑے صاحب کے پاس چلو۔ وہاں سُنائی نہ ہو تو
پراگ راج۔ لاٹ صاحب کے پاس چلو۔ یہ دُنیا ہوتا ہے؟
جگدھر۔ بھیّا کی بات مہاراج۔ یہاں تو کسی کا مُنہ نہیں کُھلا۔ لاٹ صاحب
کے پاس کون جاتا ہے؟
جمنی۔ ایکبار چلے کیوں نہیں جاتے؟ دیکھو تو کیا صلاح دیتا ہے۔
نایک رام۔ میں تیار ہوں چلو۔
ٹھاکر دین۔ میں نہ جاؤں گا اور جسے جانا ہو جائے۔
جگدھر۔ تو کیا ہمیں کو بڑی گرج پڑی ہے؟
بجرنگی۔ جو سب کی گت ہوگی وہی ہماری بھی ہوگی۔
گھنٹہ بھر تک پنچایت ہوئی پر سُورداس کے پاس تک کوئی نہ گیا۔ ساجھے
کی سُوئی ٹھیلے پر لدتی ہے۔ تو چل۔ میں آتا ہوں۔ بس یہی ہوتا رہا۔ لوگ اپنے
اپنے گھر چلے گئے۔ شام کے وقت بھیرو سورداس کے پاس گیا۔ سُورداس نے
پُوچھا۔ آج کیا ہُوا؟
بھیرو۔ ہُوا کیا۔ گھنٹہ بھر تک بکواس ہوئی۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے گھر
چلے گئے۔
سُورداس۔ کچھ طے نہ ہُوا کہ کیا کیا جائے؟
بھیرو۔ نکالے جائیں گے۔ اس کے سوا اور کیا ہوگا۔ کیوں سُورداس کوئی
نہ سُنے گا؟
سُورداس۔ سُننے والا بھی تو وہی ہے جو نکالنے والا ہے۔ تیسرا ہوتا تب نہ سُنتا۔
بھیرو۔ میری مرن ہے۔ ہزاروں من لکڑی ہے۔ کہاں ڈھو کر لے جاؤں گا؟
کہاں اتنی دھرتی ملے گی کہ پھر ٹال لگاؤں؟
سُورداس۔ سبھی کی مرن ہے۔ بجرنگی ہی کو اتنی دھرتی کہاں ملی جاتی ہے

کہ بیندر ملیں جا نہیں اور آپ بھی رہیں۔ ملے گی بھی تو اتنا کرایہ دینا پڑے گا۔ کہ دیوالہ نکل جائے گا۔ دیکھو متھوا آج بھی نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ بیمار ہے تو چھن بھر بھی نہ رکوں۔ کتے کی طرح دوڑوں چاہے وہ میری بات بھی نہ پوچھے۔ جن کے لیے اپنی جند گانی کھراب کی کہ وہ بھی گاڑھے سیکھے پر منہ پھیر لیتے ہیں۔

بھیرو۔ اچھا تم تو بتاؤ کہ تم کیا کرو گے؟ تم نے بھی کچھ سوچا ہے؟

سُور داس۔ میری کیا پوچھتے ہو؟ جمین تھی وہ نکل گئی۔ جھونپڑی کے بہت ملیں گے تو دو چار روپے مل جائیں گے۔ ملے تو کیا اور نہ ملے تو کیا۔ جب تک کوئی نہ بولے گا پڑا رہوں گا۔ کوئی ہاتھ پکڑ کر نکال دے گا تو باہر جا بیٹھوں گا۔ وہاں سے اُٹھا دے گا پھر آ بیٹھوں گا۔ جہاں جنم لیا ہے وہیں مروں گا۔ اپنا جھونپڑا جیتے جی نہ چھوڑا جائے گا۔ مرنے پر جو چاہے لے لے۔ باپ دادوں کی جمین کھو دی۔ اب اتنی نسانی رہ گئی ہے۔ اسے نہ چھوڑوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی مر جاؤں گا۔

بھیرو۔ سُور اتنا دم تو یہاں کسی میں نہیں ہے۔

سُور داس۔ اسی سے تو میں نے کسی سے کچھ کہا ہی نہیں۔ بھلا سوچو کتنا اندھیر ہے کہ ہم جو ستر پشتوں سے یہاں آباد ہیں وہ تو نکال دئے جائیں۔ اور دوسرے یہاں آ کر بس جائیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ کسی کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے۔ جبر جستی سے جو چاہے نکال دے۔ نیائے سے نہیں نکال سکتا۔ تمہارے ہاتھ میں بل ہے۔ تم ہمیں مار سکتے ہو۔ ہمارے ہاتھ میں بل ہوتا تو ہم بھی تمہیں مارتے۔ سرکار کے ہاتھ میں مارنے کا بل ہے۔ ہمارے ہاتھ میں اور کوئی بل نہیں ہے۔ تو مر جانے کا تو بل ہے۔

بھیرو نے جا کر اور لوگوں سے یہ باتیں کہیں۔ جگدھر نے کہا۔ دیکھو یہ صلاح ہے۔ گھر تو جائے ہی گا۔ جان بھی جائے گی۔

ٹھاکر دین بولے۔ یہ سُور ہی کا کیا ہو گا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ مر ہی جائے گا تو کیا۔ یہاں مر جائیں تو بال بچوں کو کس کے سر پہ چھوڑیں؟

بجرنگی۔ مرنے کے لئے کلیجہ چاہئے جب ہم ہی مر گئے تو گھر لے کر کیا ہوگا۔
نایک رام۔ ایسے بہت مرنے والے دیکھے ہیں۔ گھر ہی سے تو نکلا نہیں گیا۔ مرنے چلے ہیں۔

بھیرو۔ اُس کی نہ چلاؤ پنڈا جی۔ من میں آنے کی بات ہے۔

دوسرے دن افسر تخمینہ نے مل کر ایک کمرہ میں اجلاس کرنا شروع کیا۔ ایک منشی محلہ کے لوگوں کے نام۔ مکانات کی حیثیت۔ پختہ ہیں یا خام۔ پُرانے ہیں یا نئے۔ لمبائی چوڑائی وغیرہ کی ایک فہرست تیار کرنے لگا۔ پٹواری اور منشی گھر گھر گھومنے لگے۔ اُن کا ایک ساتھ رہنا ضروری تھا۔ اس وقت سبھی لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ اسی تثلیث کے ہاتھوں میں تھا۔ نایک رام کی بن آئی۔ دلالی کرنے لگے۔ لوگوں سے کہتے کہ نکلنا تو ہے ہی گا۔ اگر کچھ غم کھانے سے معاوضہ بڑھ جائے تو ہرج ہی کیا۔ بیٹھے بٹھائے مٹھی گرم ہوتی تھی۔ تو کیوں چھوڑتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مکانوں کی حیثیت کا انحصار اُس چڑھاوے پر تھا جو اس تثلیث پر چڑھایا جاتا تھا۔ نایک رام تُہی کی آڑ سے شکار کھیلتے تھے۔ نام بھی کماتے تھے اور دولت بھی۔ بھیرو کا بڑا مکان اور سامنے کا بڑا میدان دونوں سمٹ گئے۔ اُن کا رقبہ گھٹ گیا۔ تثلیث کی وہاں کچھ پُوجا نہ ہوئی۔ جگدھر کا چھوٹا سا مکان بڑا ہو گیا۔ تثلیث نے اُس کی پُوجا سے خوش ہو کر طناب ڈھیلی کر دیں۔ رقبہ بڑھ گیا۔ ٹھاکردین نے ان دیوتاؤں کو خوش کرنے کی بہ نسبت شیو جی کو خوش کرنا زیادہ آسان سمجھا۔ وہاں ایک موٹا پانی کے سوا کوئی اور خرچ نہ تھا۔ دونوں وقت پانی دینے لگے۔ مگر اس وقت تثلیث کا دَور دَورہ تھا۔ شیو جی کی ایک نہ چلی۔ تثلیث نے ان کے مختصر مگر پختہ مکان کو خام قرار دے دیا۔ بجرنگی دیوتاؤں کو خوش کرنا کیا جانے۔ اُنہیں ناراض ہی کر چکا تھا۔ مگر جمنی نے اپنی دانشمندی سے بگڑتا ہُوا کام بنا لیا۔ منشی جی اُس کی ایک بچھیا پر ریجھ گئے۔ اس پر دانت لگائے۔ بجرنگی اپنے مویشیوں کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ تنگ گیا۔ نایک رام نے کہا بجرنگی پچھتاؤ گے۔

بجرنگی نے کہا کر چاہے ایک کوڑی بھی معاوضہ نہ ملے پر جھونپڑا نہ دوں گا۔ آخر جمنی نے جو سودا کرنے میں بڑی ہوشیار تھی اُسے تنہائی میں لے جا کر سمجھایا کہ اتنے جانوروں کے رہنے کا کہیں ٹھکانا بھی ہے؟ کہاں لیے لیے پھرو گے؟ ایک جھونپڑے کے دینے سے سو روپے کا کام نکلتا ہے تو کیوں نہیں نکال لیتے؟ ایسی نہ جانے کتنی جھونپڑیاں پیدا ہوں گی۔ دے کر سر سے بلا ٹالو۔ اُس کے سمجھانے سے آخر بجرنگی بھی راضی ہو گیا۔

پندرہ روز تک تثلیث کی حکومت رہی۔ افسر تخمینہ صاحب بارہ بجے گھر سے تشریف لاتے۔ اپنے کمرہ میں دو چار سگار پھونکتے۔ اخبارات ملاحظہ فرماتے اور ایک دو بجے تک مکان واپس آ جاتے۔ جب نقشہ مرتب ہو گیا۔ تو افسر صاحب اُس کی جانچ کرنے لگے۔ باشندگان دیہہ کو پھر طلب کیا گیا۔ افسر نے سب کے تخمینے پڑھ پڑھ کر سنائے۔ ایک سرے سے دھاندلی تھی۔ بھیرو نے کہا۔ حضور چل کر ہمارا گھر دیکھ لیں۔ وہ بڑا ہے کہ جگدھر کا۔ ان کو تو ملیں چار سو اور مجھے ملیں تین سو۔ اس حساب سے مجھے چھ سو ملنا چاہیئے۔

ٹھاکر دین بگڑے۔ دل تھا ہی۔ اُن سے صاف صاف کہہ دیا۔ صاحب تخمینہ کسی حساب سے تھوڑے ہی بنایا گیا ہے۔ جس نے منہ میٹھا کر دیا اُس کی چاندی ہو گئی۔ جو بھگوان کے بھروسے بیٹھا رہا اُس کی بدھیا بیٹھ گئی۔ اب بھی آپ موقع پر چل کر جانچ نہیں کرتے کہ ٹھیک ٹھیک تخمینہ ہو جائے۔ غریبوں کے گلے ریت رہے ہیں۔

افسر نے بگڑ کر کہا۔ تمہارے گاؤں کا مکھیا تو تمہاری طرف سے رکھ لیا گیا تھا۔ اُس کی صلاح سے تخمینہ کیا گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

ٹھاکر دین۔ اپنے کہلانے والے ہی تو اور لوٹتے ہیں۔

افسر۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

سورداس کی جھونپڑی کا معاوضہ ایک روپیہ رکھا گیا تھا اور نایک رام کے گھر کے پورے تین ہزار! لوگوں نے کہا۔ یہ ہے گاؤں گھر والوں کا حال! یہ ہمارے

سگے ہیں۔ بھائی کا گلا کاٹتے ہیں۔ اس پر گھمنڈ یہ کہ ہمیں دھن کا لالچ نہیں۔ آخر ہے تو جات کا پینڈا ہی نا۔ جاتریوں کو ٹھگنے والا جیسی تو یہ حال ہے۔ جرا سا کھتیا دیا کہ آنکھیں پھیر گئیں۔ کہیں تھانہ دار ہوتے تو کسی کے گھر میں ہی نہ رہنے دیتے۔ اسی سے کہا گیا ہے کہ پرمیسر کچھ کو ناکھون نہ دے۔

مسٹر کلارک کے بعد مسٹر سیناپتی حاکم ضلع ہوئے تھے۔ سرکار کا روپیہ خرچ کرتے کانپتے تھے۔ پیسے کی جگہ دھیلے سے کام نکالتے تھے۔ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں بدنام نہ ہو جاؤں۔ ان میں وہ خود اعتباری نہ تھی جو انگریز افسروں میں ہوا کرتی ہے۔ انگریزوں پر جانبداری کا شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بے خوف اور آزاد ہوتے ہیں۔ مسٹر سیناپتی کو شک ہوا کہ معاوضے بڑی نرمی سے لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے اُن کا نصف ہی دینا کافی خیال کیا۔ اب یہ مسل صوبہ کی سرکار کے پاس منظوری کے لئے بھیجی گئی۔ وہاں پھر اس کی جانچ پڑتال ہونے لگی۔ اس طرح تین مہینے کی مدت گزر گئی تو مسٹر جان سیوک۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور داروغہ ماہر علی اور مزدوروں کو ساتھ لے کر محلہ کو خالی کرانے کے لئے آ دھمکے۔ لوگوں نے کہا کہ ابھی تو ہم کو روپیہ ہی نہیں ملے۔ جان سیوک نے جواب دیا۔ ہمیں تمہارے روپوں سے کوئی مطلب نہیں۔ روپے جب سے ملیں اُس سے لو ہمیں تو سرکار نے یکم مئی کو محلہ گرا پانے کی منظوری دے دی ہے اور اگر کوئی کہہ دے۔ کہ آج مئی کی پہلی تاریخ نہیں ہے تو ہم لوٹ جائیں گے۔ اب لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سرکار کی کیا نیت ہے؟ کیا معاوضہ لئے بغیر ہی ہمیں نکال دیا جائے گا۔ گھر کا گھر جائے اور معاوضہ بھی نہ ملے۔ یہ تو بے موت مرے۔ روپے مل جاتے تو کہیں زمین لے کر مکان بنواتے۔ خالی ہاتھ کہاں جائیں؟ کیا گھر میں خزانہ رکھا ہوا ہے؟ ایک تو روپیہ کے چار آنے ملنے کا حکم ہوا۔ اس کا بھی یہ حال۔ نہ جانے سرکار کی نیت بدل گئی کہ درمیانی لوگ ہضم کئے جاتے ہیں۔

ماہر علی نے کہا۔ تم لوگوں کو جو کچھ کہنا سننا ہو وہ حاکم ضلع سے جا کر کہو سنو۔ مکان تو آج خالی کرا لئے جائیں گے۔

بجرنگی۔ مکان کیسے خالی ہوں گے۔ کوئی دھاندلی ہے؟ جس حاکم کا یہ حکم ہوا ہے اُسی حاکم کا تو وہ بھی حکم ہے۔

ماہر علی۔ کہتا ہوں۔ سیدھے سے اپنے بوریئے بقچے لادو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ناحق ہمیں غصّہ کیوں دلاتے ہو؟ کہیں مسٹر ہنر ڈ کو جوش آگیا تو پھر تمہاری خیریت نہیں۔

نایک رام۔ داروغہ جی دو چار دن کی مہلت دے دیجئے۔ روپے تو ملیں گے ہی۔ یہ بیچارے کیا بُرا کہتے ہیں کہ بنا روپے کے کہاں بھٹکتے پھریں۔

مسٹر جان سیوک تو سپرنٹنڈنٹ کو ساتھ لے کر بل کر سیر کرنے چلے گئے تھے۔ وہاں چائے پانی کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں ماہر علی کی حکومت تھی۔ بولے۔ پنڈا جی ایسے چھتے دوسروں کو دینا۔ یہاں تمہیں بہت دنوں سے دیکھ رہے ہیں اور تمہاری رگ رگ پہچانتے ہیں۔ مکان آج اور آج ہی خالی ہوں گے۔

دفعتاً ایک طرف سے دو بچے کھیلتے ہوئے آ گئے۔ دونوں ننگے پاؤں تھے۔ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے مگر بشاش۔ ماہر علی کو دیکھتے ہی چچا چچا کہتے ہوئے اُن کی طرف دوڑے۔ یہ دونوں صابر اور نسیمہ تھے۔ کلثوم نے اسی محلہ میں ایک چھوٹا سا مکان ایک روپیہ ماہوار کرایہ پہ لے لیا تھا۔ گو دام کا مکان جان سیوک نے خالی کرا لیا تھا۔ بیچاری اسی چھوٹے سے گھر میں پڑی ہوئی اپنی مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی۔ ماہر نے دونوں بچوں کو دیکھا تو کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں کیا کرنے آئے؟ دل میں بہت شرمائے کہ اب لوگ کہتے ہوں گے کہ یہ اُن کے بھتیجے ہیں اور اتنے پھٹے حالوں۔ یہ اُن کی خبر بھی نہیں لیتے۔

نایک رام نے دونوں بچوں کو دو دو پیسے دے کر کہا۔ جاؤ مٹھائی کھانا یہ تمہارے چچا نہیں ہیں۔

نسیمہ۔ ہوں، چچا تو ہیں۔ کیا میں پہچانتی نہیں؟

نایک رام۔ چچا ہوتے تو تجھے گود میں نہ اُٹھا لیتے۔ مٹھائیاں نہ منگا دیتے

تو بھول رہی ہے۔
ماہر علی نے بگڑ کر کہا۔ پنڈا جی۔ تمہیں ان فضول باتوں سے کیا مطلب ہے میرے بھتیجے ہوں یا نہ ہوں۔ تم سے واسطہ؟ تم کسی کی خانگی باتوں میں پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟ بھاگو صابر۔ نسیمہ بھاگ جاؤ نہیں تو سپاہی پکڑ لے گا۔
دونوں لڑکوں نے مشکوک نگاہوں سے ماہر علی کو دیکھا اور بھاگ گئے۔ راستہ میں نسیمہ نے کہا —— چچا ہی جیسے تو ہیں۔ کیوں صابر۔ چچا ہی ہیں نہ؟
صابر۔ نہیں تو اور کون ہیں؟
نسیمہ۔ تو پھر ہمیں بھگا کیوں دیا؟
صابر۔ جب ابا تھے۔ تب ہم لوگوں کو پیار کرتے تھے۔ اب تو ابا نہیں ہیں نا۔ تب تو ابا ہی سب کو کھلاتے تھے۔
نسیمہ۔ اماں کو بھی تو اب ابا نہیں کھلاتے۔ وہ تو ہم لوگوں کو اب پہلے سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ پہلے کبھی پیسے نہ دیتی تھیں۔ اب تو پیسے بھی دیتی ہیں۔
صابر۔ وہ تو ہماری اماں ہیں نا۔
لڑکے تو چلے گئے۔ اِدھر داروغہ جی نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ پھینک دو اسباب اور مکان فوراً خالی کرا لو۔ یہ لوگ لات کے آدمی ہیں۔ بات سے نہ مانیں گے۔
دو کانسٹیبل حکم پاتے ہی بجرنگی کے گھر میں گھس گئے۔ اور برتن نکال کر پھینکنے لگے۔ بجرنگی باہر سُرخ آنکھیں لئے کھڑا ہونٹ چبا رہا تھا۔ جمنی گھر میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی ہانڈیاں اٹھا کر باہر لاتی۔ کبھی پھینکے ہوئے برتنوں کو سمیٹتی۔ منہ ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہ ہوتا تھا۔ مونڈی کاٹے کارکھانہ بنانے چلے ہیں۔ دنیا کو اُجاڑ کر اپنا گھر بھریں گے۔ بھگوان بھی ایسے پاپیوں کا ناس نہیں کرتے۔ نہ جانے کہاں جا کر سو گئے ہیں۔ ہائے ہائے گھسوا کی جوڑی پٹک کر توڑ ڈالی۔
بجرنگی نے ٹوٹی ہوئی جوڑی اٹھالی اور ایک سپاہی کے پاس سے جا کر کہا۔ جمعدار۔ یہ جوڑی توڑ ڈالنے سے تمہیں کیا ملا؟ ثابت اٹھائے جاتے تو بھلا کسی کام تو آتی۔

غنیمت ہے کہ لال پگڑیاں باندھے ہوئے ہو نہیں تو آج ۔۔۔۔
اُس کے منھ سے پوری بات بھی نہ نکلی تھی کہ دو سپاہیوں نے اُس پر ڈنڈے چلانے شروع کئے۔ بجرنگی سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ لپک کر ایک سپاہی کی گردن ایک ہاتھ سے اور دوسرے سپاہی کی گردن دوسرے ہاتھ سے پکڑ لی اور اتنے زور سے دبائی کہ دونوں کی آنکھیں نکل آئیں۔ جمنی نے دیکھا کہ اب غضب ہوا چاہتا ہے۔ تو روتی ہوئی بجرنگی کے پاس گئی۔ اور بولی۔ تمہیں بھگوان کی قسم ہے جو کسی سے لڑائی کرو۔ چھوڑو چھوڑو۔ کیوں اپنی جان سے بیَر کر رہے ہو؟

بجرنگی۔ تو جا بیٹھ۔ پھانسی پا جاؤں تو میکے چلی جانا۔ میں تو ان دونوں کی جان ہی لے کر چھوڑوں گا۔

جمنی۔ تمہیں گھیسو کی قسم۔ تم میرا ہی ماس کھاؤ جو ان دونوں کو چھوڑ کر یہاں سے چلے نہ جاؤ۔

بجرنگی نے دونوں سپاہیوں کو چھوڑ دیا مگر اُس کے ہاتھ سے چھوٹنا تھا کہ وہ دوڑے ہوئے ماہر علی کے پاس پہنچے اور کئی اور سپاہیوں کو لئے ہوئے پھر آئے۔ مگر بجرنگی کو جمنی پہلے ہی سے ٹال لے گئی تھی۔ سپاہیوں کو شکار نہ ملا تو شکار کی ماں کو پیٹنے لگے۔ گھر کی ساری چیزیں توڑ پھوڑ ڈالیں۔ جو اپنے کام کی چیز نظر آئی اُس پر ہاتھ بھی صاف کیا۔ یہی حال دوسرے گھروں کا بھی ہو رہا تھا۔ چاروں طرف لوٹ مچی ہوئی تھی۔ کسی نے اندر سے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ کوئی اپنے بال بچوں کو لے کر پچھواڑے سے نکل بھاگا۔ سپاہیوں کو مکان خالی کرانے کا حکم کیا ملا لوٹ مچانے کا حکم مل گیا۔ کسی کو اپنے برتن وغیرہ سمیٹنے کی مہلت بھی نہ دیتے تھے۔ نایک رام کے گھر پر بھی دھاوا ہوا۔ ماہر علی خود پانچ سپاہیوں کو لے کر گھسے۔ دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گھر میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ ایک ٹوٹی ہانڈی بھی نہ ملی۔ سپاہیوں کے حوصلے دل میں رہ گئے۔ سوچے ہوئے تھے کہ اس مکان میں خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ ماریں گے مگر مایوس اور شرمندہ ہو کر نکلنا پڑا۔ بات یہ تھی کہ

نایک رام نے پہلے ہی اپنے گھر کی چیزیں نکال کر باہر کر دی تھیں۔
اُدھر سپاہیوں نے مکانوں کے قفل توڑنے شروع کر دیے۔ کہیں کسی پر مار پڑتی تھی۔ کہیں کوئی اپنی چیزیں لیے بھاگا جاتا تھا۔ کہرام مچا ہوا تھا۔ عجیب منظر تھا۔ گویا دن دہاڑے ڈاکہ پڑ رہا ہو۔ سب لوگ گھروں سے نکل کر یا نکالے جا کر سڑک پر جمع ہوتے جاتے۔ ایسے موقعوں پر عموماً بدمعاشوں کا مجمع ہو ہی جاتا ہے۔ لوٹنے کی ترغیب تھی ہی۔ کسی کو باشندوں سے عداوت تھی۔ اور کسی کو پولیس سے اندیشہ ہو رہا تھا۔ کہ کہیں بدامنی نہ پھیل جائے۔ کہیں کوئی ہنگامہ نہ برپا ہو جائے۔ ماہر علی نے عوام کے تیور دیکھے تو فوراً ایک کانسٹیبل کو پولیس کی چھاؤنی کی طرف دوڑایا اور چار بجتے بجتے مسلح پولیس کی ایک جماعت اور وہاں آ پہنچی۔ کمک کے آتے ہی ماہر علی اور بھی دلیر ہو گئے۔ حکم دیا کہ مار مار کر سبھوں کو بھگا دو۔ لوگ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ بھگا دو۔ جس کسی کو یہاں کھڑے دیکھو۔ مارو۔ اب تک لوگ اپنے مال اسباب سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ مار بھی پڑتی تھی۔ تو چپکے سے سہہ لیتے تھے۔ گھر میں تنہا کئی کئی سپاہیوں سے کیسے بھڑتے؟ اب سب کے سب ایک مقام پر جمع ہو گئے۔ انہیں کچھ تو اپنی مجموعی طاقت کا احساس ہو رہا تھا؛ اس پر نایک رام انہیں اکساتے جاتے تھے۔ یہاں انہیں کو مارے بغیر نہ چھوڑنا۔ جب تک دو چار کے ہاتھ پاؤں نہ ٹوٹیں گے یہ سب نہ مانیں گے۔ بارود بھڑکنے والی ہی تھی کہ اتنے میں وہاں اندو کا موٹر آ پہنچا۔
اور اس میں سے صوفی۔ اندردت اور اندو اُتر پڑے۔ دیکھا تو کئی ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ کچھ محلہ کے باشندے تھے اور کچھ راہ گیر لوگ۔ کچھ قریب گاؤں کے رہنے والے اور کچھ مل کے مزدور۔ کوئی صرف تماشہ دیکھنے آیا تھا۔ کوئی ہمسائوں سے ہمدردی کا اظہار کرنے اور کوئی اس فساد سے حاسدانہ مسرت حاصل کرنے۔
ماہر علی اور اُس کے کانسٹیبل اس جوش کے ساتھ جو کمینہ آدمیوں کے دلوں میں ظلم کرتے وقت پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو سڑک پر سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ہجوم پیچھے ہٹنے کے عوض اور آگے ہی بڑھتا آتا تھا۔

ونے نے ماہر علی کے پاس جا کر کہا۔ داروغہ جی۔ کیا ان آدمیوں کو ایک دن
کی بھی مہلت نہیں مل سکتی؟
ماہر علی۔ مہلت تو تین مہینے کی تھی۔ اگر تین سال کی بھی ہو جائے تو بھی مکان
خالی کرتے وقت یہی حالت ہو گی۔ یہ لوگ سیدھے سے کبھی نہ جائیں گے۔
ونے۔ کیا آپ اتنی عنایت کر سکتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے سپاہیوں کو
روک دیں۔ جب تک کہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہاں کی حالت سے مطلع کر دوں؟
ماہر علی۔ صاحب تو یہیں ہیں۔ مسٹر جان سیوک انہیں مل دکھانے لے گئے
تھے۔ معلوم نہیں کہ وہاں سے کہاں چلے گئے۔ اب تک نہیں لوٹے۔
دراصل صاحب کہیں گئے نہ تھے۔ جان سیوک کے ساتھ دفتر میں بیٹھے ہوئے
مزہ سے شراب نوش کر رہے تھے۔ دونوں ہی آدمیوں نے واقعی حالات کا اندازہ کرنے
غلطی کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم کو دیکھ کر ہی لوگ رعب میں آ گئے ہوں گے۔
خوف کے مارے خود بخود بھاگ جائیں گے۔
صاحب کو خبر دینے کے لئے ونے سنگھ مل کی طرف تیز قدمی سے چلے۔ تو
راجہ صاحب کو موٹر پر آتے ہوئے دیکھا۔ ٹھٹھک گئے۔ سوچا کہ جب یہ آ گئے ہیں تو
صاحب کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ انہیں سے چل کر کہوں۔ لیکن ان کے
سامنے جاتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کہیں عوام نے ان کی تحقیر کی تو میں
کیا کروں گا۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں نے ہی ان لوگوں کو ترغیب دی ہے۔ وہ
اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ راجہ صاحب کی نگاہ اندو کے موٹر پر پڑی۔
جل اٹھے۔ اندر دت اور ونے کو دیکھا۔ بخار سا چڑھ آیا — یہ لوگ یہاں
رونق افروز ہیں۔ پھر کیوں نہ فساد ہو؟ جہاں یہ بھلے مانس ہوں گے۔ وہاں جو
کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ یوں انہیں غصہ بہت کم آتا تھا مگر اس وقت ضبط
نہ ہو سکا۔ ونے سے بولے — یہ سب آپ ہی کی کرامات معلوم ہوتی ہے۔
ونے نے نرم لہجہ میں آ کر کہا — میں تو ابھی آیا ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس

چاہی رہا تھا کہ آپ آتے ہوئے دکھائی دئے۔

راجہ۔ خیر۔ اب تو آپ اُن کے رہنما ہیں۔ اِنہیں اپنے کسی جادو منتر سے ہٹائیے گا ورنہ مجھے کوئی دوسری تدبیر کرنی پڑے گی؟

وسنے۔ ان لوگوں کو صرف اتنی شکایت ہے کہ ابھی ہمیں معاوضہ نہیں ملا۔ ہم کہاں جائیں کیسے نئی زمین خریدیں۔ کیسے نئے مکان کا سامان لیں؟ اگر آپ تکلیف فرما کر ان لوگوں کو تسلی دے دیں۔ تو خود بخود ہٹ جائیں گے۔

راجہ۔ یہ اُن لوگوں کا بہانہ ہے۔ دراصل یہ لوگ فساد کرنا چاہتے ہیں۔

وسنے۔ اگر انہیں معاوضہ دے دیا جائے تو شاید دوسری تدبیر نہ کرنی پڑے۔

راجہ۔ آپ چھ مہینے والا راستہ بتلاتے ہیں اور میں ایک ماہ والا چاہتا ہوں۔

وسنے۔ اس راہ میں کانٹے ہیں۔

راجہ۔ اُس کی کچھ پرواہ نہیں۔ ہمیں کانٹے والی ہی راہ پسند ہے۔

وسنے۔ اس وقت اس مجمع کی حالت خشک پُوال کی سی ہے۔

راجہ۔ اگر پُوال ہمارا راستہ روکتا ہے تو ہم اُسے جلا دیں گے۔

سبھی لوگ خوفزدہ ہو رہے تھے کہ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے۔ پھر بھی انسانوں کا مجمع کسی غائبانہ طاقت سے متاثر ہو کر راجہ صاحب کی طرف بڑھتا ہوا چلا آتا تھا۔ پولیس کے لوگ بھی اِدھر اُدھر سے آ کر موٹر کے پاس کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اُن کے چاروں طرف انسانوں کی ایک بھاری اور اتھاہ ندی لہریں مارنے لگی۔ گویا ایک ہی رو میں اِن گنے گنائے آدمیوں کو نگل جائے گی۔ اِس چھوٹے اور کمزور کنارہ کو بہالے جائے گی۔

راجہ مہیندر کمار یہاں آگ کو مشتعل کرنے نہیں بلکہ فرو کرنے آئے تھے۔ ان کے پاس لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ اپنی ذمہ واریوں کو محسوس کر کے بہت متردد ہو رہے تھے۔ اخلاقی نقطۂ خیال سے تو اُن پر کوئی ذمہ واری نہ تھی۔

جب صوبہ کی سرکار نے دباؤ ڈالا تو وہ کر ہی کیا سکتے تھے؟ اگر مستعفی ہو جاتے تو دوسرا شخص آکر سرکاری حکم کی تعمیل کرتا۔ پانڈے پور والوں کے سر سے کسی حالت میں بھی یہ مصیبت نہ ٹل سکتی تھی۔ لیکن وہ شروع سے آخیر تک اس امر کی کوشش کرتے رہے تھے کہ مکانات کے تخلیہ کے پیشتر لوگوں کو معاوضہ دے دیا جائے۔ بار بار یاد دہانی کرتے تھے۔ جیوں جیوں آخری تاریخ قریب آتی جاتی تھی۔ اُن کے شکوک میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ تو یہاں تک چاہتے تھے کہ باشندوں کو کچھ روپے پیشگی دے دئے جائیں کہ وہ پہلے ہی سے اپنا ٹھکانا کر لیں۔ مگر کسی نامعلوم سبب سے روپیوں کی منظوری میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ مسٹر سینا پتی سے بار بار کہتے کہ آپ کی منظوری کی اُمید پر اپنے حکم سے روپے دلا دیں۔ مگر حاکم ضلع کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ کہ نہ جانے سرکار کا کیا ارادہ ہے۔ میں بلا اُس کے حکم کے کچھ نہیں کر سکتا۔ جب آج بھی منظوری نہ آئی تو راجہ صاحب نے تار دے کر دریافت کیا اور دوپہر تک جواب کا انتظار کرتے رہتے۔ آخر جب اس مجمع کی اطلاع ملی تو گھبرا اُٹھے۔ اُسی وقت دوڑے ہوئے حاکم ضلع کے پاس گئے۔ کہ اُن سے کچھ صلاح کریں۔ اُنہیں اُمید تھی کہ وہ خود ہی موقع واردات پر جانے کو تیار ہوں گے۔ مگر وہاں جاکر دیکھا۔ تو صاحب بہادر بیمار پڑے تھے۔ بیماری کیا تھی۔ بیماری کا بہانہ تھا۔ بدنامی سے بچنے کی یہی تدبیر تھی۔ راجہ صاحب سے بولے — مجھے افسوس ہے کہ میں نہیں جا سکتا۔ آپ جاکر فساد کے دفعیہ کے لئے جو مناسب سمجھیں کریں۔

مہیندر کمار اب بہت پریشان ہوئے۔ اُنہیں اپنی جان کسی طرح بچتی نہ نظر آتی تھی۔ اگر کہیں خونریزی کی نوبت آگئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ ساری مُصیبت میرے ہی سر پر آئے گی۔ پہلے ہی سے لوگ بدنام کر رہے ہیں۔ آج میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہے۔ بے قصور مارا جا رہا ہوں۔ میری تقدیر کی کچھ ایسی گردش ہے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اُس کے برعکس ہی کرتا ہوں گویا میرا اپنے اوپر کچھ قابو ہی نہیں رہا۔ اس زمین کے جھمیلے میں پڑنا ہی میرے لئے زہر ہو گیا۔ جیسی سے

کچھ ایسے اتفاقات پیش آتے جاتے ہیں جو میری تمناؤں کو برباد کئے دیتے ہیں۔ نیکنامی شہرت۔ نام عزت کو کون روئے۔ منہ دکھانے ہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں سے مایوس ہوکر وہ پھر گھر گئے کہ چل کر اندو سے رائے لوں۔ دیکھوں کہ کیا کہتی ہے۔ مگر یہاں اندو نہ تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ کہیں گھومنے گئی ہیں۔

اُس وقت راجہ صاحب کی حالت اُس خسیس آدمی کی سی تھی جو اپنی آنکھوں سے اپنی دولت لُٹتے ہوئے دیکھتا ہو۔ اور اس خوف سے کہ لوگوں پر میرے دولتمند ہونے کا بھید کھل جائے گا۔ کچھ بول نہ سکتا ہو۔ دفعتاً انہیں ایک بات سُوجھی۔ کیوں نہ معاوضہ کے روپے اپنے ہی پاس سے دے دوں؟ روپے کہیں جاتے تو ہیں نہیں۔ جب منظوری آجائے گی واپس لے لوں گا۔ دو چار روز کا معاملہ ہے۔ میری بات رہ جائے گی اور عوام کے دلوں پر اس کا کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ کل ستّر ہزار ہی تو ہیں۔ اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ کل روپے آج ہی دے دئے جائیں؟ کچھ آج دے دوں۔ کچھ کل دے دوں۔ جب تک منظوری آ ہی جائے گی۔ جب لوگوں کو روپے ملنے لگیں گے۔ تو تسکین ہو جائے گی۔ یہ اندیشہ نہ رہے گا کہ کہیں سرکار روپیوں کو ضبط نہ کرلے۔ افسوس کہ مجھے پہلے یہ بات نہ سُوجھی۔ ورنہ معاملہ اتنا طول ہی کیوں کھینچتا۔ انہوں نے اُسی وقت امپیریل بینک کے نام بیس ہزار روپیوں کا چیک لکھا۔ دیر بہت ہوگئی تھی۔ اس لئے بینک کے مینیجر کے نام ایک خط بھی لکھ دیا کہ روپے دینے میں تاخیر نہ کیجئے گا ورنہ بدامنی واقع ہو جانے کا امکان ہے۔ بینک سے آدمی روپے لے کر واپس آیا تو پانچ بج چکے تھے۔ راجہ صاحب فوراً موٹر پر سوار ہوکر پانڈے پور آ پہنچے۔ آئے تو تھے ایسے نیک ارادے سے مگر وہاں دنے اور اندو کو دیکھ کر طیش آگیا۔ جی میں آیا۔ لوگوں سے کہہ دوں کہ جن کے بوتہ پر اُچھل رہے ہو انہیں سے روپے لو۔ اور اِدھر سرکار کو لکھ دوں کہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ پس اُن کے روپے ضبط کرلئے جائیں۔ اُسی غصہ کی حالت

میں انہوں نے دونے سے مذکورہ بالا باتیں کیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ مجمع بڑھتا ہُوا چلا آ رہا ہے۔ لوگوں کے چہرے غصّہ سے بگڑے ہوئے ہیں۔ مسلح پولیس سنگینیں چڑھائے ہوئے ہے اور اِدھر اُدھر سے دو چار پتھر بھی پھینکے جا رہے ہیں تو اُن کی وہی حالت ہوئی جو خوف میں نشہ کی ہوتی ہے۔ وہ فوراً اپنے موٹر پر کھڑے ہو گئے اور مجمع کو مخاطب کرکے بلند لہجہ میں بولے ——— دوستو۔ ذرا صبر کرو۔ یوں فساد کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میں روپے لایا ہوں۔ ابھی تم کو معاوضہ مِل جائے گا۔ سرکار نے ابھی منظوری نہیں بھیجی ہے۔ مگر تمہاری خواہش ہو تو تم مجھ سے اپنے روپے لے سکتے ہو۔ اتنی سی بات کے لئے تمہاری یہ ہٹ بالکل بیجا اور نامناسب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم کسی کے ورغلانے ہی سے شرارت پر کمربستہ ہوئے ہو۔ لیکن میں تمہیں اُس بغاوت کی آگ میں نہ کودنے دوں گا جو تمہارے خیر خواہوں نے جَلا رکھی ہے۔ یہ لو اپنے روپے۔ سب لوگ باری باری سے آ کر اپنے نام لکھاؤ۔ انگوٹھے کا نشان بناؤ۔ روپے لو اور چپکے سے گھر چلے جاؤ۔

ایک آدمی نے کہا۔ گھر تو آپ نے چھین لیا۔

راجہ۔ روپیوں سے گھر ملنے میں دیر نہ لگے گی۔ ہم سے تمہاری جو کچھ مدد ہو سکے گی اُسے اُٹھا نہ رکھیں گے۔ اِس مجمع کو فوراً منتشر ہو جانا چاہئے ورنہ روپے ملنے میں دیر ہوگی۔

جو مجمع اُمڈے ہوئے بادلوں کی طرح گھنا اور خوفناک ہو رہا تھا وہ اس اعلان کو سُنتے ہی روئی کے گالوں کی طرح پھٹ گیا۔ نہ جانے لوگ کہاں سما گئے۔ صرف وہی لوگ رہ گئے جنہیں روپے پانے تھے۔ وقتی دانش مندی سر پر آئی ہوئی مُصیبت کو کتنی آسانی سے رفع کر سکتی ہے۔ اس کا یہ بیّن ثبوت تھا ــ ایک نامناسب لفظ۔ ایک سخت فقرہ۔ حالت کو نازک اور ناقابلِ اصلاح بنا دیتا۔

پٹواری نے ناموں کی فہرست پڑھنی شروع کی۔ راجہ صاحب اپنے ہاتھوں

سے روپے تقسیم کرنے لگے۔ اسامی روپے بیتا تھا۔ انگوٹھے کا نشان بناتا تھا اور
پھر دو سپاہی اس کے ساتھ کر دیے جاتے تھے کہ جا کر مکان خالی کرا لیں۔
روپے پا کر لوٹتے ہوئے لوگ اس طرح باتیں کرتے جاتے تھے :-
ایک مسلمان۔ یہ راجہ بڑا موذی ہے۔ سرکار نے روپے بھیج دئے تھے پر دبائے
بیٹھا ہوا تھا۔ ہم لوگ گرم نہ پڑتے تو صاف ہضم کر جاتا۔
دوسرا۔ سوچا ہوگا کہ مکان خالی کرالوں اور روپے سرکار کو واپس کر کے
سرخرو بن جاؤں۔
ایک برہمن نے اُس کی مخالفت کی۔ کیا بکتے ہو۔ بیچارے نے روپے اپنے پاس
سے دئے ہیں۔
تیسرا۔ تم کو کچھ ہو۔ یہ چالیں کیا جانو۔ جا کر پوتھی پڑھو اور پیسے ٹھگو۔
چوتھا۔ سبھوں نے پہلے ہی صلاح کر لی ہوگی۔ آپس میں روپے بانٹ لیتے۔ اور
ہم لوگ ٹھاٹھ ہی پر رہ جاتے۔
ایک منشی جی بولے۔ اتنا بھی نہ کریں تو سرکار کیسے خوش ہو؟ انہیں چاہئے
تھا کہ رعایا کی طرف سے سرکار سے لڑتے مگر آپ خود ہی خوشامدی ٹٹو بنے ہوئے
ہیں۔ سرکار کا دباؤ تو محض حیلہ ہے۔
پانچواں۔ تو یہ سمجھ لو کہ اگر ہم لوگ نہ آ جاتے تو بیچاروں کو کوڑی بھی نہ ملتی۔
گھر سے نکل جانے پر کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے؟ بیچارے مانگنے جاتے
تو چپڑاسیوں سے مار کر نکلوا دیتے۔
عوام کی نظر میں ایک مرتبہ اعتبار کھو کر پھر اُس کا قائم کرنا مشکل ہے۔ راجہ
صاحب کو عوام کے دربار سے یہ صلہ مل رہا تھا۔
شام ہو گئی تھی۔ چار پانچ ہی اسامیوں کو روپے ملنے پائے تھے کہ اندھیرا ہو
گیا راجہ صاحب نے لیمپ کی روشنی میں نو بجے رات تک روپے تقسیم کئے۔ اُس
وقت نایک رام نے کہا۔ سرکار اب تو بہت دیر ہوئی۔ نہ ہو کل پر اُٹھا رکھئے۔

راجہ صاحب بھی تھک گئے تھے۔ عوام کو بھی اب روپے ملنے میں [illegible] دشواری نہ نظر آتی تھی۔ پھر ہم دوسرے روز پر ملتوی کر دیا گیا۔ مگر مسلح پولیس نے وہیں ڈیرا جما دیا کہ کہیں پھر نہ لوگ جمع ہو جائیں۔

دوسرے روز دس بجے پھر راجہ صاحب تشریف لائے۔ [illegible] بھی کئی والنٹیروں کے ساتھ آ پہنچے۔ فہرست کھولی گئی۔ سب سے پہلے سورداس کی طلبی ہوئی۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا آکر راجہ صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

راجہ صاحب نے اس کو سر سے پیر تک دیکھا اور کہا — تمہارے مکان کا معاوضہ ایک روپیہ ہے۔ یہ لو اور مکان خالی کر دو۔

سورداس۔ کیسا روپیہ؟

راجہ۔ ابھی تمہیں معلوم ہی نہیں؟ تمہارا مکان سرکار نے لے لیا ہے۔ یہ اس کا معاوضہ ہے۔

سورداس۔ میں نے تو اپنا مکان بیچنے کو کسی سے نہیں کہا۔

راجہ۔ اور لوگ بھی تو خالی کر رہے ہیں۔

سورداس۔ جو لوگ چھوڑنے پر راضی ہوں انہیں دیجئے۔ میری جھونپڑی رہنے دیجئے۔ پڑا رہوں گا اور سرکار کا کلیان مناتا رہوں گا۔

راجہ۔ یہ تمہاری خوشی کی بات نہیں ہے۔ سرکاری حکم ہے۔ سرکار کو اس زمین کی ضرورت ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اور مکانات تو گرا دئے جائیں۔ اور تمہارا جھونپڑا بنا رہے؟

سورداس۔ سرکار کے پاس زمین کی کیا کمی ہے۔ سارا ملک پڑا ہوا ہے۔ ایک غریب آدمی کی جھونپڑی چھوڑ دینے سے اس کا کام تھوڑے ہی رک جائے گا۔

راجہ۔ فضول حجت کرتے ہو۔ یہ روپیہ لو۔ انگوٹھے کا نشان بناؤ اور جا کر جھونپڑی سے اپنا سامان نکال لو۔

سورداس۔ سرکار زمین لے کر کیا کرے گی؟ یہاں کوئی مندر بنے گا؟

کوئی تالاب کُھدے گا، کوئی دھرم سالہ بنے گی؟ بتائیے!

راجہ۔ یہ میں کچھ نہیں جانتا۔

سُورداس۔ جانتے کیوں نہیں؟ دُنیا جانتی ہے۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔ تیل گھر بنیں گے۔ مزدوروں کے لئے گھر بنیں گے۔ بنیں گے تو اُس پر میرا کیا فائدہ ہوگا۔ کہ گھر کو چھوڑ کر نکل جاؤں؟ جو کچھ فائدہ ہوگا وہ صاحب کو ہوگا۔ پر جاتی برادری ہی ہے ایسے کام کے لئے میں اپنا جھونپڑا نہ چھوڑوں گا۔ ہاں کوئی دھرم کا کام ہوتا۔ تو سب سے پہلے میں اپنا جھونپڑا دے دیتا۔ اس طرح جیسے بستی کرنے کا آپ کو اختیار ہے۔ سپاہیوں کو حکم دے دیں۔ پھوس میں آگ لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ پر یہ نیائے نہیں ہے۔ پُرانے زمانے میں ایک راجہ اپنا بگیچہ بنوانے لگا تو ایک بڑھیا کی جھونپڑی بیچ میں پڑ گئی۔ راجہ نے اُسے بلا کر کہا کہ تو یہ جھونپڑی مجھے دے دے۔ جتنے روپے کہے تجھے دے دوں۔ جہاں کہے تیرے لئے گھر بنوا دوں۔ بڑھیا نے کہا۔ میرا جھونپڑا رہنے دیجئے۔ جب دنیا دیکھے گی کہ آپ کے بگیچہ کے ایک کونے میں بڑھیا کی جھونپڑی ہے تو آپ کے دھرم اور نیائے کی بڑائی کرے گی۔ بگیچہ کی دیوار دو ... باغ پانچ نیز ...ی ہو جائے گی پر اس سے آپ کا نام سدا کے لئے امر ہو جائے گا۔ راجہ نے بڑھیا کی جھونپڑی چھوڑ دی۔ سرکار کا دھرم پرجا کو پالنا ہے۔ نہ اُس کا گھر اُجاڑنا۔ اُس کو تباہ کرنا؟

راجہ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ میں تم سے دلیل کرنے نہیں آیا ہوں۔ پیشری حکم کی تعمیل کرنے آیا ہوں۔

سُورداس۔ حضور میری مجال ہے کہ آپ سے دلیل کر سکوں۔ مگر مجھے اُجاڑیئے ستت سماپ والوں کی نشانی یہی جھونپڑی رہ گئی ہے۔ اسے بنی رہنے دیجئے۔

راجہ صاحب کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ ایک ایک اسامی سے گھنٹوں بحث مباحثہ کرتے۔ انہوں نے دوسرے آدمی کو بُلانے کا حکم دیا۔

اندردت نے دیکھا کہ سورداس اب بھی وہیں کھڑا ہے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔

تو غنڈے سکے راجہ صاحب کہیں اُسے سپاہیوں سے دھکّے دے کر نکلوا دیں۔ آہستہ سے
اُس کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ لے گئے اور بولے۔ سُورداس یہ تو بے انصافی۔ مگر
کیا کرو گے؟ جھونپڑی تو چھوڑنی ہی پڑے گی۔ جو کچھ ملتا ہے لے لو۔ راجہ صاحب
کی بدنامی کا خوف ہے ورنہ میں تم سے لینے کو نہ کہتا۔

کئی آدمیوں نے ان لوگوں کو گھیر لیا۔ ایسے مواقع پر لوگوں کا شوق بڑھا ہوا
ہوتا ہے۔ کیا ہوا۔ کیا کہا۔ کیا جواب دیا؟ سبھی ان باتوں کے جاننے کی خواہش
رکھتے ہیں۔ سُورداس نے اشک آلود آنکھوں سے دیکھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔
بھیا تم بھی گنتے ہو کر روپیہ لو۔ مجھے تو اس تپلی گھر نے پیس ڈالا۔ باپ دادوں کی
نشانی دس بیگھے زمین تھی وہ پہلے ہی نکل گئی۔ اب یہ جھونپڑی بھی چھینی جا رہی ہے۔
سنسار اسی موہ مایا کا نام ہے۔ جب اِس سے چھوٹ جاؤں گا تو جھونپڑی میں رہنے
نہ آؤں گا لیکن جب تک جیتا ہوں اپنا گھر مجھ سے نہ چھوڑا جائے گا۔ اپنا گھر ہے۔
نہیں دیتے۔ ہاں زبردستی جو چاہے لے لے۔

اندردت۔ زبردستی کوئی نہیں کر رہا ہے۔ قانون کے مطابق ہی یہ مکانات
خالی کرائے جا رہے ہیں۔ سرکار کو اختیار ہے کہ وہ کسی سرکاری کام کے لئے جو مکان
یا زمین چاہے لے لے۔

سُورداس۔ ہوگا قانون۔ میں تو ایک دھرم کا قانون جانتا ہوں۔ اِس طرح
زبردستی کرنے کے لئے جو قانون چاہو بنا لو۔ یہاں کوئی سرکار کا ہاتھ پکڑنے والا تو ہے
نہیں۔ اُس کے صلاح کار بھی تو سیٹھ مہاجن ہی ہیں۔

اندردت نے راجہ صاحب کے پاس جا کر کہا۔ آپ اندھے کا معاملہ آج ملتوی
کر دیں تو اچھا ہو۔ گنوار آدمی بات نہیں سمجھتا۔ بس اپنی ہی گائے جاتا ہے۔
راجہ نے سُورداس کو غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ گنوار نہیں
ہے۔ چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ وہ ہمیں اور تمہیں دونوں کو ہی قانون پڑھا سکتا ہے۔
مکّاری ٹھاٹھ ہے۔ میں اس کا جھونپڑا گروائے دیتا ہوں۔

اِس جملہ کے آخری الفاظ سُورداس کے کانوں میں پہنچ گئے۔ بولا۔ جھونپڑا کیوں گِروائیے گا۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ کسی کو کوئی مروا دیجئے۔

یہ کہہ کر سُورداس لاٹھی ٹیکتا ہُوا وہاں سے چلا گیا۔ راجہ صاحب کو اُس کی گستاخی پر غصّہ آ گیا۔ شرافت خود کو بڑی مشکل سے بچا سکتی ہے خصوصاً جب عوام کے سامنے اُس کی تحقیر کی جائے۔ ماہر علی کو بُلا کر کہا۔ اس کی جھونپڑی ابھی گِرا دو۔

داروغہ ماہر علی چلے۔ مسلح اور غیر مسلح پولیس اور مزدوروں کی ایک جماعت اُن کے ساتھ چلی گویا کسی قلعہ پر دھاوا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے عوام کا ایک مجمع بھی روانہ ہُوا۔ راجہ نے ان آدمیوں کے تیور دیکھے تو ہوش اُڑ گئے۔ فساد کا احتمال تھا۔ جھونپڑے کا مسمار کرنا اتنا آسان نہ معلوم ہُوا جتنا کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا۔ پچھتائے کہ میں نے ناحق ماہر علی کو حکم دیا۔ جب محلہ میدان ہو جاتا تو جھونپڑا خود بخود ڈھ جاتا۔ سُورداس کوئی بھوت تو ہے نہیں کہ تنہا اُس میں پڑا رہتا۔ میں نے چیونٹی کو تلوار سے مارنے کی کوشش کی۔ ماہر علی غصّہ ور آدمی ہے اور ان آدمیوں کے رُخ بھی بدلے ہوئے ہیں۔ عوام غصّہ میں اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ موت پر ہنستے ہیں۔ کہیں ماہر علی جلد بازی کر بیٹھا تو ضرور فساد ہو جائے گا۔ اِس کا سارا الزام میرے سر ہو گا۔ یہ اندھا خود تو ڈوبا ہی ہُوا ہے۔ مجھے بھی ڈبوئے دیتا ہے۔ بُری طرح میرے پیچھے پڑا ہُوا ہے۔ مگر اِس وقت وہ حاکم کی حیثیت میں تھے۔ حکم کو واپس نہ لے سکتے تھے۔ سرکار کی آبرو میں بٹہ لگنے کی بہ نسبت کہیں زیادہ خوف اپنی آبرو میں بٹہ لگنے کا تھا۔ اب یہی تدبیر تھی کہ عوام کو جھونپڑے کی طرف نہ جانے دیا جائے۔ سپرنٹنڈنٹ ابھی ابھی بل سے لوٹا تھا اور گھوڑے پر چڑھا ہُوا سگار پی رہا تھا۔ راجہ صاحب نے جا کر اُس سے کہا۔ ان لوگوں کو روکنا چاہئے۔

اُس نے کہا "جانے دیجئے۔ کوئی حرج نہیں۔ شکار ہو گا۔"

"بڑی خونریزی ہو گی۔"

"ہم اس کے لئے تیار ہیں"
سیٹھ کے چہرہ کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ نہ آگے جاتے بنتا تھا نہ پیچھے۔ نہایت مغموم ہو کر بولے۔ اندو۔ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔
اندر دت نے کہا۔ اس میں کیا شک ہے۔
"عوام کو قابو میں رکھنا مشکل ہے"
"آپ جائیے۔ میں دیکھ لوں گا۔ آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے"
"تم اکیلے ہی رہ جاؤ گے"
"کوئی اندیشہ بھی نہیں"
"تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ اب ہم یہاں رہ کر کیا کر لیں گے؟ ہم اپنا فرض ادا کر چکے"
آپ جائیے [illegible] مجبوری ہے۔ وہ مجھے تمہاری بات نہیں بنے گی عزت بڑی عزت پیاری ہے لالہ جی"
سیٹھ مضطرب ہو کر سالکت کھڑے ہوئے تھے گویا کوئی عورت گھر سے نکال دی گئی ہو۔ اندر دت اپنی [illegible] ہر [illegible] تو مجمع اسی گلی کے موڑ پر رکا ہوا تھا۔ جو سیٹھ صاحب کے جھونپڑے کی طرف جاتی تھی۔ گلی کے دروازہ پر پانچ کانسٹیبل سنگینیں چڑھائے کھڑے تھے۔ [illegible] قدم آگے بڑھتا سنگین کی نوک کو چھاتی پر لیتا تھا سنگینوں کی دیوار سامنے کھڑی تھی۔
اندر دت نے ایک کنوئیں کی جگت پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ بھائیو سوچ لو۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ کیا اس جھونپڑے کے لئے پولیس سے لڑو گے؟ اپنا اور اپنے بھائیوں کا خون بہاؤ گے؟ اس قیمت پر یہ جھونپڑی بہت مہنگی ہے۔ اگر اسے بچانا چاہتے ہو۔ تو ان آدمیوں ہی سے منت کرو۔ جو اس وقت وردیاں پہنے سنگین چڑھائے۔ موت کے فرشتے بنے ہوئے تمہارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور اگرچہ بظاہر وہ تمہارے دشمن ہیں مگر ان میں ایک بھی

ایسا نہ ہوگا جس کا دل تمہارے ساتھ نہ ہو۔ جو ایک بیکس اور کمزور اندھے کی جھونپڑی گرانے میں اپنی دلاوری سمجھتا ہو۔ ان میں سبھی بھلے آدمی ہیں۔ جن کے بال بچے ہیں جو قلیل تنخواہ پر تمہارے جان و مال کی حفاظت کرنے کے لئے گھر سے آئے ہیں۔

ایک آدمی۔ ہمارے جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں یا سرکار کے رعب و داب کی؟

اندر دت۔ ایک ہی بات ہے۔ تمہارے جان و مال کی حفاظت کے لئے سرکار کے رعب و داب کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے۔ انہیں جو تنخواہ ملتی ہے وہ ایک مزدور کی اُجرت سے بھی کم ہے۔ . . . .

ایک سوال۔ یہ گلی والوں سے پیسے نہیں لیتے؟

دوسرا سوال۔ چوریاں نہیں کراتے؟ جوا نہیں کھلاتے؟ گھوس نہیں کھاتے؟

اندر دت۔ یہ سب اسی لئے ہوتا ہے کہ تنخواہ جتنی ملنی چاہئے اتنی نہیں ملتی۔ یہ بھی ہماری اور تمہاری طرح انسان ہیں۔ اُن میں بھی رحم اور عقل ہے۔ یہ بھی کمزوروں پر ہاتھ اُٹھانا کمینہ پن سمجھتے ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں مجبور ہو کر۔ انہیں [illegible] کھائیں اور اس کی جھونپڑی کو بچائیں۔ (کانسٹیبلوں سے) کیوں دوستو ہم سے اس رحم کی امید رکھیں؟ ان آدمیوں پر رحم کرو گے؟

اندر دت نے ایک طرف عوام کے دلوں میں سپاہیوں کے لئے ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف سپاہیوں کے دلی رحم کو متحرک کرنے کی۔ حوالدار کانسٹیبلوں کے تیور سے گھبرا اٹھا۔ بولا۔ ہماری روزی بچا کر اور جو چاہے وہ کیجئے۔ اِدھر سے نہ جائیے۔

اندر دت۔ تو روزی کے لئے اتنے لوگوں کی جانیں لے لوگے؟ یہ بیچارے بھی تو ایک بیکس کی مدد کرنے آئے ہیں۔ جو ایشور تمہیں یہاں رزق دیتا ہے وہ کیا کسی دوسری جگہ تمہیں بھوکوں مارے گا؟ اِدھر سے یہ لوگ پتھر پھینکتے تھے

یاد رکھو کہ تم لوگ انصاف کی حفاظت کرنے آئے ہو۔ بلوہ کرنے نہیں۔ ایسے بزدلانہ حملوں سے اپنے کو قابلِ ملامت نہ بناؤ۔ مت ہاتھ اٹھاؤ۔ اگر تمہارے اوپر گولیوں کی باڑھ بھی چلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

امردت کو زیادہ کہنے کا موقع نہ ملا۔ سپرنٹنڈنٹ نے گلی کے موڑ پر آدمیوں کا ہجوم دیکھا تو گھوڑا دوڑاتا اِدھر چلا۔ امردت کی آواز کانوں میں پڑی تو ڈانٹ کر بولا۔ ہٹا دو اس کو۔ ان سب آدمیوں کو بھی۔ سامنے سے ہٹا دو۔ تم سب آدمی ابھی ہٹ جاؤ۔ ورنہ ہم گولی مار دے گا۔“

مجمع ذرا بھی نہ ہٹا۔

”ابھی ہٹ جاؤ نہیں تو ہم فائر کر دے گا۔“

کوئی آدمی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

سپرنٹنڈنٹ نے تیسری دفعہ آدمیوں کو ہٹ جانے کا حکم دیا۔

مجمع ساکت اور بے حس کھڑا تھا۔

فائر کرنے کا حکم ہوا۔ سپاہیوں نے بندوقیں ہاتھوں میں لیں۔ اتنے میں راجہ صاحب بدحواس ہو کر دوڑتے ہوئے آئے اور بولے ”مسٹر براؤن۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔“ لیکن حکم ہو چکا تھا۔ باڑھ سر کی گئی۔ بندوقوں کی نالوں سے دھواں نکلا۔ دھائیں دھائیں کی دل ہلا دینے والی آوازیں سنائی دیں اور کئی آدمی چکر کھا کر گر پڑے۔ مجمع کی طرف سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ دو چار شاخیں اگر پڑیں مگر درخت ہنوز کھڑا ہوا تھا۔

پھر فائر کا حکم ہوا۔ راجہ صاحب نے اس کے بہت منت کر کے کہا۔ ”مسٹر براؤن۔ یہ گولیاں میرے دل کو چھید ے ڈالتی ہیں۔“ لیکن حکم ہو چکا تھا۔ دوسری باڑھ چلی۔ پھر کئی آدمی گر پڑے۔ شاخیں گریں لیکن درخت بدستور کھڑا تھا۔

تیسری بار فائر کرنے کا حکم ہوا۔ راجہ صاحب نے آبدیدہ ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مسٹر براؤن۔ اب میں بالکل تباہ ہو گیا۔“ بندوقیں سر کی گئیں۔

کتنے آدمی گرے اور ان کے ساتھ اندر دت بھی۔ گولی سینہ کے پار ہو گئی۔ درخت کا تنہ گر گیا۔

مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی۔ لوگ گرتے پڑتے ایک دوسرے کو کچلتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوئی کسی درخت کی آڑ میں چھپا، کوئی کسی گھر میں گھس گیا۔ کوئی سڑک کے کنارے کی کھائیوں میں جا بیٹھا۔ مگر زیادہ تر لوگ وہاں سے ہٹ کر سڑک پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

نایک رام نے ونے سنگھ سے کہا — بھیّا کیا کھڑے ہو؟ اندر دت کو گولی لگ گئی۔

ونے ابھی تک بے پروائی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ خبر پاتے ہی گولی سی لگ گئی۔ بے تحاشا دوڑے اور سنگینوں کے سامنے گلی کے دروازہ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی بھاگنے والے سنبھل گئے۔ جو چھپے بیٹھے تھے نکل پڑے۔ جب ایسے ایسے لوگ مرنے کو تیار ہیں جن کے لئے دنیا میں آرام ہی آرام ہے تو ہم پھر کس گنتی میں ہیں۔ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ گرتی ہوئی دیوار پھر کھڑی ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ نے حالت بے ڈھب دیکھ کر دوسری بار فائر کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ کیا؟ کوئی سپاہی بندوق نہیں چلاتا۔ حوالدار نے بندوق زمین پر پٹک دی۔ سپاہیوں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی اپنی بندوقیں رکھ دیں۔ حوالدار بولا — حضور کو اختیار ہے جو چاہیں کریں مگر اب ہم لوگ گولی نہیں چلا سکتے۔ ہم بھی انسان ہیں۔ قصائی نہیں ہیں۔

براؤن۔ کورٹ مارشل ہوگا۔

حوالدار۔ ہو جائے۔

براؤن۔ نمک حرام لوگ!

حوالدار۔ اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے کے لئے نہیں، ان کی حفاظت کے لئے نوکری کی تھی۔

یہ کہہ کر سب کے سب پیچھے کی طرف پھر گئے اور سورداس کے جھونپڑے

کی طرف چلے۔ اُن کے ساتھ ہی کئی ہزار آدمی جے جے کے نعرے بلند کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ مونے اُن کے آگے آگے تھے۔ راجہ صاحب اور مسٹر پراہوت واس باختہ سے کھڑے تھے۔ اُن کی آنکھوں [illegible] ایک ایسی بات وقوع پذیر ہو رہی تھی جو پولیس کی تاریخ میں ایک نئے زمانہ کی آمد کا پیش خیمہ تھی۔ جو روایات کے خلاف انسانی فطرت کے خلاف اور طرزِ حکومت کے خلاف تھی۔ سرکار کے وہ پرانے خادم جن میں سے کتنوں ہی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ رعایا کو دبانے ہی میں بسر کیا تھا۔ یوں اکڑے ہوئے چلے جائیں۔ اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان دینے کو بھی تیار ہو جائیں! راجہ صاحب اب تک جوابدہی کے بوجھ سے کانپ رہے تھے۔ اب یہ خوف ہوا کہ کہیں یہ لوگ مجھی پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ پر اُن تو گھوڑے پر سوار آدمیوں کو ہنٹر مار مار کر ہٹانے کی کوشش [illegible] رہا تھا اور راجہ صاحب اپنے لئے چھپنے کی کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے۔ لیکن کسی نے اُن کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ سب کے سب فتح کے نعرے بلند کرتے ہوئے سیلابی روش سے شور داس کی جھونپڑی کی طرف [illegible] سے چلے جاتے تھے۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو جھونپڑے کے چاروں طرف سینکڑوں آدمی کھڑے تھے۔ ماہر علی اپنے آدمیوں کے ساتھ نیم کے درخت کے نیچے کھڑے [illegible] پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس بھیڑ کو پار کرکے جھونپڑے کے پاس جائیں۔ سب کے آگے نایک رام کندھے پر لٹھ رکھے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔ اس مجمع کے وسط میں جھونپڑے کے دروازہ پر سور داس سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا گویا صبر۔ روحانی طاقت اور پرسکون جلال کی زندہ تصویر تھی۔

[illegible] کو دیکھتے ہی نایک رام آگے بولا [illegible] تم اب کچھ فکر مت کرو۔ میں یہاں سنبھال لوں گا۔ ادھر مہینوں سے شور داس سے میری اَن بَن تھی۔ بول چال تک بند تھا پر آج اُس کا چھوٹ جگرا دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ ایک اندھے اپاہج میں اتنی ہمت! ہم لوگ دیکھنے ہی کو مٹی کا یہ بوجھ لادے ہوئے ہیں۔

[illegible] نے۔ اندر دت کا مرنا غضب ہو گیا۔

نایک رام - بھیا دل نہ چھوٹا کرو۔ بھگوان کی یہی اچھا تھی۔

ونے۔ کتنی بہادرانہ موت پائی ہے!

نایک رام - میں تو کھڑا دیکھتا ہی تھا۔ ما[illegible]کن تک نہیں آتی۔

ونے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج یہ نوبت آنے کی ورنہ پہلے خود ہی جاتا۔ وہ اکیلے ستی کا کام سنبھال سکتے تھے۔ میں نہیں سنبھال سکتا۔ کتنے ہنس مکھ تھے۔ دقتوں کو تو دھیان ہی میں نہ لاتے تھے۔ آگ میں کودنے کو تیار رہتے تھے۔ خیریت یہی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا۔

نایک رام - گھر والے کتنا زور دیتے رہے پر اُنہوں نے ایک بار نہیں کرکے پھر ہاں نہ کی۔

ونے - ایک نوجوان عورت کی جان بچ گئی۔

نایک رام - کہاں کی بات بھیا۔ بیاہ ہو گیا ہوتا تو وہ اس طرح بیدھڑک ہو کر گولیوں کے سامنے جاتے ہی نا۔ بیچارے ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔

ونے - رو رو کر مر جائیں گے اور کیا۔

نایک رام - اتنا اچھا ہے کہ اور کئی بھائی ہیں اور گھر کے پورے ہیں۔

ونے - دیکھو ان سپاہیوں کی کیا گت ہوتی ہے۔ کل تک فوج آجائے گی۔ ان [illegible]یوں کی بھی کچھ فکر کرنی چاہیئے۔

نایک رام - کیا بچکر کروگے بھیا؟ ان کا کورٹ ماسل ہوگا۔ بھاگ کر کہاں جائیں گے؟

ونے - یہی تو اُن سے کہنا ہے کہ بھاگیں نہیں۔ جو کچھ کیا ہے اس کا پھل بھوگنے سے نہ ڈریں۔ حولدار کو پھانسی ہو جائے گی۔

یہ کہتے ہوئے دونوں آدمی [illegible] نیبرزی کے پاس گئے تو حولدار بولا۔ کنور صاحب میرا تو کورٹ ماسل ہوگا ہی۔ میرے بال بچوں کی کھبر لیجیئے گا۔ یہ کہتے کہتے وہ دھاڑیں مار مار کر رونے [illegible]

باہت لوگ جمع ہو گئے اور کہنے لگے ۔۔۔ کنور صاحب چندہ کھول دیجئے۔ ولدار تم سچے سورما ہو جو کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

ونے ۔ ولدار۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا وہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ آج تم نے ہماری لاج رکھ لی۔

ولدار ۔ کنور صاحب ۔ مرنے جینے کی چنتا نہیں ہے۔ مرنا تو ایک دن ہو گا ہی۔ اپنے بھائیوں کی سیوا کرتے ہوئے مارے جانے سے بڑھ کر اور کون موت ہوگی؟ دھنیہ ہے آپ کو جو اپنا سکھ آنند چھوڑ کر ابھاگوں کی رکھشا کر رہے ہو۔

ونے ۔ تمہارے ساتھ کے جو لوگ نوکری چاہیں انہیں ہمارے یہاں جگہ مل سکتی ہے۔

ولدار ۔ دیکھئے کون کیک ہے اور کون مرتا ہے؟

راجہ صاحب نے موقع پایا تو موٹر پر بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔ مسٹر براؤن فوجی کمک کے بارہ میں حاکم ضلع سے مشورہ کرنے چلے گئے۔ ماہر علی اور اُن کے سپاہی وہیں جمے رہے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ لوگ بھی ایک ایک کر کے جانے لگے۔ دفعتاً سورداس آکر بولا۔ کنور جی کہاں ہیں؟ دھرماوتار ہاتھ بھر دھرتی کے لئے کیوں اتنا جھگڑا کرتے ہو؟ میرے کارن (سبب) آج اتنے آدمیوں کی جان گئی۔ میں نہ جانتا تھا کہ رائی کا پربت ہو جائے گا۔ نہیں تو اپنے ہاتھ سے اس جھونپڑی میں آگ لگا دیتا اور منہ میں کالکھ لگا کہیں نکل جاتا۔ مجھے کیا کرنا تھا۔ یہاں مانگتا وہیں پڑا رہتا۔ بھیا۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ میری جھونپڑی کے پیچھے کتنے ہی گھر اُجڑ جائیں۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کرنا۔

ونے ۔ تمہاری جھونپڑی نہیں۔ ہمارا قومی مندر ہے۔ ہم اس پر پھاوڑے چلتے دیکھ کر خاموش نہیں بیٹھے رہ سکتے۔

سورداس ۔ پہلے میرے دیہہ پر پھاوڑا چل چکے گا تب گھر پر پھاوڑا چلے گا۔

ونے ۔ اور اگر آگ لگا دیں؟

شومداس۔ تب تو میری چتا بنی ہوئی ہے۔ بھیا میں تم سے اور سب بھائیوں سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ اگر میرے کارن کسی ماں کی گود سونی ہوئی یا میری کوئی بہن بدھوا ہوئی تو میں اِس جھونپڑی میں آگ لگا کر جل مروں گا۔

ونے نے نایک رام سے کہا۔ اب؟

نایک رام۔ بات کا تو دھنی ہے۔ جو کہے گا جرور کرے گا۔

ونے۔ تو پھر ابھی اسی طرح چلنے دو۔ دیکھو اُدھر سے کل کیا گل کھلتا ہے۔ ان کا ارادہ دیکھ کر ہم لوگ بھی سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ اب چلو۔ اپنے بہادروں کی مٹی ٹھکانے لگا دیں۔ یہ ہمارے قومی شہید ہیں۔ ان کا جنازہ دھوم سے نکلنا چاہیے۔

نو بجتے بجتے نو ارتھیاں نکلیں اور تین جنازے۔ آگے آگے اندردت کی ارتھی تھی۔ پیچھے پیچھے دوسروں کی۔ جنازے قبرستان کی طرف گئے۔ ارتھیوں کے پیچھے کوئی دس ہزار آدمی ننگے سر ننگے پیر سر جھکائے چلے جاتے تھے۔ ہر قدم پر مجمع بڑھتا چلا جاتا تھا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑے چلے آتے تھے۔ لیکن کسی کے چہرہ پر سوگ یا غم کا نشان نہ تھا۔ نہ کسی کی آنکھ میں آنسو تھے۔ نہ کسی کے مُنہ سے فریاد و فغاں کی آواز نکلتی تھی۔ اس کے خلاف دلوں میں غرور تھا اور آنکھوں میں قومیت کا پرجوش جھلک۔ اگر اس وقت راستہ میں توپیں لگا دی جاتیں تو بھی لوگوں کے قدم پیچھے نہ پڑتے۔ نہ کہیں ماتم کی آواز تھی۔ نہ فتح کا نعرہ۔ گمبھیر خاموشی تھی۔ جذبہ جوش اور سدا انس سے معمور۔

راستہ میں راجہ مہندر کمار کا محل تھا۔ راجہ صاحب چھت پر کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دروازہ پر سپاہیوں کا ایک گروہ سنگینیں چڑھائے کھڑا تھا۔ جیوں ہی ارتھیاں ان کے دروازہ کے سامنے سے نکلیں کہ ایک عورت اندر سے نکل کر ہجوم میں شامل ہو گئی۔ یہ رانی اندو تھی۔ اُس پر کسی کی نگاہ نہ پڑی۔ اس کے ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کی ایک مالا تھی جسے اُس نے خود ہی گوندھا تھا۔ وہ اس ہار کو لئے ہوئے آگے بڑھی اور اندردت کی ارتھی کے پاس جا کر آنسوؤں کے ساتھ اسے ارتھی پر چڑھا دیا۔ ونے نے دیکھ لیا۔ بولے۔ "اندو"۔ اندو نے اُن کی طرف اشک آلود

آنکھوں سے دیکھا اور کچھ نہ بولی۔ کچھ بول نہ سکی۔

اے گنگا! ایسا شاندار منظر شاید ہی تمہاری آنکھوں نے کبھی دیکھا ہوگا۔ تم نے بڑے بڑے سورماؤں کو خاکستر کا ڈھیر ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو شیروں کا منہ پھیر سکتے تھے۔ بڑے بڑے زبردست راجے مہاراجے تمہاری آنکھوں کے سامنے خاک میں مل گئے جن کے نعروں سے دُنیا تھراتی تھی۔ بڑے بڑے جوگی لوگ یہاں چِتا کی آگ میں جل گئے۔ کوئی نام ونمود کا بھوکا تھا کوئی راج پاٹ کا اور کوئی بھیم وزر کا۔ کتنے گیانی۔ دھیانی۔ جوگی۔ پنڈت تمہارے دیکھتے دیکھتے آگ کے شعلوں میں سما گئے۔ سچ کہنا کبھی تمہارا دل اتنا مسرور ہوا تھا؟ کبھی تمہاری موجوں نے اس طرح سر اُٹھایا تھا؟ اپنے لئے سبھی مرتے ہیں۔ کوئی اِس لوک کے لئے اور کوئی پرلوک کے لئے۔ آج تمہاری گود میں وہ لوگ آرہے ہیں جو بےغرض تھے جنہوں نے پاک اور خالص عدل کی حفاظت کے لئے اپنے کو قربان کر دیا ہے!

اور ایسا مسرت خیز ماتمی مجمع بھی کبھی تم نے دیکھا جس کا ایک ایک جُزو اخوت۔ قومی محبّت اور بہادرانہ عقیدت سے مملو ہو؟

تمام رات شعلے بلند ہوتے رہے گویا شہیدوں کی روحیں آتشیں تخت پر بیٹھی ہوئیں بہشت کو جارہی تھیں!

نکلتے ہوئے سُورج کی سُرخ کرنیں چِتاؤں سے گلے لپٹ لپٹ کر ملنے لگیں۔ یہ سُورج دیوتا کا آشرواد (دُعا) تھا۔

لَوٹتے وقت صرف گنتی کے لوگ رہ گئے تھے۔ عورتیں پرجوش گانے گاتی ہوئیں چلی آتی تھیں۔ رانی جانھوی آگے آگے تھیں۔ اندرا اور کئی دیگر عورات پیچھے پیچھے۔ اُن کی بہادرانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی میٹھی تان صبح کی روشن شعاعوں پر ناچ رہی تھی جس طرح دل کے تاروں پر محبت رقص کرتی ہے۔

(۴۳)

صوفیا کے مذہبی خیالات اُس کی معاشرت اُس کی پرورش اُس کی مذہبی تعلیم۔

یہ سبھی باتیں ایسی تھیں جن سے ایک ہندو عورت کو نفرت ہو سکتی تھی۔ مگر تینوں دنوں
کے تجربہ نے رانی صاحبہ کے سارے شکوک دور کر دیئے تھے۔ صوفیا ابھی تک ہندو
مذہب کے دائرہ میں باقاعدہ طریقہ پر داخل نہ ہوئی تھی۔ مگر اُس کا اخلاق ہندو مذہب
اور ہندو سوسائٹی کے موافق تھا۔ اس بارہ میں اب رانی جاہنوی کو ذرا بھی شک۔
نہ تھا۔ انہیں اب اگر شک تھا تو صرف یہ کہ ازدواجی رشتہ کے قائم ہو جانے پر
ونے کہیں اپنے مقصد کو بھول نہ جائے۔ اس تحریک میں رہنمائی کا بار اپنے اوپر
لے کر ونے نے اس شک کو بھی بے بنیاد ثابت کر دیا۔ رانی صاحبہ اب شادی کی تیاریوں
میں مشغول ہوئیں۔ کنور صاحب تو پہلے ہی راضی تھے۔ البتہ صوفیا کے والدین کی
رضامندی ضروری تھی۔ اندو کو کوئی اعتراض ہو ہی نہ سکتا تھا۔ باقی اور رشتہ داروں
کی رضامندی یا نا رضامندی کی اُنہیں کوئی فکر ہی نہ تھی۔ پس رانی صاحبہ ایک روز
مسٹر سیوک کے مکان پر گئیں کہ اس عقد کی بابت طے کر لیں۔ مسٹر سیوک تو خوش
ہوئے مگر مسز سیوک کا منہ نہ سیدھا ہوا۔ اُن کی نگاہوں میں ایک یوروپین کی
جتنی عزت تھی اتنی کسی ہندوستانی کی نہ ہو سکتی تھی۔ خواہ وہ کتنا ہی صاحبِ ثروت
کیوں نہ ہو۔ وہ جانتی تھیں کہ یہاں معمولی سے معمولی یوروپین کی عزت یہاں کے بڑے
سے بڑے راجہ سے زیادہ ہے۔ پربھو سیوک نے یوروپ کی راہ لی۔ اب گھر کو خط تک
نہ لکھتے تھے۔ صوفیا نے ادھر یہ راستہ اختیار کیا۔ زندگی کی ساری آرزوئیں خاک
میں مل گئیں۔ جاہنوی کے اصرار پر ناخوش ہو کر بولیں۔ خوشی صوفیا کی چاہئے جب
وہ خوش ہے تو میری رائے ہو یا نہ ہو۔ ایک ہی بات ہے۔ ماں ہوں۔ اولاد کے لئے
جب منہ سے نکلے گی تو دُعا ہی نکلے گی۔ اُس کی بدخواہی نہیں کر سکتی۔ لیکن معاف
کیجئے گا۔ میں شادی کی رسوم میں شامل نہ ہو سکوں گی۔ میں اپنے اوپر بڑا جبر کر
رہی ہوں کہ صوفیا کو بددعا نہیں دیتی ورنہ ایسی ننگِ خاندان لڑکی کا تو مر جانا
ہی اچھا ہے جو اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہو جائے۔
رانی صاحبہ کو اور کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ گھر آ کر اُنہوں نے عالمِ ندامت

کو بلا کر صوفیا کی تبدیلی مذہب اور شادی کی ساعت مقرر کر لی۔ رانی جانہوی توان رسوم کو دھوم دھام سے ادا کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اُدھر پانڈے پور والی تحریک روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ معاوضہ کے روپے تو اب کسی کے باقی نہ تھے۔ اگرچہ ابھی تک منظوری نہ آئی تھی اور راجہ مہیندر کمار کو سبھی اسامیوں کو اپنے پاس سے روپے دینے پڑے تھے مگر ان خالی مکانات کو گرانے کے لئے مزدور نہ ملتے تھے۔ دوگنی سہ گنی اُجرت دینے پر بھی کوئی مزدور کام کرنے نہ آتا تھا۔ حکام نے ضلع کے دیگر مقامات سے مزدور بلوائے مگر جب انہوں نے آکر یہاں کی حالت دیکھی تو راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعدہ حکام نے سرکاری برقندازوں کو تحصیل کے چپراسیوں کو بڑا لالچ دے کر کام کرنے کے لئے تیار کیا مگر جب اُن کے سامنے سینکڑوں نوجوان جن میں کتنے ہی اونچے گھرانوں کے تھے۔ آکر دست بستہ کھڑے ہو گئے اور ملتجی ہوئے کہ بھائیو ان کے لئے پھاوڑے نہ چلاؤ اور اگر چلانا ہی چاہتے ہو تو پہلے ہماری گردنوں پر چلاؤ۔ تو اُن سب کی کایا پلٹ ہو گئی۔ دوسرے روز سے وہ لوگ پھر کام پر نہ آئے۔ ونے اور اُن کے رفیق والنٹیر لوگ آج کل اس سنتیاگرہ کو بڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔

سورداس صبح سے شام تک جھونپڑے کے دروازہ پر بُت بنا بیٹھا رہتا۔ جولدار اور اُس کے سپاہیوں پر عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ موقع واردات کی حفاظت کے لئے دوسرے ضلع سے مسلح پولیس بلائی گئی تھی۔ وہ سپاہی سنگینیں چڑھائے چوبیسوں گھنٹے جھونپڑی کے سامنے والے میدان میں ٹہلتے رہتے۔ شہر کے ہزار دو ہزار آدمی آٹھوں پہر موجود رہتے۔ ایک جاتا تو دوسرا آتا۔ آنے جانے والوں کا سلسلہ دن بھر جاری رہتا تھا۔ والنٹیروں کی جماعت بھی نابکار رام کے خالی برآمدے میں موجود رہتی تھی کہ نہ جانے کب کیا فساد ہو جائے۔ راجہ صاحب اور سپرنٹنڈنٹ پولیس دن میں دو مرتبہ ضرور آتے تھے مگر کسی سبب

سے جھونپڑے کو منہدم کرنے کا حکم دیتے تھے۔ عوام کی طرف سے فساد کا اتنا اندیشہ
نہ تھا جتنا کہ پولیس کی جانب سے عدول حکمی کا۔ حولدار کے رویہ سے جملہ حکام
کے دلوں میں خوف سما گیا تھا۔ صوبائی گورنمنٹ کو مقامی حالات کی رپورٹ
ہر روز بھیجی جاتی تھی۔ گورنمنٹ نے بھی ڈھارس دی تھی کہ جلد ہی گورکھوں کی ایک
رجمنٹ بھیجنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اب حکام کی امیدوں کا گورکھوں ہی پر انحصار
تھا جن کی وفاداری کا انہیں پورا یقین تھا۔ ونے عموماً تمام دن یہیں رہا کرتے
تھے ان کے اور راجہ صاحب کے درمیان میں اب شمشیر برہنہ کا وقفہ تھا۔ وہ ونے کو
دیکھتے تو نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ ان کی نگاہ میں ونے باغی تھا اور سورداس اس
کے ہاتھوں کا کھلونا۔

رانی جانہوی جیوں جیوں شادی کی تیاریاں کرتی تھیں اور تاریخ قریب آتی
جاتی تھی صوفیہ کا دل ایک نامعلوم خوف ایک موہوم اندیشہ ایک نحوست آمیز فکر
سے ہراساں ہو رہا تھا۔ خوف یہ تھا کہ شاید شادی کے بعد ازدواجی زندگی راحت
خیز نہ ہو۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی خامیاں معلوم ہو جائیں اور پھر ہماری زندگی
تلخ ہو جائے۔ ونے کی نگاہ میں صوفیہ بے عیب۔ بے خطا پاک صاف۔ ہمہ صفت
موصوف دیوی تھی۔ صوفیہ کو ونے پر اعتماد نہ تھا۔ اس کے وسیع مذہبی مطالعہ نے
اُسے انسانوں کی جبلی خامیوں سے واقف کر دیا تھا۔ اس نے بڑے بڑے مہاتماؤں
رشیوں منیوں۔ پنڈتوں اور جوگیوں کو جو اپنی سخت ریاضت سے اپنی نفسانی
خواہشات کو مغلوب کر چکے تھے۔ دنیا کے چکنے مگر کائی سے ڈھکے ہوئے رستے پر
پھسلتے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگرچہ نفس پر قابو رکھنے والے لوگ بڑی مشکل سے
پھسلتے ہیں مگر جب ایک بار پھسل گئے تو پھر کسی طرح نہیں سنبھل سکتے۔ اس کی
دبی ہوئی خواہشات اس کی مقید آرزوئیں وحشی کی مغلوب تمنائیں بڑی تیزی سے
مخالف سمت کو چلتی ہیں۔ زمین پر چلنے والا انسان گر کر پھر اٹھ سکتا ہے۔ مگر
آسمان پر گھومنے والا آدمی گرے تو اُسے کون روکے گا۔ اس کے لئے کوئی امید نہیں

اُس کے سوا اُس کی کوئی صورت نہیں۔ صوفیا کو خوف تھا کہ کہیں مجھے بھی یہی تلخ تجربہ نہ ہو۔ کہیں میری بھی یہی حالت نہ ہو۔ ممکن ہے مجھ میں کوئی ایسا عیب نکل آئے جو مجھے ونے کی نگاہوں میں گرا دے۔ وہ میری بے قدری کرنے لگیں۔ یہ اندیشہ سب سے زبردست سب سے زیادہ مایوس کن تھا۔ آہ اُس وقت میری کیا حالت ہوگی۔ دنیا میں ایسے کتنے مرد عورت کے جوڑے ہیں کہ اگر انہیں دوبارہ انتخاب کی آزادی دے دی جائے تو وہ اپنے پہلے انتخاب پر قانع رہیں؟

صوفیا برابر اسی قسم کے خیالات میں محو رہتی تھی۔ ونے بار بار اُس کے پاس آتے۔ اُس سے باتیں کرنا چاہتے۔ پانڈے پور والے معاملے کے متعلق اُس سے رائے لینا چاہتے مگر اُس کی بیرخی دیکھ کر انہیں کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔ فکر مرض کی جڑ ہے۔ صوفیا اس قدر متفکر رہتی کہ دن کا دن گھر سے باہر نہ نکلتی۔ کھانا بھی بہت کم کھاتی اور کبھی کبھی کچھ نہ کھاتی۔ دل میں ایک آگ سی جل رہی تھی۔ مگر اپنے دل کی بات کس سے کہے؟ ونے سے اس بارہ میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کا انجام بُرا ہوگا۔ مایوسی کی حالت میں ونے نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ آخر اُس کا نازک جسم اس دل کی جلن کو برداشت نہ کر سکا۔ پہلے سر میں درد رہنے لگا اور پھر رفتہ رفتہ بخار کی نوبت آگئی۔

لیکن بستر علالت پر پڑتے ہی صوفیا کو ونے سے ایک لمحہ بھی جدا ہونا ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ کمزور آدمی کو اپنی لاٹھی سے بھی بے انتہا محبت ہو جاتی ہے۔ بیماری کی حالت میں ہمارا دل محبت کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ صوفیا جو کئی روز پہلے کمرہ میں ونے کے آتے گوشۂ تنہائی کی تلاش کرتی تھی کہ کہیں یہ عشقیہ گفتگو نہ کرنے لگیں۔ اُن کی مشتاق نگاہوں سے اُن کے شیریں تبسم سے اُن کی دل لبھانے والی ہنسی سے تھر تھر کانپتی رہتی تھی۔ جس طرح کوئی بیمار لذیذ کھانوں کو سامنے دیکھ کر ڈرتا ہے کہ میں بد پرہیزی نہ کر بیٹھوں۔ اب منتظر نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھتی ہوئی ونے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ونے اب کہیں نہ جائیں

میرے ہی پاس بیٹھے رہیں۔ ونے بھی زیادہ تر اُس کے پاس ہی رہتے۔ پانڈے پور کا کام اپنے رفیقوں پر چھوڑ کر صوفیا کی تیمارداری میں مشغول ہو گئے۔ اُن کے بیٹھے رہنے سے صوفیا کے دل کو گونہ اطمینان رہتا۔ وہ اپنی کمزور بانہوں کو ونے کے گلے میں ڈال دیتی اور معصوم تمنا کے ساتھ اُن کے چہرے کی طرف دیکھتی۔ ونے کو کہیں جاتے دیکھتی تو پریشان ہو جاتی اور ملتجا آمیز نگاہوں سے بیٹھنے کی استدعا کرتی۔

رانی جاہنوی کے برتاؤ میں بھی اب ایک خاص فرق دکھائی دیتا تھا۔ صاف تو نہ کہہ سکتی تھیں۔ مگر اشاروں سے ونے کو پانڈے پور کے ستیہ گرہ میں شامل ہونے سے روکتی تھیں۔ اندر دت کی موت نے اُنہیں بہت خائف کر دیا تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اس خودرعیتی کا آخری نظارہ اُس سے بھی زیادہ خوفناک ہوگا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ شادی کے طے ہوتے ہی ونے سنگھ کا جوش بھی کم ہو چلا تھا۔ صوفیا کے پاس بیٹھ کر اُس سے تشفی آمیز گفتگو کرنا اور اس کی محبت بھری باتیں سُننا انہیں اب بہت مرغوب تھا۔ صوفیا کی التجاؤں نے اُن کی محبت میں مادریت کا اضافہ کر دیا تھا۔ ہم پہلے انسان ہیں اور پیچھے قومی خادم۔ حب الوطنی کے لئے ہم اپنے انسانی جذبات کو پامال نہیں کر سکتے۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اپنے بیٹے کی موت کا غم قومی مصیبت کے غم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اپنا غم جاں گسل ہوتا ہے اور قومی غم یاس انگیز۔ اپنے غم پر ہم روتے ہیں۔ قومی غم پر متردد ہو جاتے ہیں۔

ایک روز صبح ونے ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لے کر لوٹے تھے۔ (اچھے ویدوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کا اعتقاد مغربی دواؤں پر زیادہ تھا) کہ کنور صاحب نے انہیں بلا بھیجا۔ ونے ادھر ہفتوں سے اُن سے ملنے نہ گئے تھے۔ باہمی ناچاقی سی ہو گئی تھی۔ ونے نے صوفیا کو دوا پلائی اور پھر کنور صاحب سے ملنے گئے۔ وہ اپنے کمرے میں اداس بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر بولے۔ تم تو اب کبھی آتے ہی نہیں۔

ونے نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ فرصت نہیں ملتی۔ آپ نے کبھی یاد بھی تو نہیں کیا۔ میرے آنے سے شاید آپ کا وقت خراب ہوتا ہے۔

کنور صاحب نے اس طنز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ آج مجھے تم سے ایک تشویش انگیز امر میں مشورہ لینا ہے۔ اچھی طرح بیٹھ جاؤ۔ اتنی جلد فراغت نہ ہوگی۔

ونے۔ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔

کنور صاحب نے بہت پس و پیش کے لہجہ میں کہا۔ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ تمہارا نام ریاست سے ـــــ

یہ کہتے کہتے کنور صاحب رو پڑے۔ ذرا دیر میں طبیعت سنبھلی تو بولے۔ میری تم سے عاجزانہ التجا ہے کہ تم بالاعلان اس تحریک سے اپنا قطع تعلق کر لو اور اخباروں میں اس اعلان کو شائع کرا دو۔ تم سے ایسی التجا کرتے ہوئے مجھے کتنی ندامت اور پریشانی ہو رہی ہے اس کا اندازہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر حالاتِ وقت نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں تم سے یہ ہرگز نہیں کہتا کہ کسی کی خوشامد کرو۔ کسی کے سامنے سر جھکاؤ۔ نہیں مجھے تو اس سے نفرت تھی اور ہے۔ مگر اپنی جائداد بچانے کی غرض سے میری اس التجا کو منظور کرو۔ میں نے سمجھا تھا کہ ریاست کو سرکار کے ہاتھ میں دے دینا کافی ہوگا مگر حکام اسے کافی نہیں سمجھتے۔ ایسی حالت میں میرے لئے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو تم خود اس تحریک سے علیحدہ ہو جاؤ۔ کم از کم اس میں نمایاں حصہ نہ لو یا میں ایک معاہدہ تحریر کر کے تمہیں ریاست سے محروم کر دوں۔ آگے آنے والی اولاد کے لئے اس جائداد کا محفوظ رہنا نہایت ضروری ہے۔ تمہارے لئے پہلی صورت جتنی مشکل ہے اتنی ہی مشکل میرے لئے دوسری صورت ہے۔ تم اس بارہ میں کیا فیصلہ کرتے ہو؟

ونے نے تمکنت سے جواب دیا۔ میں جائداد کو اپنے پیروں کی زنجیر نہیں بنانا چاہتا۔ اگر جائداد ہماری ہے تو اُس کے لئے کسی شرط کی ضرورت نہیں۔ اگر غیر کی ہے اور آپ کا قبضہ محض مشروط ہے تو اُسے میں اپنی جائداد نہیں سمجھتا۔ حقیقی عزت و وقار کے لئے جائداد کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے ایثارِ نفسی اور خدمت کافی ہیں۔

بھرت سنگھ۔ بیٹا۔ میں اس وقت تمہارے سامنے جائداد پر اصولی بحث نہیں کر رہا ہوں۔ اسے صرف عملی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کسی حد تک جائداد ہماری حقیقی آزادی میں رکاوٹ ڈالتی ہے مگر اس کا روشن پہلو بھی تو ہے۔ فکر معاش سے نجات ملتی ہے اور وہ عزت و وقار جس کے حصول کے لئے غیر معمولی ایثار و خدمت کی ضرورت ہے۔ یہاں بلا کسی مشقت کے خود بخود ہاتھ آجاتا ہے۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اس تحریک سے کوئی ظاہرا تعلق نہ رکھو۔ ہاں پوشیدہ طور سے اس کی جتنی مدد کرنی چاہو کر سکتے ہو۔ بس اپنے کو قانونی گرفت سے بچائے رہو۔

ونے۔ یعنی کوئی اخبار بھی پڑھوں تو چھپ کر۔ کواڑ بند کر کے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ جس کام کے لئے پردہ کی ضرورت ہے خواہ اُس کا مقصد کتنا ہی پاک کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ واقعی اہانت آمیز ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں میں اُسے چوری کہنے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ یہ شبہ اور خوف کی زندگی انسان کے بہترین صفات کو زائل کر دیتی ہے۔ میں قول و فعل کی اتنی آزادی ضروری سمجھتا ہوں۔ جس سے ہماری خودداری قائم رہے۔ اس بارہ میں میں اپنے خیالات کو اس سے زیادہ واضح الفاظ ظاہر نہیں کر سکتا۔

کنور صاحب نے ونے کو اشک آلود نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کتنی التجا کتنی عاجزی کتنا انتشار تھا۔ پھر بولے۔ میری خاطر سے اتنا مان جاؤ۔

ونے۔ آپ کے قدموں پر اپنے کو نثار کر سکتا ہوں مگر اپنے ضمیر کی آزادی کا خون نہیں کر سکتا۔

ونے یہ کہہ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ کنور صاحب نے پوچھا۔ تمہارے پاس روپے تو بالکل نہ ہوں گے؟

ونے۔ مجھے روپوں کی فکر نہیں۔

کنور۔ میری خاطر سے یہ لیتے جاؤ۔

انہوں نے نوٹوں کا ایک پلندہ ونسی کی طرف بڑھا دیا۔ ونے انکار نہ کر سکے کیونکہ صاحب پر انہیں ترس آرہا تھا۔ جب وہ نوٹ لے کر کمرہ سے چلے گئے۔ تو کور صاحب رنج و مایوسی سے مضطرب ہو کر کرسی پر گر پڑے۔ دنیا ان کی نگاہوں میں تاریک تھی۔
ونے کی حمیت نے انہیں ریاست چھوڑنے پر آمادہ تو کر دیا۔ مگر ان کے سامنے اب ایک نیا سوال پیدا ہو گیا۔ وہ کسبِ معاش کا سوال تھا۔ سمتی کے بارہ میں تو کوئی خاص فکر نہ تھی۔ اس کا بار ملک پر تھا۔ اس کے علاوہ کسی قومی کام کے لئے بھیک مانگنے میں بھی کوئی شرم کی بات نہیں۔ انہیں اس کا یقین ہو گیا تھا کہ کوشش کی جائے تو اس کام کے لئے مستقل سرمایہ جمع ہو سکتا ہے۔ مگر معاش کے لئے کیا ہو؟ مشکل یہ تھی کہ کسبِ معاش سے مراد صرف ان کی روزمرہ کی ضروریات کا پورا ہونا نہ تھا بلکہ خاندانی روایات کا قائم رکھنا بھی۔ اب تک اس مسئلہ کی اہمیت کا انہیں احساس نہ ہوا تھا۔ دل میں کسی بھی خواہش کے صرف پیدا ہونے کی دیر تھی کہ وہ پوری ہو جاتی تھی۔ اب نگاہوں کے سامنے یہ زبردست مسئلہ یک دم کھڑا ہو گیا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ ممکن تھا کہ اب بھی کچھ دنوں تک والدین کی شفقت انہیں اس فکر سے آزاد رکھتی۔ مگر اس کمزور بنیاد پر زندگی کا محل نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ پھر ان کی حمیت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ اپنی اصول پروری اور معیار پسندی کا کفارہ اپنے والدین سے کرائیں۔ کچھ نہیں۔ یہ بےحیائی ہے اور بزدلی۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ اپنی زندگی کا بار والدین پر ڈالوں۔ انہوں نے اس ملاقات کا تذکرہ اپنی ماں سے بھی نہ کیا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے۔ علاوہ بریں ان کو اب اپنی ہی فکر نہ تھی۔ صوفیا بھی ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ پس اس کی فکر اور بھی زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ مانا کہ صوفیا میرے ساتھ زندگی کی بڑی سے بڑی مصیبت کو برداشت کرے گی۔ مگر کیا یہ مناسب ہے کہ اسے محبت کے لئے یہ سخت سزا دی جائے؟ اس کی محبت کو اس سخت آزمائش میں ڈالا جائے۔ وہ تمام دن انہیں تفکرات میں مبتلا رہے۔ یہ عقدہ انہیں ناقابلِ حل معلوم ہوتا تھا۔ ان کی تعلیم میں کسبِ معاش کے مسئلہ پر ذرا بھی

دھیان نہ دیا گیا تھا۔ ابھی چند روز پیشتر اُن کے لئے اس مسئلہ کا وجود ہی نہ تھا۔ وہ تو سختیاں اُٹھانے کے عادی تھے۔ ارادہ تھا کہ تمام عمر قومی خدمت کا کام انجام دوں گا مگر صوفیا کے سبب اُن کے اس ارادہ میں فرق آ گیا تھا۔ جن چیزوں کی پہلے اُن کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ اب نہایت ضروری معلوم ہوتی تھیں۔ محبت کو خصوصاً عیش و عشرت کا خیال پسند ہے۔ وہ تکلیف اور مفلسی کا جواب نہیں دیکھتی۔ ونے صوفیا کو ایک رانی کی طرح رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے زندگی کی اُن تمام نعمتوں سے معمور کر دینا چاہتا تھا جو شوق و تکلف نے ایجاد کی ہیں۔ مگر حالات ایسی صورت اختیار کرتے جاتے تھے جس سے وہ ساری تمنائیں برباد ہوئی جاتی تھیں۔ چاروں طرف سے مفلسی اور مصیبت ہی کا دور دورہ نظر آتا تھا۔ اس پریشانی کی حالت میں ونے کبھی صوفیا کے پاس جاتے اور کبھی اپنے کمرہ میں جاتے۔ کچھ گم صم۔ اُداس۔ پست ہمت۔ اُترا ہوا اور بے رونق چہرہ۔ گویا کوئی بڑی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ پانڈے پور سے بڑی خوفناک اطلاعیں موصول ہو رہی تھیں۔ آج کمشنر آیا۔ آج گورکھوں کی رجمنٹ آ پہنچی۔ آج گورکھوں نے مکانوں کو مسمار کرنا شروع کیا اور لوگوں کے روکنے پر اُنہیں ملا پیٹا۔ آج پولیس نے رضا کاروں کو گرفتار کرنا شروع کیا۔ دس رضا کار پکڑے گئے۔ آج بیس پکڑے گئے۔ آج حکم دیا گیا ہے۔ کہ سڑک سے سورداس کی جھونپڑی تک کانٹے دار تار لگا دیا جائے۔ کوئی وہاں جا ہی نہیں سکتا۔ ونے یہ خبریں سنتے تھے اور کسی پر شکستہ پرند کی طرح ایک بار تڑپ کر رہ جاتے۔

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا اور صوفیا کی صحت ٹھیک ہونے لگی۔ اس کے پیروں میں اتنی طاقت آ گئی کہ پیدل باغیچہ میں ٹہلنے چلی جاتی۔ کھانا اچھا معلوم ہونے لگا۔ چہرہ پر صحت کی سُرخی نمودار ہو گئی۔ ونے کی عقیدتمندانہ تیمارداریوں نے اس پر پوری فتح حاصل کر لی تھی۔ وہ اندیشے جو اُس کے دل میں پہلے پیدا ہوتے تھے۔ دور ہو گئے تھے۔ محبت کے رشتہ کو خدمت نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ وہ اپنے شکریہ کا اظہار لفظوں میں نہیں بلکہ اپنے آپ کو وقف کر کے کرنا چاہتی تھی۔ ونے کو مغموم دیکھ کر کہتی تم میرے

بلا سے شکر کیوں ہوتے پھرو میں تمہارے ساتھ سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ میں تمہاری دولت و ثروت کی بھوکی نہیں ہوں جو مجھے تمہاری خدمت کرنے کا موقع نہ دے گی۔ جو تمہیں حجابات سے محروم بنا دے گی۔ اس سے مجھے تمہارا افلاس ہوتا کہیں زیادہ پسند ہے۔ البتہ جیوں جیوں اُس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اسے خیال ہونے لگا کہ کہیں لوگ مجھے بدنام نہ کرتے ہوں کہ اسی کی وجہ سے ونے بابو نے پرانہیں جانے۔ اس سنیگرہ کی لڑائی میں وہ حصہ نہیں لیتے جو اُن کا فرض ہے۔ خود آگ لگا کر دور سے کھڑے ہوئے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس خیال کے پیدا ہونے پر بھی اُس کی خواہش نہ ہوتی تھی کہ وہ فوراً چلے جائیں۔

ایک روز اندو اُسے دیکھنے آئی۔ بہت مغموم اور پریشان تھی۔ اب اپنے شوہر سے اس قدر بداعتقاد ہو گئی تھی کہ دو چار ہفتوں سے اُس نے ان سے بات تک نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ اب وہ کھلے الفاظ میں اُن کی ہجو کرنے سے بھی نہ جھجکتی تھی۔ راجہ صاحب بھی اس سے نہ بولتے تھے۔ باتوں باتوں میں ونے سے بولی ——— اُنہیں تو حاکموں کی خوشامد نے چوپٹ کیا۔ پتا جی کو جائداد کی محبت نے چوپٹ کیا۔ کیا محبت تمہیں بھی چوپٹ کردے گی؟ کیوں صوفیا تم انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی قید سے نہیں آزاد کرتیں؟ اگر ابھی سے ان کا یہ حال ہے تو شادی ہو جانے پر کیا ہوگا؟ جب تو یہ شاید دین و دنیا کہیں کے بھی نہ رہ جائیں گے۔ بھونرے کی طرح محبت کا رس پی کر بدمست رہیں گے۔

صوفیا بہت خجل ہوئی۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔ اُس کا یہ گمان درست نکلا کہ ونے کی بے پروائی کا سبب میں ہی سمجھی جا رہی ہوں۔ لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ونے اپنی جائداد بچانے کے خیال سے میری بیماری کا حیلہ کر کے اس لڑائی سے الگ رہنا چاہتے ہوں؟ یہ بدگمانیاں خواہ مخواہ اُس کے دل میں پیدا ہوئیں۔ وہ انہیں دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ جیسے ہم کسی قابل نفرت شے سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ مگر اس الزام کو اپنے سر سے دور کرنا ضروری تھا۔ لجاتی ہوئی بولی ——— میں نے تو کبھی منع نہیں کیا۔ اندو۔ منع کرنے کے بھی کئی ڈھنگ ہیں۔

صوفیا۔ اچھا تو میں آپ کے سامنے کہہ رہی ہوں کہ مجھے اُن کے وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں اسے اپنے اور اُن کے دونوں ہی کے لئے فخر کی بات سمجھتی ہوں۔ اب میں ایشور کے رحم اور اُن کی مہربانی سے اچھی ہو گئی ہوں۔ اور انہیں یقین دلاتی ہوں کہ ان کے وہاں جانے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی میں خود بھی دو چار روز میں جاؤں گی۔

اندو نے ونے کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو اب تو تمہارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ تمہارے وہاں رہنے سے سب کام عمدہ طریقہ پر ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ حاکموں کو جلد ہی سمجھوتہ کر لینا پڑے۔ میں نہیں چاہتی کہ اُس کی عزت کسی دوسرے آدمی کو ملے۔

جب اس تاکید کا بھی ونے پر کوئی اثر نہ ہوا تو صوفیا کو یقین ہو گیا کہ اس علیحدگی کا سبب چاہے جائداد کا لالچ نہ ہو مگر محبت بھی نہیں ہے۔ جب انہیں معلوم ہے کہ ان کی علیحدگی سے میری بدنامی ہو رہی ہے تو یہ دیدہ و دانستہ کیوں مجھے نشانۂ ملامت بنا رہے ہیں؟ یہ تو اُلٹے کو ٹھوکر کا بہانہ ہو گیا۔ رونے کو تھے ہی، آنکھوں میں کوئی چیز پڑ گئی۔ میں اُن کے پیر تھوڑا ہی پکڑے ہوئے ہوں۔ وہ نواب پانڈے پور کا نام تک نہیں لیتے گویا وہاں کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے۔ اُس نے صاف الفاظ میں تو نہیں لیکن کنایتاً ونے کو وہاں جانے کی ترغیب بھی دی مگر وہ پھر ٹال گئے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اتنے دنوں تک علیحدہ رہنے کے بعد ونے اب وہاں جاتے ہوئے شرماتے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ وہاں جانے پر کہیں مجھ پر لوگ تالیاں نہ بجائیں کہ خوف سے پیچھے بیٹھے رہے۔ وہ اب خود پشیمان ہو رہے تھے کہ میں کیوں اتنے دنوں تک منہ چھپائے رہا۔ میں نے کیوں اپنی ذاتی پریشانیوں کو اپنے فرض کے راستہ کا کانٹا بننے دیا۔ صوفیا کی رضامندی سے میں جا سکتا تھا۔ وہ کبھی مجھے منع نہ کرتی۔ صوفیا میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ میں اُس کے نفع کے لئے بھی جو کام کرتا ہوں اُسے بھی وہ ایک بے رحم نقاد کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ خود چاہے محبت سے مغلوب ہو کر اپنے فرض کی ذرا بھی

پرواہ نہ کرے مگر میں معیار سے ذرا بھی نہیں ہٹ سکتا۔ اب انہیں معلوم ہوا کہ یہ میری کمزوری۔ میری بزدلی۔ میری کاہلی تھی جس نے صوفیا کی علالت کو میرے منہ چھپانے کا حیلہ بنا دیا ورنہ میری جگہ تو سپاہیوں کی اگلی صف میں تھی۔ وہ نے چاہتے تھے کہ کوئی ایسی بات پیدا ہو جائے کہ میں اپنی خفت کو مٹا سکوں اس کالکھ کو دھو سکوں۔ کہیں دوسرے صوبہ سے کسی خوفناک حادثہ کی خبر آ جائے اور میں وہاں اپنی لاج رکھوں۔

صوفیا کو اب ان کا ہر وقت ساتھ رہنا گوارا نہ تھا۔ ہم بیمار کا بیمار جس طرح لاٹھی کے سہارے چلتے پھرتے ہیں۔ آرام ہو جانے پر اسے چھوتے تک نہیں۔ مارپل کو چاہتی ہے کہ بچے کچھ دیر جا کر کھیل آئے۔ صوفیا کا دل اب بھی ونے کو آنکھوں سے اوجھل ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں محبت کا سرور چھا جاتا تھا مگر قوت امتیازی اسے فوراً اپنے فرض کی یاد دلا دیتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ جب ونے میرے پاس آئے۔ تو میں بے مروت بن جاؤں۔ بے اعتنائی سے پیش آؤں۔ بولوں نہیں۔ آپ چلے جائیں گے مگر یہ صرف اس کی پاک خواہش تھی۔ وہ اتنی بیدرد۔ اتنی بے مروت نہ ہو سکتی تھی۔ خوف ہوتا تھا کہ کہیں برا نہ مان جائیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ اس کا دل ڈانواڈول ہے یا یہ اتنی خود غرض ہے کہ بیماری میں تو سراپا محبت بنی ہوئی تھی۔ اور اب مجھ سے بولتے ہوئے بھی زبان دکھتی ہے۔ صوفیا تیرا دل محبت چاہتا ہے۔ تیری عقل۔ نیک نامی اور شہرت اور ان دونوں میں برابر کشمکش جاری ہے۔

معرکہ کو شروع ہوئے دو ماہ گزر گئے۔ معاملہ روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔ والنٹیروں کی گرفتاری پر قانع نہ ہو کر گورکھوں نے اب انہیں جسمانی اذیت پہنچانی شروع کر دی تھی۔ بیعزتی بھی کرتے تھے اور اپنے وحشیانہ سلوک سے انہیں خائف بھی کر دینا چاہتے تھے۔ مگر سوردا س پر فائر کرنے کی

یا اُس کے جھونپڑے میں آگ لگانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انقلاب کا خوف تھا۔ بغاوت کا خوف نہ تھا۔ بڑی سے بڑی بغاوت بھی انہیں خائف نہ کر سکتی تھی۔ خوف تھا خونریزی کا۔ نہ جانے کتنے غریب مر جائیں۔ نہ جانے کتنا کہرام مچے۔ ایک بار پتھر کا دل بھی خونریزی سے کانپ اُٹھتا ہے۔

سارے شہر میں کوچہ کوچہ۔ گھر گھر یہی چرچا تھی۔ شہر کے ہزاروں آدمی روز وہاں پہنچ جاتے۔ صرف تماشا دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ ایک بار اُس مخلوص کی جھونپڑی کا اور اس کے اندر رہنے والے کا درشن کرنے کے لئے نیز موقع پڑنے پر اپنے سے جو کچھ ہو سکے وہ کر دکھانے کے لئے۔ والنٹیر کی گرفتاری سے اُن کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ قربانی کی ہوا سی بہہ گئی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ ایک شخص ڈونڈی پیٹتا ہوا نکلا۔ ونے نے نوکر کو بھیجا کہ کیا بات ہے۔ اُس نے لوٹ کر کہا۔ سرکار کا حکم ہوا ہے کہ آج سے شہر کا کوئی آدمی پانڈے پور نہ جائے۔ سرکار اُس کی جان کی حفاظت کی ذمہ وار نہ ہوگی۔

ونے نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ آج کوئی نیا حملہ ہونے والا ہے۔

صوفیا۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

ونے۔ شاید سرکار نے اس جنگ کو ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

صوفیا۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

ونے۔ سخت خونریزی ہوگی۔

صوفیا۔ ضرور ہوگی۔

دفعتاً ایک والنٹیر نے آکر ونے کو نمسکار کیا۔ اور بولا۔ آج تو اُدھر کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ مسٹر کلارک راجپوتانہ سے حاکم ضلع کی جگہ پر آ گئے ہیں۔ مسٹر سینا پتی معطل کر دئے گئے ہیں۔

ونے۔ اچھا مسٹر کلارک آ گئے۔ کب آئے؟

والنٹیر۔ آج ہی چارج لیا ہے۔ سنا جاتا ہے۔ سرکار نے انہیں اسی کام کے

سے خاص طور سے توقعات کیا ہے۔
ورتے ۔ تمہارے کتنے آدمی وہاں ہوں گے؟
والنٹیر۔ کوئی پچاس آدمی۔
ورمے کچھ سوچنے لگے۔ والنٹیر نے کئی منٹ کے بعد پوچھا۔ آپ کوئی خاص حکم دینا چاہتے ہیں۔
ورمے نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا ــــ خواہ مخواہ آگ میں مت کودنا۔ اور حتی الامکان عوام کو ہیجان سے روکنا۔
والنٹیر۔ آپ بھی آئیں گے؟
ورمے نے کچھ اداس ہوکر کہا۔ دیکھا جائے گا۔
والنٹیر کے چلے جانے پر ورمے کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ سوال تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ دونوں کے متعلق سوچ بچار ہونے لگا۔ میں جاکر کیا کروں گا۔ حکام کی جو مرضی ہوگی وہ لیا تو وہ ضرور ہی کریں گے۔ اب سمجھوتہ کی کوئی امید نہیں۔ لیکن یہ کتنی ذلت کی بات ہے کہ شہر کے باشندے تو وہاں جانے کے لئے تیار ہوں اور میں جس نے یہ معرکہ چھیڑا ہے منہ چھپا کر بیٹھا رہوں۔ اس موقع پر میرا الگ رہنا مجھے زندگی بھر کے لئے بدنام کردے گا۔ میری حالت لہبندر کمار سے بھی زیادہ گئی گزری ہو جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے بزدل ہے۔ ایک طرح سے میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ آج بھی گولیاں چلیں۔ ضرور چلیں گی۔ کون کہہ سکتا ہے کیا ہوگا؟ صوفیا کس کی ہوکر رہے گی۔ آہ۔ میں نے ناحق عوام میں یہ جوش پھیلایا۔ اندھے کا جھونپڑا گر گیا ہوتا اور ساری باتیں ختم ہو جاتیں۔ میں نے ہی ستیہ گرہ کا جھنڈا کھڑا کیا۔ سوتے ہوئے شیر کو جگایا۔ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالی۔
انہوں نے اپنے دل کو ملامت کرتے ہوئے سوچا۔ آج میں اتنا پست ہمت کیوں ہو رہا ہوں؟ کیا میں موت سے ڈرتا ہوں؟ موت سے کیا ڈر؟ مرنا تو ایک دن

ضرور یہی ہے! کیا میرے مرنے سے ملک سُونا ہو جائے گا؟ کیا میں ہی اکیلا ہوں؟ کیا
دوسرے بہادروں کی پیدا کرنے کی والی ماں ملک میں موجود ہی نہیں ہے۔

صوفیا کچھ دیر تک ٹکٹکی لگائے ان کے منہ کی طرف تاکتی رہی۔ دفعتاً وہ اٹھ کھڑی
ہوئی اور بولی۔ میں وہاں جاتی ہوں۔

ونے نے خوف زدہ ہو کر کہا — آج جانا خطرناک ہے۔ سُنا نہیں سارے ناکے
بند کر دئے گئے ہیں؟

صوفیا۔ عورتوں کو کوئی نہ روکے گا۔

ونے نے صوفیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت منّت آمیز انداز سے کہا —
جانِ من۔ میرا کہنا مانو۔ آج نہ جاؤ۔ آثار اچھے نہیں نظر آتے۔ کوئی بُرا واقعہ
ہونے والا ہے۔

صوفیا۔ جبھی تو میں جانا چاہتی ہوں۔ اوروں کے لئے خوف مانع ہو تو میرے لئے
بھی کیوں ہو؟

ونے۔ کلارک کا آنا بُرا ہُوا۔

صوفیا۔ اسی لئے میں اور جانا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے سامنے
کوئی وحشیانہ حرکت نہ کر سکے گا۔ اتنی شرافت ابھی اُس میں ہے۔

یہ کہہ کر صوفیا اپنے کمرہ میں گئی۔ اُس نے اپنا پرانا پستول شلوکے کی جیب میں رکھا۔
گاڑی تیار کرنے کو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ باہر نکلی تو گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اُس نے جا کر
ونے سنگھ کے کمرہ میں دیکھا وہ وہاں نہ تھے۔ پھر وہ دروازہ پر کچھ دیر تک کھڑی
رہی۔ ایک نامعلوم خوف نے کسی آنے والی مُصیبت کے اندیشہ نے اُس کے دل کو
ڈانواڈول کر دیا۔ وہ اپنے کمرہ میں واپس جانا چاہتی تھی۔ کہ کنور صاحب آتے ہوئے
دکھائی دیئے۔ صوفیا ڈری کہ یہ کچھ پُوچھ نہ بیٹھیں۔ وہ فوراً گاڑی میں جا بیٹھی اور
کوچوان کو تیزی سے لے جانے کا حکم دیا۔ لیکن جب گاڑی کچھ دور نکل گئی تو وہ
سوچنے لگی کہ ونے کہاں چلے گئے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہُوا کہ مجھے جانے پر آمادہ دیکھ کر

وہ مجھ سے پہلے ہی چلے گئے ہوں؟ اُسے پچھتاوا ہونے لگا کہ میں ناحق یہاں آنے کو تیار ہوئی۔ ونے کی خواہش نہ تھی۔ وہ میرے ہی اصرار سے آئے ہیں۔ ایشور۔ تم اُن کی حفاظت کرنا۔ کلارک اُن سے جلا ہی ہوا ہے۔ کہیں ہنگامہ نہ ہو جائے۔ میں نے ونے کو نکما سمجھا۔ میری کتنی زیادتی ہے! یہ دوسرا موقعہ ہے کہ میں نے اُن پر جھوٹا الزام لگایا۔ میں شاید اب تک اُنہیں نہیں سمجھی۔ وہ دل کے جری ہیں۔ یہ میری کم ظرفی ہے کہ اُن کے بارہ میں اکثر مجھے بدگمانی ہو جاتی ہے۔ اگر میں اُن کی راہ کا کانٹا نہ بنی ہوتی تو ان کی زندگی کتنی پاک وصاف کتنی روشن ہوتی۔ میں ہی اُن کی کمزوری کا سبب ہوں اور میں ہی اُن پر الزام عاید کرنے والی ہوں۔ ایشور کرے وہ یہاں نہ آئے ہوں۔ اُن کا نہ آنا ہی اچھا ہے۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں آئے یا نہیں۔ چل کر دیکھ لوں۔

اُس نے کوچوان کو اور تیز ہانکنے کا حکم دیا۔

اُدھر ونے سنگھ دفتر میں جا کر سمتی کے جمع خرچ کا حساب لکھ رہے تھے۔ اُن کا دل بہت اُداس تھا۔ چہرہ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد اپنے چاروں طرف مغموم نگاہوں سے دیکھتے اور پھر حساب لکھنے لگتے۔ نہ جانے وہاں سے لوٹ کر آنا ہو یا نہ ہو۔ اس لئے حساب کتاب ٹھیک کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔ کام ختم کر کے انہوں نے دعائیہ انداز سے اوپر کی طرف دیکھا۔ پھر باہر نکلے۔ بائیسکل اٹھائی اور تیزی سے چلے۔ پیچھے مڑ مڑ کر مکان۔ باغ اور درختوں کو اتنی مشتاق نگاہوں سے دیکھتے جاتے گویا وہ انہیں پھر نہ دیکھیں گے۔ گویا یہ اُن کا آخری نظارہ ہے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے دیکھا کہ صوفیا چلی جا رہی ہے۔ اگر وہ اس سے مل جاتے تو شاید صوفیا بھی اُن کے ساتھ لوٹ پڑتی مگر انہیں یہ دُھن سوار تھی کہ میں صوفیا کے پہلے وہاں جا پہنچوں۔ موڑ پر آتے ہی انہوں نے سائیکل کو پھیر دیا اور دوسرا راستہ پکڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ میدان جنگ میں پہنچے تو صوفیا ابھی وہاں نہ آئی تھی۔ ونے نے دیکھا کہ گرے ہوئے مکانوں کی جگہ سینکڑوں چھولداریاں کھڑی ہوئی ہیں اور اُن کے چاروں طرف گورکھے کھڑے ہوئے گشت لگا رہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اندر جا سکے۔

ہزاروں آدمی ارد گرد جمع ہیں گویا کسی بڑے تماشہ کو دیکھنے کے لئے تماشائی لوگ ایک حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے ہوں۔ درمیان میں سوردا س کا جھونپڑا اسٹیج کی طرح موجود تھا۔ سورداس جھونپڑے کے سامنے لاٹھی لئے کھڑا تھا گویا ناٹک کو شروع کرنے کے لئے کھڑا ہو۔ سب لوگ سامنے کا نظارہ دیکھنے میں اس قدر محو تھے کہ ونے کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ سمتی کے جانباز والنٹیر رات ہی رات جھونپڑے کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ ونے نے فیصلہ کیا کہ میں بھی وہیں جا کر کھڑا ہو جاؤں۔

یکایک کسی نے پیچھے سے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا تو صوفیا تھی۔ اُس کے چہرہ کا رنگ فق تھا۔ گھبرائی ہوئی آواز سے بولی — تم کیوں آئے؟

ونے۔ تمہیں تنہا کیسے چھوڑ دیتا؟

صوفیا۔ مجھے بڑا خوف معلوم ہو رہا ہے۔ یہ توپیں کیوں لگا دی گئی ہیں؟

ونے نے توپیں نہ دیکھی تھیں۔ واقعی تین توپیں جھونپڑے کی طرف منہ کر کے کھڑی کر دی گئی تھیں۔ گویا تماشاگاہ میں دیو آ گئے ہوں۔

ونے۔ شاید آج اس ستیاگرہ کو ختم کر دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔

صوفیا۔ میں یہاں ناحق آئی۔ مجھے گھر پہنچا دو۔

آج صوفیا کو پہلی بار محبت کی کمزوری کا احساس ہوا۔ ونے کی سلامتی کے خیال سے وہ کبھی اتنی بدحواس نہ ہوئی تھی۔ جانتی تھی کہ ونے کا فرض اُن کی عزت اُن کی نیک نامی یہاں رہنے ہی میں ہے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی اُن کو یہاں سے ہٹا لے جانا چاہتی تھی۔ اُسے اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ اپنے کو وہ بالکل بھول گئی تھی۔

ونے۔ ہاں تمہارا یہاں رہنا خطرناک ہے۔ میں نے پہلے ہی منع کیا تھا۔ پر تم نے نہ مانا۔

صوفیا ونے کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گاڑی میں بٹھا دینا چاہتی تھی کہ دفعتاً اندر راج کا موٹر آ پہنچا۔ موٹر سے اتر کر وہ صوفیا کے پاس گئیں اور بولیں — کیوں صوفیا۔

جاتی ہو کیا؟
صوفیا نے بات بنا کر کہا۔ نہیں جاتی نہیں ہوں۔ ذرا پیچھے ہٹ جانا چاہتی ہوں۔
صوفیا کو اندو کا آنا کبھی اتنا ناگوار نہ ہوا تھا۔ ونے کو بھی بُرا معلوم ہوا۔ بولے۔
تم کیوں آئیں؟
اندو۔ اس لئے کہ تمہارے بھائی صاحب نے آج خط کے ذریعے مجھے منع کر دیا تھا۔
ونے۔ آج کی حالت بہت نازک ہے۔ ان لوگوں کے صبر و تحمل، ہمت و بردباری کا آج سخت ترین امتحان ہوگا۔
اندو۔ تمہارے بھائی صاحب نے بھی تو اس خط میں یہی بات لکھی تھی۔
ونے۔ کلارک کو دیکھو۔ کتنی بیدردی سے لوگوں کو گھوڑا رہا ہے۔ مگر کوئی ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔ عوام کا ضبط و تحمل اب آخری حد کو پہنچ گیا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کیا ہو جائے۔
عوام اس قدر مستقل مزاج اور وفاشعار ہو سکتے ہیں۔ اس کا احساس ونے کو آج ہی ہوا۔ ہر شخص سرفروشی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ اتنے میں نایک رام کسی طرف سے آ گئے۔ انہوں نے ونے کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔ آج تم ادھر کیسے بھول پڑے بھیا؟
اس سوال میں کتنا طنز، کتنی حقارت کتنی ملامت تھی۔ ونے تلملا گئے۔ بات ٹال کر بولے۔ کلارک بڑا بے رحم ہے۔
نایک رام نے انگوچھا ہٹا کر ونے کو اپنی پیٹھ دکھائی۔ گردن سے کمر تک ایک نیلا سُرخ خط کھنچا ہوا تھا۔ گویا کسی نوک دار کیل سے کھرچ دیا گیا ہو۔ ونے نے پوچھا۔ یہ زخم کیسے لگا؟
نایک رام۔ ابھی یہی ہنٹر کھاتے ہوئے چلا آتا ہوں۔ آج جیتا بچا تو سمجھوں گا۔ غصہ تو ایسا آیا تھا کہ ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لوں۔ مگر ڈرا کہ کہیں گولی نہ چل جائے تو نایک سب آدمی بھون ڈالے جائیں۔ تم نے تو ادھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ عورت کا مایا جال

بڑا کٹھن ہے۔

صوفیا نے اس جملہ کا آخری لفظ سن لیا بولی ---- تم پرمیشر کا شکر ادا کرو۔ کہ تم اس مایا جال میں نہیں پھنسے۔

صوفیا کی ہنسی نے نائک رام کو گدگدا دیا۔ سارا غصّہ فرو ہو گیا۔ بولے۔ بھیّا مس صاحب کو جواب دو۔ مجھے معلوم تو ہے پر کہتے نہیں بنتا۔ ہاں کیسے؟

ونے۔ کیوں تمہیں نے تو فیصلہ کیا تھا کہ اب عورتوں کے علاوہ کسی سے نہ جاؤں گا "بڑی بے وفا ہوتی ہیں۔" یہ اُسی روز کی بات ہے جب میں صوفیا کی ملامت سُن کر اودے پور جا رہا تھا۔

نائک رام۔ (شرمائی) واہ بھیّا۔ تم نے تو میرے ہی اوپر ڈنک دیا۔

ونے۔ اور کیا کہوں؟ سچ کہنے میں کیا تامل؟ خوش ہوں تو مُصیبت۔ ناراض ہوں تو مُصیبت۔

نائک رام۔ بس بھیّا۔ میرے من کی بات کہی۔ ٹھیک یہی بات ہے۔ ہر طرح مردوں پر ہی مار۔ راضی ہوں تو مصیبت۔ ناراض ہوں تو اُس سے بڑی مُصیبت۔

صوفیا۔ جب عورت اتنی بڑی مُصیبت ہے تو مرد کیوں اُسے اپنے سر منڈھتے ہیں؟ جسے دیکھو وہی اُس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ کیا دُنیا کے سبھی مرد جاہل ہیں۔ کسی کو تمیز نہیں چھو گئی؟

نائک رام۔ بھیّا۔ مس صاحب نے تو میرے سامنے پتھر رکھ دیا۔ بات تو ٹھیک ہے کہ جب عورت اتنی بڑی مصیبت ہے تو مرد کیوں اس کے پیچھے حیران رہتے ہیں؟ ایک کی دُردسا دیکھ کر دوسرا کیوں نہیں سیکھتا؟ بولو بھیّا ہے کچھ جواب؟

ونے۔ جواب کیوں نہیں ہے۔ ایک تو تمہیں نے میری بُری دشا سے سیکھ لیا۔ تمہاری طرح اور بھی کتنے ہی پڑے ہوں گے۔

نائک رام (جھینپ کر) بھیّا تم نے پھر میرے ہی سر ڈال دیا۔ یہ ٹھیک

ٹھیک جواب نہ بن پڑا۔

وسنے۔ ٹھیک وہی ہے جو تم نے آتے ہی آتے کہا تھا کہ عورت کا پایا جال بڑا کٹھن ہے۔

انسان فطرتاً تفریح پسند ہے۔ اپنے رنج کے وقت بھی اُسے ہنسی سوجھتی ہے۔ پھانسی پر چڑھنے والے لوگ بھی ہنستے ہنستے گئے ہیں۔ یہاں یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ مسٹر کلارک گھوڑا اُچھلتے اور آدمیوں کو کچلتے ہوئے وہاں آ پہنچے۔ صوفیا پر نگاہ پڑی تیر سا لگا۔ ٹوپی اوپر اٹھا کر بولے۔ یہ وہی ناٹک ہے یا کوئی دوسرا شروع کر دیا؟

نشتر سے بھی تیز اور پتھر سے بھی سخت۔ بیہودہ جملہ تھا۔ مسٹر کلارک نے اپنی دلی مایوسی اپنے رنج۔ اپنی بے اعتقادی۔ اپنے غصہ کو ان الفاظ میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔

صوفیا نے برجستہ جواب دیا۔ نہیں، نیا ناٹک ہے۔ اس وقت جو دوست تھے وہی اب دشمن ہیں۔

کلارک طنز کو سمجھ کر تلملا اُٹھے۔ بولے۔ یہ تمہاری بے انصافی ہے۔ میں اپنے اصول سے ذرا بھی منحرف نہیں ہوا۔

صوفیا۔ کسی کو ایک بار پناہ دینا اور دوسری بار اسی پر تلوار اٹھانا کیا ایک ہی بات ہے؟ جس اندھے کے لئے تم نے پہاڑ کے روسا کا مقابلہ کیا تھا۔ جس کے لئے بدنام ہوئے تھے۔ جس کا خمیازہ اٹھایا تھا۔ اسی اندھے پر تلوار چلانے کو آج راجپوتانہ سے دوڑے آئے ہو۔ کیا دونوں ایک ہی بات ہے؟

کلارک۔ ہاں مس سیوک۔ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں۔ اپنے ذاتی جذبات و خیالات پر عمل پیرا ہونے کے نہیں۔ جہاز سے اترتے ہی ہم اپنی شخصیت کو مٹا دیتے ہیں۔ ہمارے انصاف ہماری ہمدردی۔ ہمارا اخلاق۔ سب کا ایک ہی مقصد ہے۔ ہمارا اوّل اور آخر مقصد ہے حکومت کرنا۔

مسٹر کلارک کا اشارہ صوفیا کی طرف اتنا نہیں جتنا ونے کی طرف تھا۔

وہ دونوں کو کیا بتاّ دھمکا رہے تھے۔ صاف الفاظ میں اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہم کسی کے دوست نہیں ہیں۔ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں اور جو ہمارے کام میں مداخلت کرے گا اُسے بیخ و بُن سے اُڑا دیں گے۔

صوفیا نے کہا۔ نامنصفانہ حکومت حکومت نہیں بلکہ جنگ ہے۔

کلارک۔ تم نے پھاوڑے کو پھاوڑا کہہ دیا۔ ہم میں اتنی شرافت نہیں۔ اچھا پھر تم سے پھر ملوں گا۔

یہ کہہ کر انہوں نے گھوڑے کو مہمیز لگائی۔ صوفیا نے بلند لہجہ میں کہا۔ تمہیں ہرگز نہ آنا۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔

آسمان ابر آلود ہو رہا تھا۔ شام سے پہلے شام ہو گئی تھی۔ مسٹر کلارک ابھی گئے تھے کہ مسٹر جان سیوک کا موٹر آ پہنچا۔ وہ جیوں ہی موٹر سے اُترے کہ سینکڑوں آدمی اُن کی طرف لپکے۔ لوگ حکام سے دبتے ہیں۔ اُن کی طاقت کا انہیں علم ہوتا ہے اور احساس بھی۔ جہاں اُس طاقت کا خوف نہیں ہوتا وہاں وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مسٹر سیوک پر حکام کی مہربانی تھی مگر وہ خود حاکم نہ تھے۔ وہ اپنی جان بچا کر گورکھوں کے کیمپ کی طرف بھاگے۔ سر پہ پیر رکھ کر دوڑے مگر ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ مسٹر کلارک نے گھوڑے پر سے اُنہیں دوڑتے دیکھا تھا۔ اُنہیں گرتے دیکھا تو سمجھے کہ لوگوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اُنہوں نے فوراً گورکھوں کی ایک جماعت اُن کی حفاظت کے لئے بھیجا۔ مجمع نے بھی خطرناک صورت اختیار کی۔ لوگ بے بلّی سے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ سورداس ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ یہ ہل چل مچتی تو خوفزدہ ہو کر بھیرو سے بولا۔ تم مجھے ذرا اپنے کندھے پر بٹھا لو۔ ایک بار اور لوگوں کو سمجھا دوں۔ کیوں لوگ یہاں سے ہٹ نہیں جاتے؟ سینکڑوں بار کہہ چکا۔ کوئی سنتا ہی نہیں۔ کہیں گولی چل گئی تو آج اُس دن سے بھی زیادہ کشت و خون ہوگا۔

بھیرو نے سورداس کو کندھے پر بٹھا لیا۔ اس مجمع سے اُس کا سر بالشت بھر اُونچا ہو گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے اُس کی باتیں سننے دوڑے۔ بہادروں کی پرستش کرنا عوام

کا ذاتی خاصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اندھا یونانی دیوتا اپنے عقیدتمندوں کے درمیان میں کھڑا ہے۔

سورداس نے اپنی بے نور آنکھوں سے مجمع کی طرف دیکھ کر کہا۔ بھائیو۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھر جائیں۔ آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں۔ گھر چلے جائیں۔ یہاں جمع ہو کر حاکم لوگوں کو چڑھانے سے کیا فائدہ؟ میری موت آوے گی تو آپ لوگ کھڑے رہیں گے اور میں مر جاؤں گا۔ موت نہ آوے گی تو میں توپوں کے منہ سے بچ کر نکل جاؤں گا۔ آپ لوگ اصل میں میری مدد کرنے نہیں آئے۔ مجھ سے دشمنی کرنے آئے ہیں۔ حاکموں کے من میں سنکوچ کے من میں پولیس کے من میں جو دیا اور دھرم کا کھیال آتا۔ آپ لوگوں نے جمع ہو کر اس کھیال کو گسا بنا دیا ہے۔ میں حاکموں کو دکھا دیتا کہ ایک گریب اندھا آدمی ایک سنکوچ کو کیسے پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ توپ کا منہ کیسے بند کر دیتا ہے۔ تلوار کی دھار کیسے موڑ دیتا ہے۔ میں دھرم کے بل پر لڑنا چاہتا تھا۔ . . . . .

اس کے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ مسٹر کلارک نے اُسے کھڑے ہو کر کچھ بولتے ہوئے سُنا تو سمجھے کہ اندھا لوگوں کو فساد کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک روح یہاں موجود رہے گی اعضاء کی حرکت کبھی بند نہ ہو گی۔ اس لئے روح کو جُدا کر دینا ضروری ہے۔ منبع کو بند کر دینے سے چشمہ کی روانی خود بخود بند ہو جائے گی۔ وہ اسی تاک میں لگے ہوئے تھے کہ اس خیال کو کس طرح عمل میں تبدیل کریں۔ مگر سورداس کے گرد روز ہی آدمیوں کا مجمع رہتا تھا۔ کلارک کو مناسب موقع نہ ملتا تھا۔ اب جو اُس کے سر کو اوپر اٹھا ہوا دیکھا تو انہیں وہ موقع مل گیا۔ وہ سنہرا موقع تھا جس کے ملنے پر ہی اس جنگ کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا اُسے وہ جانتے تھے۔ مجمع میں جوش پیدا ہو گا۔ وہ پتھر برسائے گا۔ گھروں میں آگ لگائے گا۔ سرکاری دفتروں کو لوٹنے گا۔ ان شرارتوں کو مٹا دینے کے لئے اُن کے پاس کافی طاقت تھی۔ اصل چیز تھی اندھے کو رزم گاہ سے ہٹا

دینا۔ یہی زندگی کا مرکز ہے۔ یہی حرکت دینے والی طاقت ہے۔ انہوں نے جیب سے پستول نکالا۔ اور سورداس پر فائر کر دیا۔ نشانہ ٹھیک تھا۔ گولی سورداس کے کندھے میں لگی۔ سر ٹنک گیا اور خون بہنے لگا۔ بھیرو اُسے سنبھال نہ سکا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ روحانی طاقت مادی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکی۔

صوفیا نے مسٹر کلارک کو جیب سے پستول نکالتے اور سورداس کو نشانہ بناتے دیکھا تھا۔ اُس کو زمین پر گرتے دیکھ کر سمجھ گئی کہ قاتل نے اپنا کام پورا کر دیا۔ فٹن پر کھڑی تھی۔ نیچے کود پڑی اور مقتول کی طرف دوڑی جیسے کوئی ماں اپنے بچہ کو کسی آنے والی گاڑی کی زد میں دیکھ کر بے تحاشا دوڑ پڑے۔ ونے اس کے پیچھے پیچھے اُسے روکنے کے لئے دوڑے۔ وہ کہتے جاتے تھے۔ "صوفیا۔ ایشور کے لئے وہاں نہ جاؤ۔ مجھ پر اتنا رحم کرو۔ دیکھو گورکھے بندوقیں سنبھال رہے ہیں۔ ہائے تم نہیں مانتیں یہ کہہ کر انہوں نے صوفیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف کھینچا۔ لیکن صوفیا نے ایک جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر دوڑی۔ اُسے اس وقت کچھ نہ سوجھتا تھا۔ نہ گولیوں کا خوف تھا نہ سنگینوں کا۔ لوگ اُسے دوڑتے دیکھ کر خود بخود راستہ سے ہٹتے جاتے۔ گورکھے سپاہی سامنے کھڑے تھے۔ مگر صوفیا کو دیکھ کر وہ بھی ہٹ گئے۔ مسٹر کلارک نے پہلے ہی سخت تاکید کر دی تھی کہ کوئی سپاہی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ ونے اس فوجی دیوار کو پار نہ کر سکے۔ رقیق شے سوراخ کے راستہ نکل گئی مگر ٹھوس چیز نہ نکل سکی۔

صوفیا نے جا کر دیکھا تو سورداس کے شانہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اعضا سست پڑ گئے تھے۔ چہرہ بگڑ گیا تھا مگر آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سکون۔ قناعت اور صبر کی چمک تھی۔ ان میں عفو تھا۔ غصہ اور خوف کا نام نہ تھا۔ صوفیا نے فوراً رومال نکال کر زخم پر باندھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ انہیں شفاخانہ بھیجنا چاہئے۔ ابھی جان ہے۔ ممکن ہے بچ جائیں۔ بھیرو نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ صوفیا اُسے اپنی گاڑی تک لائی۔ اُس پر سورداس کو لٹا دیا۔ خود گاڑی پر

تیسرا۔ سرکار سے کتنا انعام ملنے والا ہے۔

چوتھا۔ آپ ہی نے تو راجپوتانہ میں دربار کی طرف ہو کر رعایا کو آگ میں جھونک دیا تھا۔

ونے۔ میری ملامت کا موقع پھر آئے گا۔ اگرچہ میں چند خاص وجوہ سے ادھر آپ کا ساتھ نہ دے سکا مگر ایشور جانتا ہے کہ میری ہمدردی آپ ہی کے ساتھ تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے بھی آپ کی طرف سے غافل نہ تھا۔

ایک آدمی۔ یار! یہاں کھڑے کھڑے کیا بکواس کر رہے ہو؟ کچھ دم ہو تو چلو لوٹ مریں۔

دوسرا۔ یہ بکھیڑا کرنے کا موقع نہیں ہے۔ آج ہمیں دکھانا ہے کہ ہم جنتا کے لئے کتنی دلیری سے جان دے سکتے ہیں۔

تیسرا۔ چلو اگر گورکھوں کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی شخص پیچھے قدم نہ ہٹا دے۔ وہیں اپنی لاشوں کا ڈھیر لگا دو۔ بال بچوں کو خدا پر چھوڑ دو۔

چوتھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آگے بڑھ کر للکاریں کہ بزدلوں کا خون بھی جوش کھانے لگے۔ ہمیں سمجھانے چلے ہیں گویا ہم دیکھتے نہیں کہ سامنے فوج بندوقیں بھرے کھڑی ہے اور ایک ہی باڑھ میں ہمارا ستھراؤ کر دے گی۔

پانچواں۔ بھائی ہم غریبوں کی یہاں ستی ہوتی ہے۔ رئیس زادہ ہوتے تو ہم بھی دور ہی سے کھڑے تماشہ دیکھتے۔

چھٹواں۔ اس سے کہو کہ جا کر چلو بھر پانی میں ڈوب مرے ہمیں اس کے نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ انگلی میں خون لگا شہید بننے چلے ہیں۔

یہ حقارت آمیز طنزیہ اور سخت الفاظ ونے کے دل میں تیر کی طرح اتر گئے۔ ہائے رے قسمت۔ میری زندگی بھر کی خدمت، قربانی اور نفس کشی کا یہی نتیجہ ہے! اپنا سب کچھ قومی خدمت کی قربان گاہ پر چڑھا کر مدتیوں کو محتاج ہو جانے کا یہی صلہ ہے! کیا ریاست کی بدنامی میرے مرنے کبھی دور ہو گی؟ یہ سوچتے ہوئے وہ

بھول گئے کہ میں یہاں عوام کی حفاظت کرنے آیا ہوں۔ گورکھا فوج سامنے کھڑی ہے۔
میں یہاں سے ہٹا کر ایک لمحہ میں انسانوں کا بے تحاشا قتل ہونے لگے گا۔ میرا فرض
عوام کو آخیر تک روکے رہنا ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر انہوں نے طعنے دیئے۔ میری
تحقیر کی۔ مجھے بدنام کیا۔ ناملائم الفاظ کہے۔ میں قصوروار ہوں۔ اگر نہیں ہوں۔ تو
بھی مجھے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ سمجھ ہوا آپ وہ بھول گئے موقع شناس
آدمی وقت کے موافق کام کرتا ہے۔ جہاں دبنا چاہیئے وہاں دب جاتا ہے۔ جہاں
تیز پڑنا چاہیئے وہاں تیز پڑتا ہے۔ اسے عزت یا ذلت سے خوشی یا رنج نہیں
ہوتا۔ اُس کی نگاہ برابر اپنے مقصد پر رہتی ہے۔ وہ [illegible] زندگی کے ساحل کی
طرف بڑھتا ہے۔ لیکن سادہ مزاج غیر ممتد اور صاف دل لوگ بادلوں کی مانند ہوتے
ہیں جو بادِ موافق کو پاکر زمین کو سیراب کر دیتے ہیں اور بادِ مخالف کے جھونکوں سے
منتشر ہو جاتے ہیں۔ سیاست دان شخص کے لیئے اپنا معیار ہی سب کچھ ہے۔ ضمیر
کی اُس کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں۔ باعزت آدمیوں کے لیئے اپنی اخلاقی قوت ہی
سب سے بڑھ کر ہے۔ وہ اپنے اخلاق پر کیئے گئے حملوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔
وہ اپنی بیگناہی ثابت کرنا اپنی معیار پسندی سے کہیں زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ وہ
کا خوبصورت چہرہ تمتما اُٹھا اور اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ وہ دیوانہ وار مجمع
مجمع کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔ کیا آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ رئیسوں
کے بیٹے کیونکر جان دیتے ہیں؟ دیکھیئے۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے جیب سے بھرا ہوا پستول نکالا۔ اُس کی نال سینہ میں لگائی۔
اور جب تک لوگ دوڑیں زمین پر گر پڑے۔ لاش تڑپنے لگی۔ دل کی ساری تمنائیں
خون کا فوارہ بن کر نکل گئیں۔ اُسی وقت بارش ہونے لگی گویا جنت کی روحیں پھول
برسا رہی تھیں۔

زندگی کا رشتہ کتنا نازک ہے! کیا پھول سے بھی زیادہ نازک نہیں۔ جو ہوا
کے جھونکے سہتا ہے اور مُرجھاتا نہیں؟ کیا وہ بیلوں سے زیادہ نازک نہیں جو

میرا طعنہ بجلی کا کام کرے گا۔

پوچھتا۔ ہمارے دلوں کا یہ زخم ہمیشہ ہرا رہے گا۔ ہم اے فرشتہ خصلت انسان کو کبھی بھول نہ سکیں گے۔ کتنی بہادری سے جان دے دی۔ جیسے کوئی ایک پیسہ نکال کر بھکاری کے سامنے پھینک دے۔ رئیس زادوں میں بھی اوصاف ہوتے ہیں۔ مگر جینا جانتے ہیں تو مرنا بھی جانتے ہیں۔ رئیس کی یہی پہچان ہے کہ بات پہ مر مٹے۔

اندھیرا ہوتا جاتا تھا۔ پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ کبھی ذرا دیر کے لئے بوندیں ہلکی پڑ جاتیں اور پھر زوروں سے گرنے لگتیں۔ جیسے کوئی رونے والا تھک کر ذرا دم لے لے اور پھر رونے لگے۔ زمین نے پانی کی چادر میں منہ چھپا لیا تھا۔ ماتا منہ پر آنچل ڈالے رو رہی تھی۔ رہ رہ کر ٹوٹی ہوئی دیواروں کے گرنے کا دھماکا ہوتا تھا جیسے کوئی سینہ پیٹ پیٹ کر ماتم کر رہا ہو۔ لمحہ لمحہ پر بجلی کوندتی تھی جیسے آسمان پہ روحیں ماتم کر رہی ہوں۔ دم دم کے میں یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اندو مسز جان سیوک کے ساتھ تھی۔ یہ خبر سنتے ہی غش کھا کر گر پڑی۔

ونے کی لاش پر ایک چادر تان دی گئی۔ چراغوں کی روشنی میں اس کا چہرہ اب بھی پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ دیکھنے والے آتے تھے۔ روتے تھے اور عزاداروں کی صف میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ کوئی کوئی پھولوں کی مالا رکھ دیتا تھا۔ جانباز لوگ یوں ہی مرتے ہیں۔ تمنائیں اُن کے گلے کی زنجیر نہیں ہوتیں۔ نفسانی خواہشات اُن کے پیروں کی بیڑیاں نہیں بنتیں۔ انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ میرے بعد کون ہنسے گا اور کون روئے گا۔ انہیں اس کا خوف نہیں ہوتا کہ میرے بعد کون سنبھالے گا؟ یہ سب دنیا سے لپٹنے والوں کے بہانے ہیں۔ بہادر لوگ آزاد ہوتے ہیں۔ جب تک جیتے ہیں بےفکری سے جیتے ہیں۔ جب مرتے ہیں بےفکری سے مرتے ہیں۔

ہم داستانِ غم کو کیوں طول دیں؟ جب بیگانوں کی آنکھوں سے آنسو اور دلوں سے آہ نکل پڑی تھی تو یگانوں کا کہنا ہی کیا۔ نایک رام سورداس کے ساتھ شفاخانہ گئے تھے۔ لوٹے ہی تھے کہ یہ منظر دکھائی دیا۔ ایک ٹھنڈی سانس

کھینچ کر رونے کے قدموں پر سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگے۔ ذرا طبیعت ٹھکانے ہوئی تو صوفیا کو خبر دینے چلا، ابھی شفا خانہ ہی میں تھی۔

نایک رام راستہ بھر سوچتے ہوئے گئے مگر صوفیا کے پاس پہنچے تو گلا اتنا بھر گیا کہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس کی طرف دیکھ کر سسک کر رونے لگے۔ صوفیا کے دل میں دھڑکا سا اُٹھا۔ ابھی نایک رام گئے اور اُلٹے پاؤں واپس آ گئے۔ ضرور کوئی بری خبر ہے۔ پوچھا "کیا ہے پنڈا جی؟" یہ پوچھتے ہی اُس کا گلا بھی بھر آیا۔

نایک رام کی سسکیاں فریاد و فغاں میں تبدیل ہو گئیں۔ صوفیا نے دوڑ کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا "کیا ونے؟" یہ کہتے کہتے فرطِ غم کی حالت میں شفا خانہ سے نکل پڑی اور پانڈے پور کی طرف چلی۔ نایک رام آگے آگے لالٹین دکھاتے ہوئے چلے۔ پانی نے جل تھل ایک کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کے درخت جواب پانی میں کھڑے تھے۔ سڑک کا پتہ دے رہے تھے۔ صوفیا کا رنج ایک ہی لمحہ میں پشیمانی کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ ہائے میں ہتیارن ہوں، کیوں آسمان سے بجلی گر کر مجھے جلا نہیں دیتی؟ کیوں کوئی سانپ زمین سے نکل کر مجھے ڈس نہیں لیتا؟ کیوں زمین پھٹ کر مجھے نگل نہیں جاتی؟ ہائے میں وہاں نہ گئی ہوتی تو وہ ہرگز نہ جاتے۔ میں کیا جانتی تھی کہ مقدر مجھے تباہی و بربادی کی طرف لیے جاتا ہے۔ میں دل میں ان پر جھنجھلا رہی تھی۔ مجھے یہ شک بھی ہو رہا تھا کہ یہ ڈرتے ہیں۔ آہ یہ سب میرے کارن ہوا۔ میں ہی اپنی بربادی کا سبب ہوں۔ میں اپنے ہی ہاتھوں لٹ گئی۔ ہائے میں اُن کی محبت کے معیار کو نہ پہنچ سکی۔"

پھر اس کے دل میں خیال آیا کہیں یہ خبر غلط نہ ہو۔ انہیں صرف چوٹ لگی ہو اور وہ بیہوش ہو گئے ہوں۔ آہ۔ کاش میں ایک بار اُن کی باتوں سے اپنے دل کو پاک بنا لیتی۔ نہیں نہیں وہ زندہ ہیں۔ ایشور مجھ پر اتنا ظلم نہیں کر سکتے۔ میں نے کبھی کسی مخلوق کو ایذا نہیں پہنچائی۔ میں کبھی بد اعتقاد نہیں ہوئی۔ پھر وہ مجھے اتنی سخت سزا کیوں دے گا؟

جب صوفیا موقع واردات کے قریب پہنچی تو اُس پر ایک زبردست خوف کا غلبہ ہُوا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک میل کے پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہاں کیسے جاؤں؟ کیسے اُنہیں دیکھوں گی؟ ان کی موت کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اُن کی لاش خاک و خون میں لپٹی ہوئی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ جسے اُس نے گویا جیتے جاگتے دیکھا تھا۔ اُسے اس بُری حالت میں وہ کیسے دیکھے گی؟ اُسے اس وقت زبردست خواہش ہوئی کہ وہاں جاتے ہی میں بھی اُن کے قدموں پر گر کر جان دے دوں۔ اب دنیا میں میرے لئے کون سا آرام ہے۔ ہائے یہ صبر آزما جدائی کیسے برداشت ہوگی؟ میں نے اپنی زندگی کو تباہ کر دیا۔ ایسے اعلیٰ آدمی کو مذہب کی وحشیانہ نمونہ پر قربان کر دیا۔

اگرچہ وہ جانتی تھی کہ ونے کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھی اُسے ایک چھوٹی اُمید ہو رہی تھی کہ کون جانے اُنہیں صرف غش آگیا ہو۔ دفعتاً اُسے اپنے عقب سے ایک موٹر کار پانی کو چیرتے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ اُس کی تیز روشنی میں چمکتا ہُوا پانی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دونوں طرف سے آبی جانور اُس پر حملہ کر رہے ہوں۔ وہ نزدیک آکر رُکا۔ رانی جاہنوی تھیں۔ صوفیا کو دیکھ کر بولیں۔ بیٹی، تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ آؤ میرے ساتھ چلو۔ کیا گاڑی نہ ملی؟

صوفیا چیخ مار کر رانی سے لپٹ گئی مگر اُن کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اور نہ چہرہ پر آثارِ غم۔ اُن کی آنکھوں میں غرور کا نشہ چھا رہا تھا اور چہرہ پر فاتحانہ مسرت کی نمود تھی۔ صوفیا کو گلے سے لگاتی ہوئی بولیں۔ کیوں روتی ہو بیٹی؟ ونے کے لئے؟ بہادروں کی موت پر آنسو نہیں بہائے جاتے۔ خوشی کا راگ گایا جاتا ہے۔ میرے پاس ہیرے جواہرات ہوتے تو اُس کی لاش پر لُٹا دیتی۔ مجھے اُس کے مرنے کا غم نہیں ہے۔ غم ہوتا اگر وہ آج جان بچا کر بھاگتا۔ وہ تو میری دیرینہ خواہش تھی۔ نہایت دیرینہ۔ جب میں نوجوان تھی اور بہادر راجپوتوں اور راجپوتنیوں کی قربانی کی داستانیں پڑھا کرتی تھی۔ اُسی وقت میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایشور مجھے کوئی ایسا ہی سپوت دیتا جو انہیں جانبازوں کی طرح موت سے کھیلتا ہوا اپنی زندگی کو

ملک و قوم کی خدمت میں قربان کر دیا۔ جو اپنے خاندان کا نام روشن کرتا۔ میری وہ
خواہش پوری ہو گئی۔ تم میں ایک جانثار بیٹے کی ماں ہوں۔ کیوں روتی ہو؟ اس سے
اُس کی روح کو تکلیف ہوگی۔ تم نے تو مذہبی کتابیں پڑھی ہیں۔ انسان کبھی مرتا ہے؟
روح تو غیر فانی ہے۔ اُسے تو ایشور بھی فنا نہیں کر سکتا۔ موت تو صرف نئی زندگی کا
پیش خیمہ ہے۔ ایک بلند تر زندگی کا راستہ۔ ونے پھر دنیا میں آئے گا۔ وہ اور زیادہ
نیک نام ہوگا۔ جس موت پر گھر والے روئیں۔ وہ بھی کوئی موت ہے۔ وہ تو ایڑیاں
رگڑنا ہے۔ شاندار موت وہی ہے جس پر بیگانے روئیں اور یگانے خوشی منائیں۔ شاندار
موت شاندار زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ شاندار زندگی میں بدنام ہو کر مرنے کا اندیشہ
رہتا ہے۔ شاندار موت میں یہ اندیشہ کہاں؟ کوئی زندگی شاندار نہیں ہے جب تک
کہ اُس کا انجام بھی ویسا ہی نہ ہو۔ یہ تو جو پہنچ گئے۔ کتنے زور کی بارش ہے۔ کیسا
گھُپ اندھیرا ہے۔ پھر بھی ہزاروں آدمی اُس کی لاش پر آنسو بہا رہے ہیں۔
کیا یہ رونے کا مقام ہے؟

موٹر رکا۔ صوفیا اور جاہنوی کو دیکھ کر لوگ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ اندو دوڑ کر ونے سے
لپٹ گئی۔ ہزاروں آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ رانی نے ونے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔
اُسے سینہ سے لگایا۔ اُس کا بوسہ لیا اور ماتمی مجمع کی طرف فخر آمیز نگاہوں سے دیکھ کر
بولی۔ یہ نوجوان جس نے ونے پر اپنی جان نچھاور کر دی۔ ونے سے بڑھ کر ہے۔ کیا کہا؟
مسلمان ہے؟ فرض کے دائرے میں ہندو مسلمان کا فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی کشتی پر
سوار ہیں۔ ڈوبیں گے تو دونوں۔ بچیں گے تو دونوں۔ میں اس بہادر شخص کا یہیں مزار
بنواؤں گی۔ شہید کے مزار کو کون کھود کر پھینک دے گا؟ کون اتنا سنگدل اور کمینہ
ہوگا؟ یہ سچا شہید تھا۔ تم لوگ کیوں روتے ہو؟ ونے کے لئے۔ تم لوگوں میں کتنے
ہی نوجوان ہیں۔ کتنے ہی بال بچوں والے ہیں۔ نوجوانوں سے میں کہوں گی۔ جاؤ اور
ونے کی طرح قربان ہونا سیکھو۔ دنیا صرف پیٹ پالنے کی جگہ نہیں ہے۔ ملک کی
آنکھیں تمہاری ہی طرف لگی ہوئی ہیں۔ تمہیں اس کا بیڑا پار لگاؤ گے۔ گرہستی کے

جال میں نہ پھنسو۔ جب تک ملک کا کچھ کام نہ کر لو۔ دیکھو وہ نے کیا ہنس رہا ہے۔ جب بچہ تھا اُس وقت کی یاد آتی ہے۔ اسی طرح ہنستا تھا۔ کبھی اُسے روتے نہیں دیکھا! کتنی عجیب ہنسی ہے۔ کیا اُس نے دولت کے لئے جان دی؟ دولت اس کے گھر میں بھری ہوئی تھی۔ اُس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ برسوں ہو گئے پلنگ پر نہیں سویا۔ جوتے نہیں پہنے۔ پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا۔ ذرا دیکھو اُس کے پیروں میں کیسے گھٹے پڑ گئے ہیں۔ وہ سادھو تھا۔ تم لوگ بھی ایسے ہی سادھو بن جاؤ" ہاں بچے والوں سے میری التجا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کو چکی کا بیل نہ بناؤ۔ خانہ داری کا غلام نہ بناؤ۔ ایسی تعلیم دو کہ زندہ رہیں۔ زندگی کے غلام بن کر نہیں بلکہ زندگی کے مالک بن کر۔ یہی تعلیم ہے جو اس سرفروش نے تمہیں دی ہے۔ جانتے ہو۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ یہی پیاری لڑکی میری بہو بننے والی تھی۔ کسی نے ایسا دلکش حسن۔ ایسا روحانی جلوہ دیکھا ہے؟ رانیاں اُس کے آگے پانی بھریں۔ علم میں اُس کے سامنے کوئی پنڈت منہ نہیں کھول سکتا۔ زبان پر سرسوتی ہے۔ گھر کا اجالا ہے۔ دے کو اس سے کتنی محبت تھی۔ یہ اسی سے پوچھو۔ لیکن کیا ہوا؟ جب موقع آیا تو اُس نے محبت کے رشتہ کو کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا۔ اُسے اپنی توہین کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اُس پر اپنے مقصد کو قربان نہیں کیا۔ پیارو۔ پیٹ پر اپنی جوانی کو اپنی روح کو اپنی اُمنگوں کو نہ قربان کرو۔ اندو بیٹی کیوں روتی ہو؟ کس کو ایسا بھائی ملا ہے؟

اندو کے دل میں بڑی دیر سے آگ سی جل رہی تھی۔ وہ ان سارے دُکھوں کا اصلی سبب اپنے شوہر کو سمجھتی تھی۔ اب تک آگ دل میں تھی۔ اب باہر نکل پڑی۔ یہ خیال نہ رہا کہ میں اتنے آدمیوں کے سامنے کیا کہتی ہوں۔ جواز کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بولی۔ ماتا جی۔ اس خون کا الزام میرے سر ہے۔ میں اب اُس شخص کا منہ نہ دیکھوں گی جس نے میرے دلاور بھائی کی جان لے کر چھوڑی اور یہ صرف اپنی خود غرضی کو پورا کرنے کے لئے۔

رانی جانھوی نے تیز لہجہ میں کہا۔ کیا جیندر کو کہتی ہے؟ اگر پھر میرے سامنے

منہ سے ایسی بات نکالی تو تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔ کیا تو انہیں اپنا غلام بنا کر رکھے گی؟
تو عورت ہو کر چاہتی ہے کہ کوئی تیرا ہاتھ نہ پکڑے تو وہ مرد ہو کر کیوں نہ لیا چاہیں؟ وہ
دُنیا کو کیوں تیری ہی آنکھوں سے دیکھیں؟ کیا بھگوان نے انہیں آنکھیں نہیں دی ہیں؟ اپنے
نفع و نقصان کا حساب دار تجھے کیوں بنائیں؟ کیا بھگوان نے انہیں عقل نہیں دی؟ تیری
سمجھ میں اور میری سمجھ میں اور یہاں جو لوگ ہیں اُن کی سمجھ میں وہی راستہ اچھا ہے۔
جس پر ہم چل رہے ہیں۔ مگر اُن کی سمجھ میں وہ راستہ خطرناک ہے۔ وہ بدعتوں سے بھرا
ہُوا ہے۔ اس کا بُرا ماننا کیا؟ اگر تجھے اُن کی باتیں پسند نہیں آتیں تو کوشش کر کر پسند
آئیں۔ وہ تیرے سوامی ہیں۔ تیرے لئے ان کی خدمت سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔

دس بج گئے تھے۔ لوگ کنور بھرت سنگھ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب دس کے
گھنٹہ کی آواز کانوں میں آئی تو رانی جاہنوی نے کہا۔ اُن کی راہ اب نہ دیکھو۔ وہ
نہ آئیں گے اور نہ آ سکتے ہیں۔ وہ اُن باپوں میں ہیں جو بیٹے کے لئے جیتے ہیں اور بیٹے
کے لئے مرتے ہیں۔ اور بیٹے کے بیٹوں کے لئے منصوبے باندھتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں
اندھیرا چھا گیا ہوگا۔ تمام دنیا سُونی معلوم ہوتی ہوگی۔ بیہوش پڑے ہوں گے۔ ممکن ہے۔
مر بھی گئے ہوں۔ اُن کا مذہب اُن کا فرض اُن کی زندگی۔ اُن کی موت اُن کا دین۔
اُن کی دُنیا سبھی کا انحصار اسی اکلوتے بیٹے پر تھا۔ اب وہ بے سہارا ہیں۔ اُن کی زندگی
کا کوئی مقصد کوئی معیار نہیں۔ وہ اب ہرگز نہ آئیں گے۔ آ ہی نہیں سکتے۔ چلو۔ وِنے
کے ساتھ اپنا آخری فرض پورا کر لوں۔ انہیں ہاتھوں سے اُسے ہنڈولے میں جھلایا
تھا۔ انہیں ہاتھوں سے اُسے چتا پر رکھ دوں۔ انہیں ہاتھوں سے اُسے کھانا
کھلاتی تھی۔ انہیں ہاتھوں سے اُسے گنگا جل پلا دوں۔

(۴۴)

گنگا سے لوٹتے لوٹتے دن کے نو بج گئے۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم۔ گلیاں
تنگ اور کیچڑ سے بھری ہوئیں۔ قدم قدم پر پھولوں کی بارش۔ والنٹیروں کے

تو ہی گانے۔ گنگا تک پہنچتے پہنچتے ہی سویرا ہو گیا تھا۔ لوٹتے ہوئے جانہوی نے کہا۔ چلو ذرا سُورداس کو دیکھتے چلیں۔ نہ جانے مرا کہ بچا۔ سُنتی ہوں۔ زخم کاری تھا۔

صوفیا اور جانہوی دونوں شفاخانہ گئیں تو دیکھا کہ سُورداس برآمدہ میں چارپائی پر لیٹا ہُوا ہے۔ بھیرو اُس کے پائنتے کھڑا ہے۔ اور سُبھاگی سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔ جانہوی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ اس کی حالت کیسی ہے؟ بچنے کی کوئی اُمید ہے

ڈاکٹر نے کہا۔ کسی دوسرے آدمی کو ایسا زخم لگا ہوتا تو اب تک مر چکا ہوتا۔ اُس کی قوتِ برداشت حیرت انگیز ہے۔ دوسروں کو نشتر لگاتے وقت کلوروفارم دینا پڑتا ہے۔ اس کے کندھے میں دو انچ گہرا اور دو انچ چوڑا نشتر دیا گیا پر اس نے کلوروفارم نہ لیا۔ گولی نکل آئی ہے۔ مگر بچ جائے تو کہیں۔

صوفیا کو رات بھر کی سخت روحانی تکلیف نے اتنا گُھلا دیا تھا کہ اُسے پہچاننا مشکل تھا۔ گویا کوئی پھول مُرجھا گیا ہو۔ چال سُست چہرہ اُترا ہُوا۔ آنکھیں کچھی پھٹی۔ گویا مادی دنیا میں نہیں بلکہ خیالی دنیا میں حرکت کر رہی ہے۔ آنکھوں کو جتنا رونا تھا رو چکی تھیں۔ اب اُس کا بال بال رو رہا تھا۔ اس نے سُورداس کے پاس جا کر کہا۔ سُورداس۔ کیسا جی ہے؟ رانی جانہوی آئی ہیں۔

سُورداس۔ دھنیہ بھاگ۔ اچھا ہوں۔

جانہوی۔ درد بہت ہو رہا ہے؟ بہت تکلیف ہے؟

سُورداس۔ کچھ تکلیف نہیں ہے۔ کھیلتے کھیلتے گر پڑا ہوں۔ چوٹ آ گئی ہے۔ اچھا ہو جاؤں گا۔ اُدھر کیا ہُوا؟ جھونپڑی بچ گئی؟

صوفیا۔ ابھی تو نہیں گئی ہے۔ پر شاید اب نہ بچے۔ ہم لوگ تو رونے کو گنگا کی گود میں سونپے چلے آتے ہیں۔

سُورداس نے کمزور آواز میں کہا۔ بھگوان کی مرضی۔ بیروں کا بھی دھرم ہے۔ جو غریبوں کے لئے جان دیتا ہے وہی سچا بیر ہے۔

جاؤں گی۔ تم سدا سہو۔ ایشور سے دعا کرو کہ ونے کا پھر سے ہی جنم ہو۔

شُوُرداس۔ ایسا ہی ہو گا ماتا جی ایسا ہی ہو گا۔ اب مہان پُرس اچھے لوگ، ہمارے ہی دیش میں جنم لیں گے۔ یہاں انیائے اور ادھرم ہوتا ہے۔ وہیں دیوتا لوگ جاتے ہیں۔ اُن کے سنسکار انہیں کھینچ لے جاتے ہیں۔ میرا من کہہ رہا ہے کہ کوئی مہاتما تھوڑے ہی دنوں میں اس دیش میں جنم لینے والے ہیں۔

ڈاکٹر نے آ کر کہا۔ رانی جی میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ شُوُرداس سے باتیں نہ کریں۔ ورنہ زور پڑنے سے اُن کی حالت بگڑ جائے گی۔ ایسی حالت میں سب سے زیادہ خیال اس امر کا ہونا چاہئے کہ مریض کی طاقت زائل نہ ہو۔ اُسے ضعف نہ آنے پائے۔

شفا خانہ کے مریضوں کو جب یہ پتہ لگا کہ ونے سنگھ کی ماں آئی ہوئی ہیں تو سب ان کی زیارت کو جمع ہو گئے۔ کتنوں ہی نے اُن کے قدموں کی خاک ماتھے پر چڑھائی۔ یہ دیکھ کر رانی کا دل غم سے پھول گیا۔ ہنستے ہوئے سبھوں کو دعائیں دے کر یہاں سے جانے لگیں تو صوفیا نے کہا۔ ماتا جی۔ آپ کی اجازت ہو تو میں یہیں رہ جاؤں۔ سورداس کی حالت خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی باتوں میں وہ مجذوبیت ہے جو موت کی خبر دے رہی ہے۔ میں نے اسے ہوش میں ایسی باتیں کرتے کبھی نہیں سُنا۔

رانی نے صوفیا کو گلے لگا کر بخوشی اجازت دی۔ دراصل صوفیا سیوا بھون (ونے کا مکان) نہ جانا چاہتی تھی۔ وہاں کی ایک ایک چیز وہاں کے پھول پتے حتے کہ وہاں کی ہوا بھی ونے کی یاد دلائے گی۔ جس گھر میں ونے کے ساتھ رہی اس میں ونے کے بغیر رہنے کا خیال ہی اُسے تڑپائے دیتا تھا۔

رانی کے چلے جانے پر صوفیا ایک مونڈھا لے کر شُوُرداس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔ شُوُرداس کی آنکھیں بند تھیں مگر چہرہ پر ایک دلآویز سکون چھایا ہوا تھا۔ صوفیا کو آج معلوم ہوا کہ دل کا سکون ہی اصلی حسن ہے۔

صوفیا کو وہاں بیٹھے بیٹھے سارا دن گذر گیا۔ وہ بے آب و دانہ اُداس بیٹھی ہوئی گوری ہوتی خوشی کی باتوں کا خواب دیکھ رہی تھی اور جب آنکھیں بھر جاتی تھیں تو آڑ میں جا کر رومال سے آنسو پونچھ آتی تھی۔ اُسے اب سب سے زیادہ رنج اس بات کا تھا۔ کہ میں نے ونے کی کوئی آرزو نہ پوری کی۔ انہیں ہمیشہ محروم ہی رکھا۔ اُن کی محبت کی یاد اس کے دل کو ایسا مسوس رہی تھی کہ وہ بہت ہی مضطرب و بیقرار تھی۔

شام ہو گئی تھی۔ صوفیا لیمپ کے سامنے بیٹھی ہوئی شُورداس کو خداوند یسوع کے سوانحی حالات سُنا رہی تھی۔ شُورداس ایسا محو ہو رہا تھا گویا اُسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ دفعتاً راجہ مہیندر کمار آکر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے صوفیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صوفیا چیرن کی تیوں بیٹھی رہی۔ اُس نے راجہ صاحب سے ہاتھ نہ ملایا۔

شُورداس۔ کون ہے۔ مِس صاحب؟

صوفیا۔ راجہ مہیندر کمار ہیں۔

شُورداس نے تعظیماً اُٹھنا چاہا مگر صوفیا نے لِٹا دیا اور کہا ہلو مت ورنہ زخم کُھل جائے گا۔ آرام سے پڑے رہو۔

شُورداس۔ راجہ صاحب آئے ہیں۔ اُن کا اِتنا آدر بھی نہ کروں؟ میرے ایسے بھاگ تو ہوئے۔ کچھ بیٹھنے کو ہے؟

صوفیا۔ ہاں کرسی پر بیٹھ گئے ہیں۔

راجہ صاحب نے پوچھا۔ شُورداس۔ کیسا جی ہے؟

شُورداس۔ بھگوان کی دیا ہے۔

راجہ صاحب جن باتوں کو ظاہر کرنے یہاں آئے تھے انہیں صوفیا کے سامنے زبان پہ لاتے ہوئے شرماتے تھے۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر بولے۔ شُورداس۔ میں تم سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے آیا ہوں۔ اگر میرے بس کی بات ہوتی تو آج اپنی زندگی کو تمہاری زندگی سے بدل لیتا۔

شُورداس۔ سرکار ایسی بات نہ کہئے۔ آپ راجا ہیں۔ میں بھکاری ہوں۔

آپ نے جو کچھ کیا دوسروں کی بھلائی کے بچار سے کیا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنا دھرم
سمجھ کر کیا۔ میرے کارن آپ تو اپجس ملا۔ کتنے گھر ناس ہوئے یہاں تک کہ
اندر دت اور کنور ونے سنگھ جیسے دو انمول رتن ہاتھ سے کھو گئے۔ پر اپنا کیا بس
ہے۔ ہم تو کھیل کھیلتے ہیں۔ جیت ہار بھگوان کے ہاتھ ہے۔ وہ جیسا ٹھیک سمجھتے
ہیں کرتے ہیں۔ بس اپنی نیت ٹھیک ہونی چاہئے۔

راجہ۔ سور داس۔ نیت کو کون دیکھتا ہے۔ میں نے ہمیشہ لوگوں کی بھلائی پر ہی
نگاہ رکھی پر آج تمام شہر میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو مجھے کمینہ۔ خودغرض۔ بے
ایمان اور گناہگار نہ سمجھتا ہو۔ اور تو کیا۔ میری بیوی بھی مجھ سے نفرت کر رہی ہے۔
ایسی باتوں سے دل کیوں نہ اداس ہو جائے؟ کیوں نہ دنیا سے نفرت ہو جائے؟
میں تو اب کہیں منہ دکھلانے لائق نہیں رہا۔

سور داس۔ اس کی چنتا (فکر) نہ کیجئے۔ فائدہ۔ نکسان۔ جینا مرنا۔
نیکنامی۔ بدنامی سب تکدیر کے ہاتھ ہے۔ ہم تو کھالی میدان میں کھیلنے کے لئے
بنائے گئے ہیں۔ سبھی کھلاڑی من لگا کر کھیلتے ہیں
سبھی چاہتے ہیں کہ ہماری جیت ہو۔ پر جیت تو ایک ہی کی ہوتی ہے۔ تو کیا
(س) سے ہارنے والے ہمت ہار جاتے ہیں؟ وہ پھر کھیلتے ہیں۔ پھر ہار جاتے
ہیں تو پھر کھیلتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی تو ان کی جیت ہوتی ہی ہے۔ جو آج آپ کو
برا سمجھ رہے ہیں وہی کل آپ کے سامنے سر جھکائیں گے۔ ہاں نیت ٹھیک
رہنی چاہئے۔ مجھے کیا ان کے گھر والے برا نہ کہتے ہوں گے جو میرے کارن جان
سے گئے؟ اندر دت اور کنور ونے سنگھ جیسے دو لعل جن کے ہاتھوں سنسار کا
کتنا اپکار (بھلائی) ہوتا سنسار سے اٹھ گئے۔ جس اپجس (نیکنامی بدنامی)
بھگوان کے ہاتھ ہے۔ ہمارا یہاں کیا بس ہے؟

راجہ۔ آہ۔ سور داس۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں کتنی مصیبت میں گرفتار
ہوں۔ تمہیں برا کہنے والے اگر دس پانچ ہوں گے تو تمہارا جس گانے والے بہت

ہیں۔ یہاں تک کہ حکام بھی تمہارے صبر، تمہاری مضبوطی کی تعریف کر رہے ہیں۔ میں تو دونوں طرف سے گیا۔ رعایا اور سرکار دونوں سے باغی ہوا۔ حکام اس ساری گڑبڑ کا الزام میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ اُن کی سمجھ میں بھی میں نالائق۔ کوتاہ اندیش اور خود غرض ہوں۔ اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔

سُورداس نہیں نہیں۔ راجہ صاحب۔ نراس ہونا کھلاڑیوں کا دھرم نہیں ہے۔ اب کے ہار ہوئی تو پھر کبھی جیت ہوگی۔

راجہ۔ مجھے تو یقین نہیں ہوتا کہ پھر کبھی میری عزت ہوگی۔ مس سیلوک۔ آپ میری کمزوری پر ہنس رہی ہوں گی۔ پر میں بہت ہی دُکھی ہوں۔

صوفیا نے بے اعتباری کے لہجہ میں کہا۔ عوام کے مزاج میں عفو کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اگر اب بھی آپ عوام کو یہ دکھا سکیں کہ اس حادثہ پر آپ کو دلی افسوس ہے تو شاید وہ آپ کی پھر عزت کرنے لگیں۔

راجہ نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ سُورداس بول اٹھا۔ سرکار نیکنامی اور بدنامی بہت سے لوگوں کے گل مچانے سے نہیں ہوتی۔ سچی نیکنامی اپنے مَن میں ہوتی ہے۔ اگر اپنا مَن بولے کہ میں نے جو کچھ کیا وہی مجھے کرنا چاہئے تھا۔ اس کے سوا کچھ اور کرنا مجھے اُچت و مناسب، نہ تھا تو وہی نیکنامی ہے۔ اگر آپ کو اس مار کاٹ پر دُکھ ہے تو آپ کا دھرم ہے کہ لاٹ صاحب سے اس کی لکھا پڑھی کریں۔ وہ نہ سُنیں تو جو اُن سے بڑا حاکم ہو اُس سے کہیں اور جب تک سرکار پرجا کے ساتھ نیائے نہ کرے دم نہ لیں۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے کیا وہی آپ کا دھرم تھا۔ اپنے سوارتھ کے لئے آپ نے کوئی بات نہیں کی۔ تو آپ کو تنک بھی دُکھ نہ کرنا چاہئے۔

صوفیا نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ سرکار کے طرفداروں کے لئے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اُن میں خود غرضی کا شائبہ نہیں ہے۔

راجہ۔ مسٹر سیوک۔ میں آپ کو صدقِ دل سے یقین دلاتا ہوں کہ میں نے حکام کے ہاتھوں عزت و وقار پانے کے لئے اُن کی طرفداری نہیں کی اور عہدہ کا لالچ تو مجھے کبھی نہیں رہا۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سی بات تھی جس نے مجھے سرکار کی طرف کھینچا۔ ممکن ہے نقصان کا خوف ہو یا صرف خوشامد۔ پر میری کوئی غرض نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ میں نے اُس جماعت کی نکتہ چینیوں اُس کے پوشیدہ حملوں یا اُس کی طعنہ زنیوں سے ڈر کر ایسا کیا ہو۔ میں خود ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال تھا کہ سرکار سے موافقت رکھ کر رعایا کی جتنی بھلائی کر سکتا ہوں، اُتنی سرکار سے مخالفت رکھ کر نہیں کر سکتا۔ مگر آج معلوم ہُوا کہ وہاں بھلائی ہونے کی جتنی اُمید ہے اُس سے کہیں زیادہ خوف بُرائی ہونے کا ہے۔ عزت و نیکنامی کا راستہ وہی ہے جسے سُور داس نے اختیار کیا۔ سُور داس دُعا کرو کہ ایشور مجھے ٹھیک راستہ پر چلنے کی سنگت دیں۔

آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ سُور داس نیند میں غافل تھا۔ اتنی باتیں کرنے سے وہ تھک گیا تھا۔ سبھاگی ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لیئے ہوئے آئی اور سُور داس کے پائتے بچھا کر پڑ رہی۔ شفاخانہ کے ملازمین چلے گئے۔ چاروں طرف سنّاٹا چھا گیا۔

صوفیا گاڑی کا انتظار کر رہی تھی — دس بجے ہوں گے۔ رانی جی شاید گاڑی بھیجنا بھول گئیں۔ انہوں نے شام ہی کو گاڑی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیسے جاؤں؟ کیا ہرج ہے۔ یہیں بیٹھی رہوں؟ وہاں رونے کے سوا اور کیا کروں گی! آہ میں نے ونے کو تباہ کر دیا۔ میرے ہی سبب سے وہ دوبار فرض کے راستہ سے منحرف ہوئے۔ میرے ہی سبب سے بالآخر آج اُن کی جان پر بنی! اب اُس موہنی مورت کو دیکھنے کو ترس جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ ہم پھر ملیں گے۔ پر نہیں جانتی کہ کب؟

اُسے وہ دن یاد آ گئے۔ جب بھیلوں کے گاؤں میں اس وقت وہ دروازہ پر بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کیا کرتی تھی اور وہ کمبل اُوڑھے ننگے سر ننگے پیر

ہاتھ میں ایک لکڑی لئے آتے تھے۔ اور مسکرا کر پوچھتے تھے کہ مجھے دیر تو نہیں ہو گئی؟ وہ دن یاد آیا جب راہی تانہ جاتے وقت ونے نے اُس کی طرف بیقرار و مایوس نگاہوں سے دیکھا تھا۔ آہ وہ دن یاد آیا جب اُس کی طرف دیکھنے پر رانی جی نے انہیں تیز نگاہوں سے دیکھا تھا اور وہ سر جھکائے باہر چلے گئے تھے۔ صوفیا رنج سے بے چین ہو گئی جیسے ہوا کے جھونکے زمین پر پڑی ہوئی گرد کو اوپر اٹھا دیتے ہیں۔ اُسی طرح اس خاموش رات نے اُس کی یاد کو تازہ کر دیا۔ اس کا دل ہی سراپا یاد بن گیا۔ وہ بیقرار ہو کر کرسی سے اٹھی اور ٹہلنے لگی۔ من جی نہ جانے کیا چاہتا تھا۔ کہیں اُڑ جاؤں۔ مر جاؤں۔ کمبخت دل کو کہاں تک سمجھاؤں؟ کہاں تک صبر کروں؟ اب نہ سمجھاؤں گی۔ روؤں گی۔ تڑپوں گی۔ خوب جی بھر کر! وہ مجھ پر جان نچھاور کرتا تھا۔ دنیا سے اُٹھ جائے اور میں اپنے کو سمجھاؤں کہ اب رونے سے کیا ہو گا! میں روؤں گی۔ اتنا روؤں گی کہ آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ دل خون ہو کر آنکھوں کے راستہ نکلے گا اور گلا بیٹھ جائے گا۔ آنکھوں کو اب کرنا ہی کیا ہے؟ وہ اب کسے دیکھ کر خوش ہوں گی۔ دل بھی اب متحرک ہو کر کیا کرے گا۔

اتنے میں کسی کی آہٹ سُنائی دی۔ مٹھوا اور بھیرو برآمدہ میں آئے۔ مٹھوا نے صوفیا کو سلام کیا اور سور داس کی چارپائی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سور داس نے چونک کر پوچھا۔ کون ہے بھیرو؟

مٹھوا۔ دادا میں ہوں۔

سور داس۔ بہت اچھے آئے بیٹا تم سے بھینٹ ہو گئی۔ اتنی دیر کیوں ہوئی؟

مٹھوا۔ کیا کروں دادا؟ تمہارے بابو سے سانجھ سے چھٹی مانگ رہا تھا۔ مگر ایک نہ ایک کام لگا دیتے تھے۔ ڈاؤن نمبر تھری کو نکالا۔ اب نمبر ون کو نکالا۔ پھر پارسل گاڑی آئی تو اس پر مال لدوایا۔ ڈاؤن نمبر ففٹی کو نکال کر تب آیا پایا ہوں اس سے تو کل تھا تبھی اچھا تھا کہ جب جی چاہتا تھا جاتا تھا۔ کوئی روکنے والا نہ تھا۔ نہیں تو اب نہانے کھانے کی چھٹی نہیں ملتی۔ بابو لوگ ادھر اُدھر دوڑتے

رہتے ہیں کسی کو زکر رکھنے کی سمائی تو ہے نہیں۔ بسیت بسیت ہی کام نکلتے ہیں۔
سُورداس۔ مَیں نے بلایا تو تم اب بھی نہ آتے۔ سانتا بھی نہیں سوچتے کہ اندھا آدمی ہے نہ جانے کیسے ہوگا۔ چل کر ذرا حال چال پوچھتا آؤں۔ تم کو اس لئے بلایا ہے کہ مر جاؤں تو میرا کریا کرم کرنا۔ اپنے ہاتھوں سے پنڈا دینا۔ برادری کو بھوج دینا اور ہو سکے تو گیا کر آنا۔ بولو۔ اتنا کرو گے؟
بھیرو۔ بھیا تم اس کی چنتا نہ کرو۔ تمہارا کریا کرم اتنی دھوم سے ہوگا کہ برادری میں کبھی کسی کا نہ ہوگا۔
سُورداس۔ دھوم دھام سے نام تو ہوگا پر مجھے پہنچے گا۔ تو وہی جو مِٹھوا دے گا۔
مِٹھوا۔ دادا۔ میری تنگا جھوری لے لو۔ جو میرے پاس دھیلا بھی ہو کھاتے بھر کو تو ہوتا ہی نہیں۔ بچے گا کیا؟
سُورداس۔ ارے تو کیا تم میرا کریا کرم بھی نہ کرو گے؟
مِٹھوا۔ کیسے کروں گا۔ دادا؟ کچھ پلّے پاس ہو تب نا۔
سُورداس۔ تو تم نے یہ آسا بھی توڑ دی۔ میرے بھاگ میں تمہاری کمائی نہ جیتے جی بدی تھی نہ مرنے کے پیچھے۔
مِٹھوا۔ دادا۔ اب منہ نہ کھلواؤ۔ پردہ ڈھکا رہنے دو۔ مجھے پوپٹ کر کے مرے جاتے ہو۔ اس پر کہتے ہو۔ میرا کریا کرم کر دینا۔ گیا پر اگ کر دینا۔ ہماری دس بیگھے موروثی جمین تھی کہ نہیں؟ اس کا ما دجہ دو پیسے چار پیسے کچھ تم کو ملا کہ نہیں؟ اس میں سے میرے ہاتھ کیا لگا؟ گھر نہیں بھی میرا کچھ حصّہ ہوتا ہے یا نہیں۔ حاکموں سے بَیر نہ ٹھانتے تو اس گھر کے ستو سے کم نہ ملتے۔ پنڈا جی نے کیسے پانچ ہزار پا لئے؟ ہے اُن کا گھر پانچ ہزار کا؟ دردا ہے پر میرے ہاتھوں کے لگائے دو نیم کے پیڑ تھے۔ کیا وہ پانچ پانچ روپے میں بھی مہنگے تھے؟ مجھے تو تم نے ملیا میٹ کر دیا۔ کہیں کا نہ رکھا۔ دنیا بھر کے لئے اچھے ہو گئے۔ میری گردن پر

تو تم نے چھری پھیر دی۔ مجھے تو حلال کر ڈالا۔ مجھے بھی تو ابھی بیاہ سگائی کرنی ہے۔ گھر دوار بنوانا ہے۔ کرپا کرم کرنے بیٹھوں تو اُس کے لیئے کہاں سے روپے لاؤں؟ کماتی میں تمہارے سک نہیں۔ مگر کچھ اڑا یا۔ کچھ جلایا۔ اب مجھے بنا چھا ہنہ کے چھوڑ سے چلے جاتے ہو۔ بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہیں۔ اب تک میں چپ تھا۔ نابالک تھا۔ اب تو میرے بھی ہاتھ پاؤں ہوئے۔ دیکھتا ہوں۔ کہ میری زمین کا مادھو کیسے نہیں بیچتا! صاحب لکھ بیٹی ہوں گے تو اپنے گھر کے ہونگے۔ میرا حصہ کیسے دبالیں گے؟ گھر میں بھی میرا حصہ ہوتا ہے (جھانک کر مس صاحب پھاٹک پر کھڑی ہیں۔ گھر کیوں نہیں جاتیں؟ اور سُن ہی لیں گی تو مجھے کیا ڈر؟ صاحب نے سدھے سے دیا تو دیا نہیں تو پھر میرے من میں بھی جو آئے گا وہ کروں گا۔ ایک سے دو جان تو ہوں گی نہیں مگر ہاں انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ کسی کا حق چھین لینا دل لگی نہیں ہے۔

سُور داس بھونچکا سا رہ گیا۔ اُسے خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ مٹھوا کے منہ سے مجھے ایسی سخت باتیں سُننی پڑیں گی۔ اُسے بے انتہا رنج ہوا خصوصاً اس لئے کہ یہ باتیں اُس وقت کہی گئیں جب وہ سکون اور ہمدردی کا خواستگار اور مستحق تھا۔ جب اُسے خواہش تھی کہ میرے عزیز و اقارب میرے پاس بیٹھے ہوئے میری تکالیف کے دفعیہ کی تدبیریں کرتے ہوتے۔ یہی وقت ہے جب انسان کو اپنی بڑائی سُننے کی خواہش ہوتی ہے۔ جب اُس کا کمزور دل بچوں کی طرح گود میں بیٹھنے کے لئے پیار کے لئے خاطرداری کے لئے خدمت کے لئے بے چین ہوتا ہے۔ جسے اُس نے بچپن سے بیٹے کی طرح پالا۔ جس کے لئے اُس نے نہ جانے کیا کیا تکلیفیں سہیں۔ وہ آخر وقت آکر اس سے اپنا حصہ کا دعوے کر رہا تھا۔ اسے اپنا حق جتا رہا تھا سُور داس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بولا۔ بیٹا۔ میری بھول تھی کہ تم سے کرپا کرم کرنے کو کہا تم کچھ مت کرنا۔ چاہے میں پنڈا اور جل کے بنا رہ جاؤں پر یہ اُس سے

کہیں اچھا ہے کہ تم صاحب سے اپنا ما وجہ مانگو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اپنا کانون
جان گئے ہو۔ نہیں تو پیسہ پیسہ کا حساب لکھتا جاتا۔

مٹھوا۔ میں اپنے ماوجے کا دعوئے جرور کروں گا۔ چاہے صاحب دیں۔
چاہے سرکار دے۔ چاہے کالا چور دے۔ مجھے تو اپنے روپے سے کام ہے۔

سُورداس۔ ہاں سرکار ہی دے دے پر صاحب سے کوئی مطلب نہیں۔

مٹھوا۔ میں تو صاحب سے لوں گا۔ وہ چاہے جس سے دلائیں۔ نہ دلائیں گے
تو جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا وہ کروں گا۔ صاحب کچھ لاٹ تو ہیں نہیں۔ میری جائیداد
اُنہیں ہجم نہ ہونے پائے گی۔ تم کو اُس کا کیا کلک تھا۔ سوچا ہو گا کہ کون میرے بیٹی بیٹا
بیٹھا ہوا ہے۔ چپکے سے بیٹھ رہے۔ میں چُپکا بیٹھنے والا نہیں ہوں۔

سُورداس۔ مٹھوا کیوں میرا دل دُکھاتے ہو؟ اس جمین کے لئے میں نے
کون سی بات اُٹھا رکھی؟ گھر کے لئے تو جان دے دی! اب اور میرے کئے کیا ہو سکتا
تھا؟ لیکن بھلا بتاؤ تو کہ تم صاحب سے کیسے روپے لے لوگے؟ عدالت میں
تو تم اُن سے لے نہیں سکتے۔ وہ روپے والے ہیں اور عدالت روپے والوں کی
ہے۔ ہاریں گے بھی تو تمہیں بگاڑ دیں گے۔ پھر تمہاری جمین سرکار نے جا پہلے
سے لی ہے۔ تمہارا دعوئے صاحب پر چلے گا کیسے؟

مٹھوا۔ یہ سب بیٹھے بیٹھا ہوں۔ لگا دوں آگ۔ سارا گودام جل کر راکھ
ہو جائے گا (آہستہ سے) بم گولہ بنانا جانتا ہوں۔ ایک گولہ رکھ دوں گا تو
پتلی گھر سواہا ہو جائے گا۔ میرا کوئی کیا کرے گا؟

سُورداس۔ بھیرو سُنتے ہو اس کی باتیں۔ جرا تمہیں سمجھاؤ۔

بھیرو۔ میں تو راستہ بھر سمجھاتا آرہا ہوں۔ سُنتا ہی نہیں۔

سُورداس۔ تو پھر میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ اس سے ہوشیار رہیں۔

مٹھوا۔ تم کو گئو مارنے کی ہتیا لگے جو تم صاحب یا کسی اور سے اس بات
کی چرچا تک کرو۔ اگر میں پکڑا گیا تو تمہیں کو اُس کا پاپ لگے گا۔ جیتے جی میرا بُرا

جیتا اب مرنے پر بھی میرے لئے کانٹے بونا چاہتے ہو۔ تمہارا تو منہ دیکھنا بھی پاپ ہے
یہ کہہ کر متھوا غصّہ سے بھرا ہُوا چلا گیا۔ بھیرو روکتا ہی رہا پر اس نے نہ مانا۔
سُورداس آدھ گھنٹہ تک غشی کی سی حالت میں پڑا رہا۔ یہ صدمہ گولی کے زخم
سے بھی زیادہ مہلک تھا متھوا کی بدمعاشی، اُس کے انجام کا خوف۔ اپنی ذمّہ داری۔
صاحب کو آگاہ کر دینے کا فرض۔ یہ پہاڑ سی قسم۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں چاروں
طرف سے بندھا ہُوا تھا۔ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں پڑا ہُوا تھا کہ مسٹر جان سیوک
آئے۔ صوفیا بھی پھاٹک سے اُن کے ساتھ چلی۔ صوفیا نے دور ہی سے کہا۔
سُورداس۔ پاپا تم سے ملنے آئے ہیں۔ اصل میں تو مسٹر سیوک سُورداس سے
ملنے نہیں آئے تھے بلکہ صوفیا سے ماتم پُرسی کا فرض ادا کرنے آئے تھے۔ دن
بھر فرصت نہ ملی۔ مِل سے نو بجے چلے تو یاد آئی۔ سیوا بھون گئے۔ وہاں معلوم ہُوا
کہ صوفیا ہسپتال میں ہے۔ گاڑی اس طرف پھیر دی۔ صوفیا رانی صاحبہ کی گاڑی
کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ پاپا آتے ہوں گے۔ انہیں دیکھ کر
رونے لگی۔ پاپا مجھے چاہتے ہیں۔ اس کا مجھے ہمیشہ یقین رہا۔ واقعی تھی بھی یہی
بات۔ مسٹر سیوک کو ہمیشہ صوفیا کی یاد آتی رہتی تھی۔ کاروبار میں بیحد مصروف
رہنے پر بھی وہ صوفیا کی طرف سے بالکل بیفکر نہ تھے۔ البتہ اپنی بیوی سے
مجبور تھے۔ جس کا اُن پر قابو تھا۔ صوفیا کو روتے دیکھ کر انہیں ترس آگیا۔ اُسے
گلے سے لگا لیا اور اس کی دلجوئی کرنے لگے۔ انہیں بار بار اس کارخانہ کو کھولنے پر
افسوس ہوتا تھا جو کسی مزمن مرض کی طرح اُن کے گلے پڑ گیا۔ اس کے سبب خاندانی
امن میں خلل واقع نہ ہُوا۔ سارا کنبہ بارہ باٹ ہو گیا۔ تمام شہر میں بدنامی
ہوئی۔ ساری عزّت مٹی میں مِل گئی۔ گھر سے ہزاروں روپے خرچ ہو گئے۔
اور ابھی تک منافع کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اب مستری اور مزدور بھی کام چھوڑ
چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ اُدھر شہر اور صوبہ میں اس کارخانہ کے
خلاف تحریک جاری ہو رہی تھی۔ پربھو سیوک کا ترکِ سکونت چراغ بن کر

اُن کے دل کو جلا رہا تھا۔ نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا۔
مسٹر سیلوک کوئی نصف گھنٹہ تک صوفیا کو اپنی ضعیفیت کی داستان سُناتے
رہے۔ آخر میں بولے۔ صوفیا تمہاری ماما کو یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ مگر مجھے تو
کوئی اعتراض نہ تھا۔ کنور ونے سنگھ جیسا بیٹا یا داماد پاکر ایسا کون ہے جو اپنے
کو خوش نصیب نہیں سمجھتا؟ مذہبی اختلاف کی مجھے ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ مذہب
ہماری حفاظت اور بہتری کے لئے ہے۔ اگر وہ ہماری روح کو سکون اور جسم کو
آرام نہیں دے سکتا تو میں اُسے پُرانے کوٹ کی طرح اُتار کر پھینک دینا ہی پسند
کروں گا۔ جو مذہب ہماری رُوح کی زنجیر ہو جائے اُس سے جتنی جلد ہم اپنی گلو
خلاصی کر لیں اُتنا ہی اچھا۔ مجھے ہمیشہ اُس کا افسوس رہے گا۔ کہ باواسطہ یا
بے واسطہ طریقہ پر میں تمہارا دشمن ہوا۔ اگر مجھے ذرا بھی معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ اتنا
طول کھینچے گا اور اس کا انجام اتنا افسوسناک ہوگا تو میں اُس آبادی پر قبضہ کرنے
کا نام بھی نہ لیتا۔ میں نے سمجھا تھا کہ باشندے کچھ مخالفت ضرور کریں گے۔
لیکن دھمکانے سے ٹھیک ہو جائیں گے یہ نہیں جانتا تھا۔ کہ لڑائی چھڑ جائے گی۔
اور اُس میں میری ہی ہار ہوگی۔ یہ کیا بات ہے صوفیا! کہ آج رانی جاہنوی نے میرے
ساتھ مہذبانہ اور منکسرانہ سلوک کیا؟ میں تو چاہتا تھا کہ باہر ہی سے تمہیں بلالوں۔
لیکن دربان نے رانی صاحبہ سے کہہ دیا اور وہ فوراً باہر نکل آئیں۔ میں پشیمانی و
ندامت سے گڑا جاتا تھا اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ بڑا وسیع دل
ہے۔ پہلی کی سی رعونت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صوفیا ونے سنگھ کی ناوقت وفات
کا کسے رنج نہ ہوگا؟ مگر اُن کی قربانی نے سینکڑوں جانیں بچالیں ورنہ مجمع آگ
میں کُود پڑنے کو تیار تھا۔ بڑا غضب ہو جاتا۔ مسٹر کلارک نے سُورداس پر
گولی تو چلا دی تھی۔ مگر عوام کا رُخ دیکھ کر سہمے جاتے تھے کہ نہ جانے کیا ہو۔
بہادر شخص تھا۔ بڑا ہی دلیر اور جانباز!
اس طرح صوفیا کو تسکین دینے کے بعد مسٹر سیوک نے اُس سے گھر چلنے

کا اصرار کیا۔ صوفیا نے بات ٹال کر کہا ___ پاپا اس وقت مجھے معاف کیجئے۔ سُورداس کی حالت بہت نازک ہے۔ میرے یہاں رہنے سے ڈاکٹر اور دیگر مُلازمین خاص توجہ کرتے ہیں۔ میں نہ ہوں گی تو کوئی اُسے پُوچھے گا بھی نہیں۔ آیئے۔ ذرا دیکھئے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اس حالت میں بھی وہ کتنا باہوش ہے اور کتنی دانشمندانہ گفتگو کرتا ہے! مجھے تو وہ انسانی قالب میں کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔

سیوک۔ میرے جانے سے اُسے رنج نہ ہوگا۔

صوفیا۔ کبھی نہیں پاپا۔ اس کا تو خیال ہی تو دل میں نہ لائیے۔ اُسے کینہ یا کدورت چھو تک نہیں گئی۔

دونوں سُورداس کے پاس گئے تو وہ پریشانیوں کی تکلیف سے بیقرار ہو رہا تھا۔ مسٹر سیوک بولے۔ سُورداس کیسی طبیعت ہے؟

سُورداس۔ صاحب سلام۔ بہت اچھا ہوں۔ میرے دھنیہ بھاگ ہیں مرتے مرتے بڑا آدمی ہو جاؤں گا۔

سیوک۔ نہیں نہیں۔ سُورداس۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

سُورداس (ہنس کر) اب جی کر کیا کروں گا؟ اس سمے (وقت) مروں گا تو بیکنٹھ پاؤں گا۔ پھر نہ جانے کیا ہو؟ جیسے کھیت کٹنے کا ایک بکھت ہے۔ ویسے ہی مرنے کا بھی ایک بکھت ہوتا ہے۔ پک جانے پر کھیت نہ کٹے تو اناج سڑ جائے گا۔ میری بھی وہی دسا ہوگی۔ میں کئی آدمیوں کو جانتا ہوں جو آج سے دس برس پہلے مرتے تو لوگ اُن کا جس گاتے۔ آج اُن کی بُرائی ہو رہی ہے۔

سیوک۔ میرے ہاتھوں تمہیں بہت نقصان پہنچا۔ اس کے لئے مجھے معاف کرنا۔

سُورداس۔ میرا تو آپ نے کوئی نکسان نہیں کیا۔ مجھ سے اور آپ سے

دشمنی ہی کون سی تھی؟ ہم اور آپ آمنے سامنے کی پالیوں میں کھیلے۔ آپ نے بھرسک جدر لگایا۔ میں نے بھی بھرسک جور لگایا۔ جس کو جیتنا تھا جیتا۔ جس کو ہارنا تھا ہارا۔ کھلاڑیوں میں بیر نہیں ہوتا۔ کھیل میں روتے تو لڑکوں کو بھی لاج آتی ہے۔ کھیل میں چوٹ لگ جائے چاہے جان نکل جائے۔ پر بَیر نہ ہونا چاہیئے مجھے آپ سے کوئی شکائیت نہیں ہے۔

سیوک۔ سُورداس۔ اگر اس فلسفہ کو۔ زندگی کے اس بھید کو میں بھی تمہاری طرح سمجھ سکتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مجھے یاد ہے تم نے میرے کارخانہ کو آگ سے بچایا تھا۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید آگ میں اور تیل ڈالتا۔ تم اس لڑائی میں ہوشیار ہو سُورداس۔ میں تمہارے سامنے نادان بچہ ہوں۔ دُنیا کی نظروں میں میں جیتا اور تم ہارے۔ مگر میں جیت کر بھی دُکھی ہوں۔ اور تم ہار کر بھی سُکھی ہو۔ تمہارے نام کی پُوجا ہو رہی ہے۔ میرا اُتپلا بنا کر لوگ جلا رہے ہیں۔ میں دولت اور عزت رکھ کر بھی تمہارا سامنا کر کے نہ لڑ سکا۔ سرکار کی آڑ سے لڑا۔ مجھے جب موقع ملا میں نے تمہارے اُوپر ناجائز حملے کئے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔

مرتے ہوئے آدمی کی وہ لوگ بھی کھلے دل سے تعریف کرتے ہیں۔ جن کی زندگی اُس سے دشمنی کرنے ہی میں گذری ہو۔ کیونکہ اب اُس سے کسی نقصان کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

سُورداس نے فراخدلی سے کہا۔ نہیں صاحب۔ آپ نے میرے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی۔ دَگا کرنا تو کمزوروں کا ہتھیار ہے۔ بلوان کبھی نیچے نہیں ہوتا۔

سیوک۔ ہاں سُورداس۔ ہونا وہی چاہیئے جو تم کہتے ہو پر ایسا ہونا نہیں۔ میں شک قاعدہ پر کبھی نہیں چلا۔ میں دنیا کو کھیل کا میدان نہیں بلکہ لڑائی کا میدان سمجھتا رہا۔ اور لڑائی میں دغا۔ فریب۔ چھپا وار سبھی کچھ کیا جاتا ہے۔

مذہبی جنگ کا زمانہ اب نہیں رہا۔

سُور داس نے اُس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مِٹھوا کی بات صاحب سے کہہ دوں یا نہیں؟ اُس نے کڑی قسم کھلائی ہے مگر کہہ دینا ہی مناسب ہے۔ لونڈا منچلا اور بدچلن ہے پھر اُس پر گھیسو کا ساتھ۔ کوئی نہ کوئی شرارت ضرور کرے گا۔ قسم کھا دینے سے تو مجھے ہتیا لگتی نہیں۔ کہیں کچھ کر بیٹھا تو صاحب سمجھیں گے کہ اندھے نے مرنے کے بعد بھی کسر نکالی۔ بولا۔

صاحب۔ آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

سیوک۔ کہو۔ شوق سے کہو۔

سُور داس نے چند لفظوں میں مِٹھوا کی بیہودہ باتیں مسٹر سیوک سے کہہ دیں اور آخر میں کہا۔ میری آپ سے اتنی ہی بنتی (عرض) ہے کہ اُس پر کڑی نگاہ رکھئے گا۔ اگر موقعہ پا گیا تو چوکنے والا نہیں ہے۔ تب آپ کو بھی اُس پر غصہ آ ہی جائے گا اور آپ اُسے ڈنڈ دینے کا اُپائے سوچیں گے۔ میں ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں چاہتا۔

مسٹر سیوک دیگر دولتمند لوگوں کی طرح بدمعاشوں سے بہت ڈرتے تھے۔ متفکرانہ لہجہ میں بولے۔ سُور داس تم نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ اس کے لئے تمہارا احسان مند ہوں۔ مجھ میں اور تم میں یہی فرق ہے۔ میں تمہیں کبھی یوں نہ چیتاتا۔ کسی دوسرے کے ہاتھوں تمہاری گردن کٹتے دیکھ کر بھی شاید مجھے رحم نہ آتا۔ قصائی بھی رحمدل اور بیرحم ہو سکتے ہیں۔ ہم لوگ دشمنی میں بے رحم قصائیوں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ (صوفیا سے انگریزی میں) بڑا راستی پسند شخص ہے۔ شاید دُنیا ایسے آدمیوں کے رہنے کا مقام نہیں ہے مجھے ایک چھپے ہوئے دشمن سے بچانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ یہ تو بھتیجا ہے مگر بیٹے کی بات ہوتی تو بھی مجھے ضرور خبر کر دیتا۔

صوفیا۔ مجھے تو اب یقین ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم دغابازوں کو پیدا کرتی ہے

اور قدرت بھلے آدمیوں کو۔

جان سیوک کو یہ بات پسند نہ آئی تعلیم کی اتنی بیہودہ نہ برداشت کر سکتے تھے بولے۔ سُورداس میرے قابل اور کوئی خدمت ہو تو بتلاؤ۔

سُورداس۔ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

سیوک۔ نہیں نہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا پس وپیش کہو۔

سُورداس۔ طاہر علی کو پھر نوکر رکھ لیجئے گا۔ ان کے بال بچے بڑی تکلیف میں ہیں۔

سیوک۔ سُورداس مجھے سخت افسوس ہے کہ میں تمہارے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ کسی بدنیت آدمی کو نوکر رکھنا میرے اصول کے خلاف ہے مجھے تمہاری بات نہ ماننے کا بہت رنج ہے مگر یہ میری زندگی کا ایک خاص اصول ہے۔ اور میں اُسے توڑ نہیں سکتا۔

سُورداس۔ رحم کرنا کبھی اصُول کے خلاف نہیں ہوتا۔

سیوک۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ طاہر علی کے بچّوں کی پرورش کرتا رہوں لیکن اُسے نوکر نہ رکھوں گا۔

سُورداس۔ جیسی آپ کی مرضی۔ کسی طرح اُن غریبوں کی پرورش ہونی چاہئے

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ رانی جاہنوی کا موٹر آ پہنچا۔ رانی اُتر کر صوفیا کے پاس گئیں اور بولیں۔ بیٹی معاف کرنا مجھے بڑی دیر ہو گئی۔ تم گھبرائیں تو نہیں؟ فقیروں کو کھلانے کے بعد یہاں آنے کو گھر سے نکلی تو کنور صاحب آ گئے۔ باتوں باتوں میں اُن سے بکواس ہو گئی۔ بڑھاپے میں کیوں آدمی اتنا دولت پرست ہو جاتا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں مسٹر سیوک۔ آپ کا کیا تجربہ ہے؟

سیوک۔ میں نے دونوں طرح کے آدمی دیکھے ہیں۔ اگر پربھو سیوک دولت کو ہیچ سمجھتا ہے تو میرے والد صاحب کو پھیکی چاء۔ سادی چپاتیاں اور دھندلی روشنی ہی پسند ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر گنگولی ہیں کہ جن کی آمدنی خرچ کے لئے

کافی نہیں ہوتی۔ اور پھر راجہ مہیندر کمار سنگھ جن کے یہاں پائی پائی کا حساب لکھا جاتا ہے۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے لوگ موٹروں کی طرف چلے۔ مسٹر سیڈیک اپنے بنگلہ کو گئے اور صوفیا رانی کے ساتھ سیوا بھون کو۔

(۴۵)

پانڈے پور میں گورکھے ابھی تک پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اُن کے اُپلوں کے جلنے سے چاروں طرف دھواں چھایا ہوا تھا۔ اس پھیلی ہوئی تاریکی میں آبادی کے کھنڈر خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ یہاں اب بھی دن میں تماشائیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ شہر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا۔ جو ان دو تین دنوں میں یہاں ایک بار نہ آیا ہو۔ یہ مقام اب مسلمانوں کی شہید گاہ اور ہندوؤں کا تیرتھ سمجھا گیا تھا جہاں ونے سنگھ شہید ہوئے تھے وہاں لوگ جاتے تو پیر سے جوتے اتار دیتے۔ کچھ لوگوں نے وہاں پھول پتے بھی چڑھائے تھے۔ یہاں کی خاص چیز سورداس کے جھونپڑے کا نشان تھا۔ پھوس کے ڈھیر ابھی تک پڑے ہوئے تھے۔ لوگ یہاں آکر گھنٹوں کھڑے رہتے اور فوجوں کو غصہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ ان آدمیوں نے ہمیں ذلیل کیا اور اب بھی یہیں جمے ہوئے ہیں۔ اب نہ جانے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ بجرنگی۔ ٹھاکر دین۔ نایک رام۔ جگدھر وغیرہ بھی اپنا زیادہ وقت یہیں گھومنے میں لگاتے۔ گھر کی یاد بھولتے بھولتے ہی بھولتی ہے۔ کوئی اپنی بھول سے چھوڑی ہوئی چیز تلاش کرنے آتا۔ کوئی پتھر یا لکڑی خریدنے اور بچوں کو تو اپنے گھروں کے نشانات دیکھنے ہی میں لطف آتا تھا۔ ایک پوچھتا۔ اچھا بتاؤ ہمارا گھر کہاں تھا؟ دوسرا کہتا۔ وہ جہاں کتا لیٹا ہوا ہے۔ تیسرا کہتا۔ جی کہیں ہو نہ؟ وہاں تو تیجو کا گھر تھا۔ دیکھتے نہیں۔ یہ امرود کا پیڑ اسی کے آنگن میں تھا۔ دوکاندار وغیرہ بھی یہیں شام صبح آتے اور گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے

بچتے جیسے گھر کے لوگ مرے ہوئے آدمی کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا آنگن تھا۔ یہ میری دالان تھا۔ یہیں بیٹھ کر تو میں بھی کھانا کھایا کرتا تھا۔ ارے میرے گھی کی ہانڈی پڑی ہوئی ہے۔ کتوں نے منہ ڈال دیا ہوگا۔ نہیں تو پیتے چلتے کئی سال کی ہانڈی تھی۔ ارے میرا پرانا جوتہ پڑا ہوا ہے۔ پانی میں پھول کر کتنا بڑا ہو گیا ہے! دو چار آدمی ویسے بھی تھے جو اپنے بزرگوں کا دفینہ کھوجنے آیا کرتے تھے۔ عجلت میں انہیں گھر کھودنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دادا بنگال کی ساری کمائی اپنے سرہانے گاڑ کر مر گئے۔ کبھی اُس کا پتہ نہ بتایا۔ کیسی ہی گرمی پڑے۔ کتنا ہی مچھر کاٹیں وہ اپنی کوٹھڑی ہی میں سوتے تھے۔ پتا جی کھودتے کھودتے رہ گئے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں شور نہ مچ جائے۔ جلدی کیا ہے؟ گھر ہی میں تو ہے۔ جب جی چاہے گا۔ نکال لیں گے۔ میں بھی یہی سوچتا رہا۔ کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے نہیں تو پہلے ہی سے کھود نہ لیا ہوتا۔ اب کہاں پتہ ملتا ہے؟ جس کے بھاگ کا ہوگا وہ پائے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ نایک، رام بجرنگی اور اُن کے دیگر احباب آکر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

نایک رام۔ کہو بجرنگی۔ کہیں کوئی گھر ملا؟

بجرنگی۔ گھر نہیں۔ پتھر ملا۔ شہر میں رہوں تو اتنا کرایہ کہاں سے لاؤں۔ گھاس چارا کہاں ملے؟ اتنی جگہ کہاں مل جاتی ہے؟ ہاں اوروں کی طرح دودھ میں پانی ملانے لگوں تو گجر ہو سکتا ہے۔ پر یہ کرم عمر بھر نہیں کیا تو اب کیا کروں گا؟ دیہات میں رہتا ہوں تو گھر بنوانا پڑتا ہے۔ جمیں دار کو نجر نہ دو۔ تو جمین نہ ملے۔ ایک ایک بسوے کے دو دو سو مانگتے ہیں۔ گھر بنوانے کو الگ ہجار روپیہ چاہیئے۔ اتنے روپے کہاں سے لاؤں؟ جتنا معاوضہ ملا ہے اُتنے میں تو ایک کوٹھڑی بھی نہیں بن سکتی۔ میں تو سوچتا ہوں کہ جانوروں کو بیچ ڈالوں اور یہیں کہیں پتلی گھر میں مجوری کروں۔ سب جھگڑا ہی مٹ جائے۔

طلب تو اچھی ملتی ہے۔ اور کہاں کہاں ٹھکانا ڈھونڈتے پھریں؟

جگدھر۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ بنا بنایا مکان رہنے کو مل جائے گا۔ پڑے رہیں گے۔ کہیں گھر بیٹھے کھانے کو تو ملے گا نہیں۔ دن بھر گھوڑا بچھڑے نہ پھرے۔ یہیں مجبوری کی۔

ٹھاکر دین۔ تم لوگوں سے مجوری ہو سکتی ہے کرو۔ میں تو چاہے بھوکوں مر جاؤں پر مجوری نہیں کر سکتا۔ مجوری شودروں کا کام ہے۔ رچھا کرنا ویسیوں کا کام ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنا رُتبہ کیوں کھوئیں۔ بھگوان کہیں نہ کہیں ٹھکانا لگائیں گے ہی۔ یہاں تو اب کوئی مجھے سیٹھ سیٹھ رہنے کو کہے تو نہ رہوں بستی اُجڑ جاتی ہے تو بھوتوں کا ڈیرا ہو جاتا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کیسا سیاپا چھایا ہوا ہے نہیں تو اس بیلا یہاں کتنا گل جار رہتا تھا۔

نایک رام۔ مجھے کیا صلاح دیتے ہو بجرنگی؟ دیہات میں رہوں کہ شہر میں؟

بجرنگی۔ بھیّا۔ تمہارا دیہات میں نباہ نہ ہوگا۔ کہیں آگے پیچھے ہٹنا ہی پڑیگا۔ روج شہر کا آنا جانا ٹھہرا۔ کتنی مشکل ہوگی۔ پھر تمہارے جاتری تمہارے ساتھ دیہات میں تھوڑے جائیں گے۔ یہاں سے تو شہر اتنا دور نہیں تھا۔ اس لئے سب چلے آتے تھے۔

نایک رام۔ تمہاری کیا صلاح ہے۔ جگدھر؟

جگدھر۔ بھیّا۔ میں تو شہر میں رہنے کو نہ کہوں گا۔ کھرچ کتنا بڑھ جائے گا۔ مٹی بھی مول ملے۔ پانی کے بھی دام دو۔ چالیس پچاس کو تو ایک چھوٹا سا مکان ملیگا۔ تمہارے ساتھ ہر بکھت دس بیس آدمی رہا ہی ہیں۔ اس لئے بڑا گھر لینا پڑیگا۔ اس کا کرایہ سو سے نیچے نہ ہوگا۔ گائیں بھینسیں کہاں رکھو گے؟ جاتریوں کو کہاں ٹکاؤ گے۔ تمہیں جتنا معاوضہ ملا ہے اُتنے میں تو اتنی جمین بھی نہ ملے گی۔ گھر بنوانے کی کون کہے؟

نائک رام - بولو بھائی بجرنگی۔ سال کے بارہ سو کرایہ کے کہاں سے آئیں گے؟ کیا ساری کمائی کرایہ ہی میں کھرچ کر دو گے؟

بجرنگی - جمین تو دہات میں بھی مول لینی پڑے گی۔ سینت تو ملے گی نہیں۔ پھر کون جانے کس گاؤں میں جگہ ملے۔ بہت سے آس پاس کے گاؤں تو ایسے بھرے ہوئے ہیں کہ وہاں اب ایک جھونپڑی بھی نہیں بن سکتی۔ کسی کے دوار پر آنگن تک نہیں ہے۔ پھر جگہ مل گئی تو گھر بنوانے کے لئے سارا سامان شہر سے لے آنا پڑے گا۔ اس میں کتنا کھرچ پڑے گا۔ نو کی لکڑی سے بنے کھرچ۔ کچا مکان بنواؤ گے تو کتنی تکلیپھ۔ ٹھیکے کیچڑ ہو۔ سوچ منوں کوڑا لگے۔ ساتویں دن لیپنے کو چاہئے۔ تمہارا گھر میں کون لیپنے والا بیٹھا ہوا ہے۔ تمہارا کچے مکان میں نہ رہا جائے گا۔ شہر میں آنے جانے کے لئے سواری رکھنی پڑے گی۔ اس کا کھرچ بھی پچاس سے نیچے نہ ہو گا۔ تم کچے مکان میں تو کبھی رہے نہیں۔ کیا جانو دیمک، کیڑے مکوڑے، سیل۔ پوری آپ بیتی لیبدر رہتی ہے۔ تم تماش بین آدمی ٹھہرے۔ ہاں بتا سکی بھابھی۔ دہات میں کہاں؟ میں تو یہی کہوں گا کہ دہات کے ایک کی جگہ شہر میں دو کھرچ ہوں تب بھی شہر ہی میں رہو۔ وہاں ہم لوگوں سے بھی بھینٹ بھلائی ہو جایا کرے گی۔ آگے دودھ دہی لے کر سہر تو روج جانا ہی پڑے گا۔

نائک رام۔ واہ بہادر واہ۔ مان گیا۔ تمہارا جوڑ تو بھیرو تھا۔ دوسرا کون تمہارے سامنے ٹک سکتا ہے۔ تمہاری بات میرے من میں بیٹھ گئی۔ بولو جگدھر۔ اس کا کچھ جواب دیتے ہو تو دو، نہیں تو بجرنگی کی ڈگری ہوتی ہے۔ سو روپے کرایہ دینا منجور۔ یہ جھنجھٹ کوئی سر پہ نہ لے گا۔

جگدھر۔ بھیا۔ تمہاری مرجی ہے تو شہر میں چلے جاؤ۔ میں بجرنگی سے لڑائی تھوڑے ہی کرتا ہوں۔ پر دہات دہات ہی ہے۔ شہر شہر ہی ہے۔ شہر میں پانی تک تو اچھا نہیں ملتا۔ وہی میلے کا پانی پیو۔ دھرم جائے اور کچھ سواد نہ ملے۔

ٹھاکر دین۔ اندھا آنکھ جاتی تھی۔ جانتا تھا کہ ایک دن یہ نیچ گھر ہم

لوگوں کو بن پاس دے گا۔ جان تک گنوائی پر اپنی جیبن نہ دی۔ ہم لوگ اس کرنٹے کے
چکے ہیں پر اگر اس کا ساتھ نہ چھوڑتے تو صاحب لاگ سر شکیپ کر مر جاتے ایک نہ چلتی۔
نائیک رام۔ اب اس کے بچنے کی کوئی آسا نہیں معلوم ہوتی۔ آج میں گیا تھا۔
بُرا حال تھا۔ کہتے ہیں کہ رات کو ہوش میں تھا۔ جان سیوک صاحب اور راجہ
صاحب سے دیر تک باتیں کیں۔ مٹھوا سے بھی باتیں کیں۔ سب لوگ سوچ رہے
تھے کہ اب بچ جائے گا۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے کہہ دیا کہ اندھے کی جان کا کچھ
کھٹکا نہیں ہے۔ مگر سورداس یہی کہتا جاتا ہے آپ لوگ میری جو سانست کرنا ہے
کر لیجئے۔ پر میں بچوں گا نہیں۔ آج نبض بند ہے۔ مٹھوا بڑا کپوت نکل گیا۔ اس کی
کپوتی نے اندھے کی جان لی نہیں تو ابھی کچھ دن اور جیتا۔ ایسے ہیرے بڑے ہی کہیں
ہوتے ہیں۔ آدمی نہیں دیوتا تھا۔

بجرنگی۔ سچ کہتے ہو بھیا۔ آدمی نہیں تھا دیوتا تھا۔ ایسا مرد آدمی کہیں
نہیں دیکھا۔ سچائی کے سامنے کسی کی پرواہ نہیں چاہے کوئی اپنے گھر کا لاٹ
ہی کیوں نہ ہو۔ گھیسو کے پیچھے میں اس سے بگڑ گیا تھا پر اب جو سوچتا ہوں۔ تو
معلوم ہوتا ہے کہ سورداس نے کوئی انیائے نہیں کیا۔ کوئی بدمعاش ہماری ہی بہو
بیٹی کو بری نگاہ سے دیکھے تو برا لگے گا کہ نہیں۔ اس کے خون کے پیاسے ہو
جاؤ گے۔ گھات پائیں گے تو سر اتار لیں گے۔ اگر سور نے ہمارے ساتھ وہی
برتاؤ کیا تو کیا برائی کی؟ گھیسو کا چلن بگڑ گیا تھا۔ سمجھا نہ پاتا تو نہ جانے کیا
اندھیر کرتا۔

ٹھاکر دین۔ اب تک یا تو اسی کی جان گئی ہوتی یا دوسروں کی۔

جگدھر۔ چودھری۔ گھر گاؤں میں اتنی سچائی نہیں برتی جاتی۔ اگر سچائی
سے کسی کا نقصان ہوتا ہو تو اس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ سورداس میں اور سب
باتیں اچھی تھیں۔ بس اتنی ہی بات بری تھی۔

ٹھاکر دین۔ دیکھو جگدھر۔ سورداس یہاں نہیں ہے۔ کسی کی پیٹھ

پیچھے نندا نہیں کرنی چاہئے۔ نندا کرنے والے کی تو بات ہی کیا۔ نندا سننے والوں کو بھی پاپ لگتا ہے۔ نہ جانے پورب جنم میں کون سا پاپ کیا تھا کہ ساری جمتا جمتا چار دوس رہ گئے۔ یہ پاپ اب نہ کروں گا۔

بجرنگی۔ ہاں جگدھر یہ بات اچھی نہیں۔ میرے اوپر بھی تو وہی پڑی ہے۔ جو تمہارے اوپر پڑی۔ لیکن سورداس کی نندا نہیں سن سکتا۔

ٹھاکر دین۔ ان کی بہو بیٹی کو کوئی گھورتا تو ایسی باتیں نہ کرتے۔

جگدھر۔ بہو بیٹی کی بات اور ہے۔ ہرجائیوں کی بات اور۔

ٹھاکر دین۔ بس اب چپ ہی رہنا جگدھر۔ تمہیں ایک بار سبھا گی کی بھائی دیتے پھرتے تھے۔ آج ہرجائی کہتے ہو۔ لاج بھی نہیں آتی؟

نایک رام۔ یہ عادت بہت کھراب ہے۔

بجرنگی۔ آسمان پر تھوکنے سے تھوک اپنے ہی منہ پر پڑتا ہے۔

جگدھر۔ ارے تو میں سورداس کی نندا تھوڑے ہی کر رہا ہوں۔ دل دکھتا ہے۔ تو بات منہ سے نکل ہی آتی ہے۔ تمہیں سوچو کہ بدیا دھراب کس کام کا رہا؟ پڑھا لکھا ناسب مٹی ہو گیا کہ نہیں؟ اب نہ سرکار میں نوکری ملے گی۔ نہ کوئی دوسرا آدمی رکھے گا۔ اس کی تو جند گانی کھراب ہو گئی۔ بس یہی دکھ ہے۔ نہیں تو سورداس کا سا آدمی کوئی کیا ہو گا۔

نایک رام۔ ہاں اتنا میں بھی مانتا ہوں۔ کہ اس کی جند گانی کھراب ہو گئی۔ جس سچائی سے کسی کا اَن بھل ہوتا ہو اس کا منہ سے نکالنا ہی اچھا۔ پر سورداس کو سب کچھ مایا ہے۔

ٹھاکر دین۔ سورداس نے بدیا تو نہیں چھین لی؟

جگدھر۔ وہ بدیا کس کام کی جب نوکری چاکری نہ کر سکے۔ دھرم کی بات ہوتی تو یوں بھی کام دیتی۔ یہ بدیا ہمارے کس کام آوے گی؟

نایک رام۔ اچھا یہ بتاؤ کہ سورداس مر گئے تو گنگا نہلانے چلو گے یا نہیں؟

جگدھر۔ گنگا نہانے کیوں نہ چلوں گا۔ سب کے پیچھے چلوں گا۔ گنگا تو آدمی بیڑا پار کر دیتی ہے۔ سُور داس ہمارے بیری نہیں تھے۔ جب انہوں نے مٹھوا کو چھوڑا جیسے بیٹے کی طرح پالا تو دوسروں کی بات ہی کیا۔ مٹھوا کیا وہ اپنے بیٹے کو نہ چھوڑتے۔

نایک رام۔ چلو دیکھ آئیں۔

چاروں آدمی سُور داس کو دیکھنے چلے۔

(۴۶)

چاروں آدمی شفا خانہ پہنچے تو نو بج چکے تھے۔ آسمان خواب میں مست آنکھیں بند کئے پڑا اونگھ رہا تھا مگر زمین بیدار تھی۔ بھیرو کھڑا ہوا سُور داس کو پنکھا جھل رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ سرہانے کی طرف بیٹھی ہوئی صوفیا بیقرار آنکھوں سے سُور داس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سُبھاگی انگیٹھی میں آگ بنا رہی تھی۔ کہ تھوڑا سا دودھ گرم کر کے سُور داس کو پلائے۔ تینوں کی شکل سے مایوسی برس رہی تھی۔ چاروں طرف وہ سکوت تھا جو موت کا پیش خیمہ ہے۔

صوفیا نے غمگین لہجہ میں کہا۔ پنڈا جی۔ آج سوگ کی رات ہے۔ اُن کی نبض کا کئی کئی منٹوں تک پتہ نہیں چلتا۔ شاید آج کی رات مشکل ہی سے کٹے۔ حیثیت تبدیل ہو گئی ہے۔

بھیرو۔ دوپہر سے یہی حال ہے۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کو پہچانتے ہیں۔

صوفیا۔ ڈاکٹر گنگولی آتے ہی ہوں گے۔ اُن کو تار دیا تھا کہ میں آ رہا ہوں۔ یوں تو موت کی دوا کسی کے پاس نہیں مگر ممکن ہے کہ ڈاکٹر گنگولی کے ہی ہاتھوں جس بدا ہو۔

سُبھاگی۔ میں نے شام کو پکارا تھا تو آنکھیں کھولی تھیں پر بولے کچھ نہیں۔

ٹھاکر دیتا۔ بڑا اکیالی برس تھا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک موڑ آیا اور کنور بھرت سنگھ۔ ڈاکٹر گنگولی اور رانی جانہوی اُتر پڑے۔ گنگولی نے شور داس کے چہرہ کی طرف دیکھا اور مایوسانہ تبسم سے بولے۔ ہم کو دس منٹ کا بھی دیر ہوتا تو اُن کا درشن بھی نہ پاتا۔ پُنا دا آچکا ہے۔ کیوں دودھ گرم کرتا ہے بھائی۔ دودھ کون پئے گا؟ جمراج (فرشتہ موت) تو دودھ پینے کا مہلت نہیں دیتا۔

صوفیا نے معصومانہ انداز سے پوچھا۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب؟
گنگولی۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے مس صوفیا؟ ہم جمراج کو ہرا دے گا۔ ایسے لوگوں کا اصل جندگی تو موت کے پیچھے ہی ہوتا ہے جب وہ مٹی پانی ہوا آگ۔ آکاش۔ ان پانچوں کے بندھن کو توڑ دیتا ہے۔ شور داس ابھی نہیں مرے گا۔ بہت دنوں تک نہیں مرے گا ہم سب مر جائے گا۔ کوئی آج کوئی کل۔ کوئی پرسوں۔ پر شور داس تو امر ہو گیا۔ اس نے تو کال کو جیت لیا۔ ابھی تک اُس کا جندگی مٹی پانی وگیرہ پانچوں سے بندھا تھا۔ اب وہ پھیلے گا اور سارے صوبہ اور سارے ملک کو جگا دے گا۔ ہم کو کام کرنے کا بیر بننے کا بات بتائے گا۔ یہ شور داس کا موت نہیں ہے۔ صوفیا! یہ اُس کی جندگی کا بڑھاوا ہے۔ ہم تو ایسی ما پھل سمجھتا ہے۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر گنگولی نے جیب سے ایک شیشی نکالی اور اُس کے کئی قطرے شور داس کا منہ کھول کر حلق میں ٹپکا دئے۔ فوری اثر نمودار ہوا۔ شور داس کے بے رونق چہرہ پر ہلکی ہلکی سُرخی دوڑ گئی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر اُدھر تاکتے ہوئے ہنسا۔ پھر گراموفون کی سی بناوٹی اور بیٹھی ہوئی آواز سے بولا۔ بس بس۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو؟ تم جیتے اور میں ہارا۔ یہ بازی تمہارے ہاتھ رہی۔ مجھ سے کھیلتے نہیں بنا۔ تم منجھے ہوئے کھلاڑی ہو۔ دم نہیں اکھڑتا۔ کھلاڑیوں کو ملا کر کھیلتے ہو اور تمہیں حوصلہ بھی اچھا ہے۔ ہمارا دم اُکھڑ جاتا ہے۔ ہم ہانپنے لگتے ہیں۔ ہم کھلاڑیوں کو ملا کر نہیں کھیلتے۔ آپس میں جھگڑتے ہیں۔ گالی گلوچ مار پیٹ کرتے

ہیں۔ کوئی کسی کی نہیں مانتا۔ تم کھیلنے میں ہوشیار ہو اور ہم اناڑی ہیں بس اتنا پھرک ہے۔ تالیاں کیوں بجاتے ہو؟ یہ تو جیتنے والوں کا دھرم نہیں تمہارا دھرم تو ہے ہماری پیٹھ ٹھونکیں۔ ہم ہارے تو کیا میدان سے بھاگے تو نہیں۔ ارے روئے تو نہیں۔ دھاندلی تو نہیں کی۔ پھر کھیلیں گے۔ ذرا دم لے لینے دو۔ ہار ہار کر تمہیں سے کھیلنا سیکھیں گے۔ اور ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی ضرور ہوگی۔

ڈاکٹر گنگولی اس بکواس کو آنکھیں بند کئے کچھ اس طریقہ پر محو ہو کر سنتے رہے۔ گویا کلام خدا ہو۔ پھر عقیدت کے لہجہ میں بولے ـــ یہ سچے کھیال کا آدمی ہے۔ ہمارے تمام آپس کے سوشل اور پولیٹیکل جندگی کا بڑا اچھا تصویر کھینچ دیا اور تھوڑے میں۔

صوفیا نے سورداس سے کہا۔ سورداس۔ کنور صاحب اور رانی جی آئے ہوئے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟

سورداس نے مجذوبانہ سرگرمی سے کہا۔ ہاں ہاں ہاں۔ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اُن کے چرنوں کی دھول میرے ماتھے پر لگا دو۔ تر جاؤں۔ نہیں نہیں مجھے اٹھا کر بیٹھا دو۔ کھول دو یہ پٹی۔ میں کھیل چکا۔ اب مجھے مرہم پٹی نہیں چاہئے۔ رانی۔ کون؟ ونے سنگھ کی ماتا نا؟ کنور صاحب اُن کے پتا نا؟ مجھے بیٹھا دو۔ اُن کے پیروں پر آنکھیں ملوں گا۔ میری آنکھیں کھل جائیں گی۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر اسیس دو۔ ماتا۔ ہاں اب میری جیت ہوگی۔ ادھو۔ وہ سامنے ونے سنگھ اور اندر دت سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے مجھے بلا رہے ہیں۔ اُن کے چہرہ پر کتنا تیج ہے! میں بھی آتا ہوں۔ یہاں تمہاری کچھ سیوا نہ کر سکا اب وہیں کروں گا۔ ماتا پتا۔ بھائی بند۔ سب کو سورداس کا رام رام! اب جاتا ہوں۔ جو کچھ بنا بگڑا ہو معاف کرنا۔

رانی جاہنوی نے آگے بڑھ کر فرطِ عقیدت سے سورداس کے قدموں پر سر

رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ سور داس کے پیر آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کنور صاحب نے آنکھوں پر رومال ڈال لیا اور کھڑے کھڑے رونے لگے۔

سور داس کا چہرہ پھر اداس ہو گیا۔ دوا کا اثر زائل ہو گیا۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔

نائیک رام گنگا جل لانے دوڑے۔ جگدھر نے سور داس کے قریب جا کر زور سے کہا۔ سور داس میں ہوں جگدھر۔ میرا اپرادھ چھما کرو۔

سور داس منہ سے کچھ نہ بولا۔ دونوں ہاتھ جوڑے۔ آنسو کی دو بوندیں گالوں پر بہہ آئیں اور کھلاڑی میدان سے رخصت ہو گیا۔

ایک لمحہ میں چاروں طرف خبر پھیل گئی۔ چھوٹے بڑے۔ امیر غریب۔ عورت مرد۔ بوڑھے جوان ہزاروں کی تعداد میں نکل پڑے۔ سب ننگے سر۔ ننگے پیر۔ گلے میں انگوچھے ڈالے شفاخانہ کے میدان میں جمع ہو گئے۔ عورتیں منہ ڈھانکے کھڑی رو رہی تھیں۔ گویا اپنے گھر کا کوئی آدمی مر گیا ہو۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اسی کے سب ہوتے ہیں۔ سارا شہر امڈا چلا آتا تھا۔ سب کے سب اس کھلاڑی کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کی ہار میں بھی جیت کی شان تھی۔ کوئی کہتا تھا سادھو تھا۔ کوئی کہتا تھا ولی تھا۔ کوئی دیوتا کہتا تھا۔ پر اصل میں وہ کھلاڑی تھا۔ وہ کھلاڑی جس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں پڑی۔ جس نے کبھی ہمت نہیں ہاری جس نے کبھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ جیتا تو خوش رہا۔ ہارا تو خوش رہا۔ ہارا تو جیتنے والے سے کینہ نہیں رکھا۔ جیتا تو ہارنے والے پر تالیاں نہیں بجائیں۔ جس نے کھیل میں ہمیشہ صفائی برتی۔ کبھی دھاندلی نہیں کی۔ کبھی مخالف پر چھپ کر وار نہیں کیا۔ بھکاری تھا۔ مجہول تھا۔ اندھا تھا۔ بیکس تھا۔ کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوا۔ کبھی بدن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملا۔ مگر دل پر عاشقت تھو۔ سچائی اور ہمت کے جذبات سے معمور تھا۔ بدن پر گوشت نہ تھا مگر دل میں انکسار۔ اخلاق اور ہمدردی تھی۔

ہاں وہ سادھو نہ تھا۔ مہاتما نہ تھا۔ دیوتا نہ تھا۔ فرشتہ نہ تھا بلکہ ایک حقیر اور کمزور انسان تھا۔ مکروہاتِ دُنیا سے گھرا ہُوا۔ جس میں برائیاں بہت۔ غصہ۔ حرص۔ تلوّن۔ غرور۔ یہ سبھی برائیاں اُس میں موجود تھیں۔ وصف صرف ایک تھا۔ مگر یہ سبھی کمزوریاں اُس ایک وصف سے ہی کرشن کی کان میں جا کر کُندن ہو جانے والی چیزوں کی طرح خوبیوں کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ غصہ جائز غصہ ہو جاتا تھا۔ حرص محبت بن جاتی تھی۔ تلوّن جوش کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ اور غرور خودداری کی صورت میں۔ وہ وصف کیا تھا؟ حق پرستی۔ انصاف پسندی۔ ایثار نفسی یا ہمدردی یا اُس کا اور جو نام چاہے رکھ لیجئے۔ ناانصافی دیکھ کر اُس سے نہ رہا جاتا تھا۔ زیادتی اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔

جنازہ کس دھوم دھام سے نکالا گیا۔ اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ باجے گاجے نہ تھے۔ ہاتھی گھوڑے نہ تھے۔ مگر آنسو بہانے والی آنکھوں اور تعریف کرنے زبانوں کی کمی نہ تھی۔ بڑا ہجوم تھا۔ سُورداس کی حبیب سے بڑی جیت یہ تھی کہ دشمنوں کو بھی اُس سے دشمنی نہ تھی۔ اگر عزاداروں میں صوفیا۔ گنگولی۔ جانکوی۔ بھرت سنگھ تایک رام تھے تو مہیندر کمار سنگھ۔ جان سیوک جگدھر جیسے کہ مسٹر کلارک بھی تھے۔ صندل کی چتا تیار کی گئی تھی۔ اُس پر فتح کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ چتا میں آگ دینے کی رسم کون ادا کرتا؟ مٹھوا ٹھیک اُسی وقت روتا ہُوا آ پہنچا۔ سُورداس نے جیتے جی جو نہ کر پایا تھا اُسے مر کر کیا۔

اُسی مقام پر کئی روز پہلے یہی رنج و سوگ کا منظر دکھائی دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس روز لوگوں کے دل میں غم تھا اور آج فتح کا غرور۔ وہ ایک بہادر کی بہادرانہ موت تھی۔ یہ ایک کھلاڑی کا آخری کھیل۔ ایک بار پھر آفتاب کی شعاعیں چتا پر پڑیں۔ اُن میں غرور کی چمک تھی گویا آسمان سے فاتحانہ گیت کے نغمے آ رہے تھے۔

لوٹتے وقت مسٹر کلارک نے راجہ مہیندر کمار سے کہا۔ یہ میری بدنصیبی ہے

کہ میرے ہاتھوں ایسے نیک انسان کا خون ہوا۔

راجہ صاحب نے طنز سے کہا۔ خوش نصیبی کہئے۔ بدنصیبی کیوں؟

کلارک۔ نہیں راجہ صاحب بدنصیبی ہی ہے۔ ہمیں آپ جیسے انسانوں سے خوف نہیں۔ خوف ایسے ہی آدمیوں سے ہے جو عوام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ حکومت کرنے کی سزا ہے کہ اِس مُلک میں ہم ایسے آدمیوں کو قتل کرتے ہیں۔ جن کی انگلینڈ میں ہم پرستش کرتے۔

صوفیا اُسی وقت اُن کے پاس سے ہوکر گذری۔ یہ الفاظ اُس کے کان میں پڑے بول اُٹھی — کاش یہ الفاظ آپ کے دل سے نکلے ہوتے!

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ مسٹر کلارک اس طنز سے تلملا گئے۔ ضبط نہ کرسکے۔ گھوڑا بڑھا کر بولے۔ یہ تمہارے اُس ظلم کا نتیجہ ہے جو تم نے مجھ پر کیا ہے۔

صوفیا آگے بڑھ گئی۔ یہ بات اُس نے نہ سُنی۔

آسمانی راہ گیر جو پردۂ ابر سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک ایک کرکے رخصت ہو رہے تھے۔ لاش کے ساتھ جانے والے بھی ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ پر صوفیا کہاں جاتی؟ اسی دبدھا میں کھڑی تھی کہ اندو مل گئی۔ صوفیا نے کہا — اندو ذرا ٹھہرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔

(۴۷)

شام ہوگئی تھی۔ مل کے مزدور چھٹی پا گئے تھے۔ آج کل دونی مزدوری دینے پر بھی بہت تھوڑے مزدور کام کرنے آتے تھے۔ پانڈے پور میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں اب مکانات کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہاں درخت ابھی تک بدستور کھڑے تھے۔ وہ چھوٹا سا نیم کا درخت اب سُورداس کی جھونپڑی کا نشان بتلاتا تھا۔ پھوس لوگ اٹھالے گئے تھے۔ زمین ہموار کی جارہی تھی۔ اور کہیں کہیں نئے مکانوں کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ صرف بستی کے آخری حصہ میں ایک

چھوٹا سا کھپریل کا گھر اب تک آباد تھا جیسے کسی خاندان کے سب آدمی مر گئے ہوں۔
اور صرف ایک بوڑھا کمزور اور مریضہ آدمی نام لیوا باقی رہ گیا ہو۔ یہی کلثوم کا گھر
ہے جسے اپنے وعدہ کے ایفا میں شوہر واس کی خاطر سے مسٹر جان سیوک نے گرنے
نہیں دیا۔ دروازہ پر نسیمہ اور جابر کھیل رہے ہیں اور طاہر علی ایک ٹوٹی چارپائی
پر سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہینوں سے اُن کی حجامت نہیں بنی۔
بدن کمزور ہے۔ چہرہ اُترا ہوا۔ آنکھیں آگے کو نکل آئی ہیں۔ سر کے بال بھی کھچڑی
ہو گئے ہیں۔ قید کی تکلیفوں اور گھر کی فکروں نے کمر توڑ دی ہے۔ وقت کی رفتار
نے اُن پر برسوں کا کام مہینوں میں کر ڈالا ہے۔ اُن کے اپنے کپڑے جو جیل سے
چھوٹتے وقت واپس ملے ہیں اُتارے سے معلوم ہوتے ہیں۔ آج صبح وہ نینی
جیل سے آئے ہیں اور گھر کی دردناک حالت نے انہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ
بال بنوانے تک کو جی نہیں چاہتا۔ اُن کے آنسو نہیں تھمتے۔ دل کو سمجھانے پر بھی نہیں
تھمتے۔ اس وقت بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں رہ رہ کر
ماہر علی پر غصہ آتا ہے اور وہ ایک آہِ سرد کھینچ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ تکلیفیں یاد
آ رہی ہیں جو انہوں نے خاندان کے لئے خوشی سے جھیلی تھیں۔ وہ ساری تکلیفیں ساری
قربانیاں بیکار گئیں۔ کیا اسی دن کے لئے میں نے اتنی مصیبتیں جھیلی تھیں؟ اسی
دن کے لئے اپنے خون سے خاندان کے درخت کو سینچا تھا؟ یہی کڑوے پھل کھانے
کے لئے؟ آخر میں جیل میں ہی کیوں گیا تھا؟ میری آمدنی میرے بچوں کی پرورش
کے لئے کافی تھی۔ میں نے جان دی خاندان کے لئے۔ آپ نے جو بوجھ میرے سر رکھ دیا
تھا وہی میری تباہی کا سبب ہوا۔ غضب خدا کا مجھ پر یہ ستم! مجھ پر یہ قہر!
میں نے کبھی نئے جوتے نہیں پہنے۔ برسوں کپڑوں میں پیوند لگا لگا کر دن گزارے۔
بچے مٹھائیوں کو ترس ترس کر رہ جاتے تھے۔ بیوی کے سر کے لئے تیل بھی میسر نہ
ہوتا تھا۔ چوڑیاں پہننا نصیب نہ تھا۔ ہم نے فاقے کئے۔ زیور اور کپڑے کی کون
کہے عید کے دن بھی بچوں کو نئے کپڑے نہ ملتے تھے۔ کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بیوی

کے لیئے ایک لوہے کا چھلّا بنوا تا۔ اُنئے اُس کے سارے گہنے فروخت کر کے کھلا دیئے
اس تمام نفس کشی کا یہ نتیجہ! اور وہ بھی میری غیر حاضری میں۔ میرے بچّے اس طرح
گھر سے نکال دیے گئے گویا کسی غیر کے بچے ہیں۔ میری بیوی کو رو رو کر دن کاٹنے پڑے۔
کوئی آنسو پونچھنے والا بھی نہ ہوا اور میں نے اسی کمبخت لونڈے کے لئے غبن کیا تھا!
اسی کے لئے امانت میں خیانت کی تھی! کیا میں مر گیا تھا؟ اگر وہ لوگ میرے بال بچوں
کو اچھی طرح عزت آبرو سے رکھتے تو کیا میں ایسا گیا گزرا تھا کہ ان کے احسان کے
بار سے سبکدوش ہونے کی کوشش نہ کرتا؟ نہ دودھ گھی کھلاتے۔ نہ تنزیب اوڑھی
پہناتے۔ روکھی روٹیاں ہی دیتے۔ گزی گاڑھا پہناتے مگر گھر میں تو رکھتے۔ وہ روپوں
کے پان کھا جاتے ہوں گے اور یہاں میری بیوی کو سلائی کر کے اپنا گزر بسر کرنا پڑا
اُن ہی جیسوں سے تو جان سیوک ہی اچھے جنہوں نے رہنے کا مکان تو نہ گرایا۔ مدد کرنے
کے لئے آئے تو۔

کلثوم نے یہ مصیبت کے دن سلائی کر کے گزارے تھے۔ دیہات کی عورتیں
اُس کے یہاں اپنے نئے کرتیاں۔ بچوں کے لئے ٹوپ اور کرتے سلاتیں۔ کوئی پیسے دے
جاتی۔ کوئی اناج۔ اُسے کھانے پینے کی تکلیف نہ تھی۔ طاہر علی اپنے عروج کے زمانہ
میں بھی اُس سے زیادہ آرام نہ دے سکے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُس وقت سر
پر اپنا شوہر تھا اور اب کوئی نہ تھا۔ اس بے کسی نے مصیبت کو اور بھی بڑھا دیا
تھا۔ تاریکی میں تنہائی زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔

طاہر علی سر جھکائے غمگین بیٹھے تھے کہ کلثوم نے دروازہ پر آ کر کہا۔ شام
ہو گئی اور ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ چلو۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ طاہر علی نے
سامنے کے کھنڈروں کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ماہر تھانہ ہی میں رہتے ہیں یا
کہیں اور مکان لیا ہے؟

کلثوم۔ مجھے کیا خبر۔ یہاں تب سے جھوٹوں بھی تو نہیں آئے جب یہ
مکانات خالی کرائے جا رہے تھے۔ جبھی ایک روز سپاہیوں کو لے کر آئے تھے۔

نسیمہ اور صابر چچا چچا کہہ کر دوڑے پر اُنھوں نے دونوں کو پھٹکار دیا۔

طاہر علی۔ ہاں کیوں نہ پھٹکارتے۔ اُن کے کون ہوتے تھے۔

کلثوم۔ چلو دو لقمے کھالو۔

طاہر علی۔ ماہر میاں سے ملے بغیر مجھ پر آب و دانہ حرام ہے۔

کلثوم۔ مل لینا۔ کہیں بھاگے جاتے ہیں۔

طاہر علی۔ جب تک جی بھر اُس سے باتیں نہ کرلوں گا۔ دل کو تسکین نہ ہوگی۔

کلثوم۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ ہماری بھی تو کسی طرح کٹ ہی گئی۔ خدا نے کسی نہ کسی حیلہ سے رزق پہنچا تو دیا۔ تم سلامت رہوگے تو ہماری پھر آرام سے گزرے گی اور پہلے سے زیادہ آرام سے۔ دو کو کھلا کر کھائیں گے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا۔ اُس کا ثواب اور عذاب اُن کو خدا سے ملے گا۔

طاہر علی۔ خدا ہی انصاف کرتا تو ہماری یہ حالت کیوں ہوتی؟ اُس نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔

اتنے میں ایک بڑھیا سر پر ٹوکری رکھے آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ بہو۔ لڑکوں کے لئے بھٹے لائی ہوں۔ کیا تمہارے میاں آ گئے کیا؟

کلثوم بڑھیا کے ساتھ کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اُس کے کچھ کپڑے سیئے تھے۔ دونوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

اندھیری رات دریا کی لہروں کی طرح مشرق سے دوڑی چلی آتی تھی۔ وہ کھنڈر ایسے بھیانک معلوم ہوتے تھے گویا کوئی قبرستان ہے۔ نسیمہ اور صابر دونوں آ کر طاہر علی کی گود میں بیٹھ گئے۔

نسیمہ نے پوچھا۔ ابّا۔ اب تو ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤگے؟

صابر۔ اب جائیں گے تو میں اِنہیں پکڑ لوں گا۔ دیکھیں کیسے چلے جاتے ہیں۔

طاہر علی۔ میں تمہارے لئے مٹھائیاں بھی نہیں لایا۔

نسیمہ۔ تم تو ہمارے ابا جان ہو۔ تم نہیں تھے تو چچا نے ہمیں اپنے پاس سے بھگا دیا تھا۔

صابر۔ پنڈا جی نے ہمیں پیسے دئے تھے۔ یاد ہے نا نسیمہ؟

نسیمہ۔ اور سُوہر داس کی جھونپڑی ہیں ہم تم جا کر بیٹھے تو اُس نے ہمیں گڑ کھانے کو دیا تھا۔ مجھے گود میں اُٹھا کر پیار کرتا تھا۔

صابر۔ اُس بیچارے کو ایک صاحب نے گولی ماردی ابا۔ مر گیا۔

نسیمہ۔ یہاں پلٹن آئی تھی ابا۔ ہم لوگ ڈر کے مارے گھر سے نہ نکلتے تھے۔

کیوں صابر؟

صابر۔ نکلتے تو پلٹن والے پکڑ نہ لے جاتے!

بچّے تو باپ کی گود میں بیٹھ کر چہک رہے تھے مگر باپ کا دھیان ان کی طرف نہ تھا۔ وہ ماہر علی سے ملنے کو بیقرار تھے۔ اب موقع پایا تو بچّوں سے مٹھائیاں لانے کا حیلہ کر کے چل کھڑے ہوئے۔ تھانہ میں پہنچ کر پوچھا۔ تو معلوم ہُوا کہ دارو غہ جی اپنے دوستوں کے ساتھ بنگلہ میں رونق افروز ہیں۔ طاہر علی بنگلہ کی طرف چلے جو پھوس کا ایک ہشت پہل جھونپڑا تھا۔ بیلوں سے سجا ہُوا۔ ماہر علی نے برسات میں سونے اور اپنے احباب کی صحبت کا لطف اُٹھانے کے لئے اسے بنوایا تھا۔ چاروں طرف سے ہوا جاتی تھی۔ طاہر علی نے سامنے جا کر دیکھا تو کئی اصحاب مسند لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ بیچ میں اُگالدان رکھا ہُوا تھا۔ خمیرہ تمباکو دھواں دھار اُڑ رہی تھی۔ ایک طشتری میں پان الائچی رکھے ہوئے تھے۔ دو چوکیدار کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ اُس وقت تاش کی بازی ہو رہی تھی۔ درمیان میں مذاق بھی ہونے لگتا تھا۔ طاہر علی کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ یہاں یہ جلسے ہو رہے ہیں۔ یہ عیش کی گرم بازاری ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا نہیں۔ روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں جتنا پان تمباکو میں اُڑ جاتا ہوگا اُتنے میں میرے بال بچّوں کی پرورش ہو جاتی۔ غصّہ سے ہونٹ چبانے لگے۔ خون کھولنے لگا۔ بیدھڑک مجلس میں گھس گئے۔ اور تمہ و غصّہ

سے دیوانہ ہو کر پوچھے۔ ما ہیرا مجھے پہچانتے ہو کون ہوں؟ غور سے دیکھ لو۔ بڑھے ہوئے بالوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں نے میری صورت اتنی نہیں بدل ڈالی ہے کہ پہچانا نہ جا سکوں۔ بدحالی صورت کو نہیں تبدیل کر سکتی۔ دوستو۔ آپ لوگ شاید نہ جانتے ہوں گے۔ میں اس بے وفا۔ دغا باز۔ کمینہ آدمی کا بھائی ہوں۔ اس کے لئے میں نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ میرا خدا جانتا ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو۔ اپنی بیوی کو۔ اپنی ذات کو اس کے لئے مٹا دیا۔ اس کی ماں اور اس کے بھائیوں کے لئے میں نے وہ سب کچھ برداشت کیا جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ اسی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اس کے شوق اور تعلیم کا خرچ ادا کرنے کے لئے میں نے قرض لیا۔ اپنے آقا کے مال میں تصرف کیا اور جیل بھی گیا۔ ان تمام نیکیوں کا صلہ یہ ہے کہ اس کم ظرف نے میرے بال بچوں کی بات بھی نہ پوچھی۔ یہ اسی روز مراد آباد سے آیا جس روز مجھے سزا ہوئی تھی۔ میں نے اسے تانگہ پر آتے دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ میرا بھائی ابھی آ کر میری تشفی کرے گا۔ اور گھر کو سنبھالے گا۔ مگر یہ احسان فراموش سیدھا چلا گیا۔ میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ منہ پھیر لیا۔ اس کے دو چار دن بعد یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ یہاں چلا آیا۔ میرے بچوں کو وہیں ویرانہ چھوڑ دیا۔ یہاں مجلس سجی ہوئی ہے۔ عیش ہو رہا ہے اور وہاں میرے تاریک مکان میں چراغ بتی کی بھی صورت نہیں۔ خدا اگر منصف ہوتا تو اس کے سر پر اس کا قہر بجلی بن کر گرتا۔ لیکن اس نے انصاف کرنا چھوڑ دیا۔ آپ لوگ اس ظالم سے پوچھئے کہ کیا میں اسی بیدردانہ سلوک کا سزاوار تھا؟ کیا اسی دن کے لئے میں نے فقیروں کی سی زندگی بسر کی تھی؟ اس کو شرمندہ کیجئے۔ اس کے چہرہ پر کالکھ لگا دیجئے۔ اس کے منہ پر تھوک دیجئے۔ نہیں۔ آپ لوگ اس کے دوست ہیں۔ مروت کے سبب انصاف نہ کر سکیں گے۔ اب مجھی کو انصاف کرنا پڑے گا۔ خدا گواہ ہے۔ اور خود اس کا دل گواہ ہے کہ آج تک میں نے اسے کبھی تیز نگاہ سے بھی نہیں دیکھا۔ اسے کھلا کر خود فاقہ کیا۔ اسے پہنا کر خود

برہنہ رہا۔ مجھے یاد بھی نہیں آتا کہ میں نے کبھی نئے جوتے پہنے تھے۔ کبھی کپڑے بنوائے تھے۔ اس کے اتارے ہوئے جوتوں اور کپڑوں ہی پر میری بسر ہوتی تھی۔ ایسے ظالم پر اگر خدا کا عذاب نہیں نازل ہوتا تو اس کا سبب یہی ہے کہ خدا نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔

طاہر علی نے تیزی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور قبل اس کے ماہر علی کچھ جواب دیں یا جواب سوچ سکیں طاہر علی نے جھپٹ کر قلمدان اٹھا لیا۔ اس کی سیاہی نکال لی اور ماہر علی کی گردن زور سے پکڑ کر اس سیاہی کو اُن کے چہرہ پر مل دیا۔ پھر تین بار انہیں جھک جھک کر سلام کیا اور آخر میں یہ کہہ کر وہیں بیٹھ گئے۔ میرے ارمان نکل گئے۔ میں نے آج سے سمجھ لیا کہ تم مر گئے۔ اور مجھے تو تم نے پہلے ہی سے مرا ہوا سمجھ لیا ہے بس ہمارے اور تمہارے درمیان اتنا ہی رشتہ تھا۔ آج وہ بھی ٹوٹ گیا۔ میں اپنی تمام تکالیف کا صلہ اور انعام پا گیا۔ اب تمہیں اختیار ہے مجھے گرفتار کرو۔ مارو یا ذلیل کرو۔ میں یہاں مرنے ہی کے لئے آیا ہوں۔ زندگی سے سیر ہو گیا ہوں۔ دنیا رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں اتنی دغا ہے۔ اتنی بیوفائی ہے۔ اتنا حسد ہے۔ اتنا کینہ ہے کہ یہاں زندہ رہ کر کبھی خوشی نہیں حاصل ہو سکتی۔

ماہر علی دم بخود سے بیٹھے رہے۔ مگر اُن کے ایک دوست نے کہا۔ مان لیجئے۔ انہوں نے بیوفائی کی۔ . . . . . .

طاہر علی نے کہا۔ مان کیا لوں صاحب۔ بھگت رہا ہوں۔ صد سالہ ہونا ماننے کی بات نہیں ہے۔

دوست نے کہا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ انہوں نے ضرور بیوفائی کی لیکن آپ بزرگ ہیں۔ یہ حرکت شرافت سے بعید ہے کہ کسی کو سر مجلس بُرا بھلا کہا جائے۔ اور اُس کے چہرے پر سیاہی لگا دی جائے۔

دوسرے دوست نے کہا۔ شرافت سے بعید ہی نہیں ہے دیوانگی ہے۔ ایسے شخص کو پاگل خانہ میں بند کر دینا چاہئے۔

طاہر علی۔ جانتا ہوں۔ اتنا جانتا ہوں کہ شرافت سے لبریز ہے لیکن میں شریف نہیں ہوں۔ پاگل ہوں۔ دیوانہ ہوں۔ شرافت تو آنسوؤں کر آلمصد کی راہ بہہ گئی۔ جس کے بچے گلیوں میں دروازوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہوں۔ جس کی بیوی پڑوسیوں کا آٹا پیس کر اپنا گذر کرے۔ جس کی کوئی خبر لینے والا نہ ہو۔ جس کے رہنے کو گھر نہ ہو۔ جس کے پہننے کو کپڑے نہ ہوں وہ شریف نہیں ہو سکتا اور نہ وہ آدمی شریف ہو سکتا ہے جس نے بے رحم ہاتھوں نے میری یہ گت بنائی۔ اپنے جیل سے لوٹنے والے بھائی کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ اگر شرافت ہے تو یہ بھی شرافت ہے کیوں میاں ماہر! بولتے کیوں نہیں۔ یاد ہے تم نئی اچکن پہنتے تھے اور جب تم اُسے اُتار کر پھینک دیا کرتے تھے تو میں پہن لیا کرتا تھا؟ یاد ہے تمہارے پھٹے جوتے گٹھوا کر میں پہنا کرتا تھا؟ یاد ہے میرا مشاہرہ کل پچیس روپے ماہوار تھا اور وہ سب کا سب میں تمہیں سر اٹھا کے بھیج دیا کرتا تھا۔ یاد ہے؟ دیکھو ذرا میری طرف دیکھو! تمہارے تمباکو کا خرچ میرے بال بچوں کے لئے کافی ہو سکتا تھا! نہیں تم سب کچھ بھول گئے۔ اچھی بات ہے بھول جاؤ۔ نہ میں تمہارا بھائی ہوں نہ تم میرے بھائی ہو۔ میری ساری تکلیفوں کا معاوضہ وہی سیاہی ہے جو تمہارے منہ پر لگی ہوئی ہے۔ لو رخصت۔ اب تم پھر یہ صورت نہ دیکھو گے۔ اب حساب کے دن تمہارا دامن نہ پکڑوں گا۔ تمہارے اوپر میرا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ کہہ کر طاہر علی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس اندھیرے میں جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی چلے گئے۔ جیسے ہوا کا کوئی جھونکا آئے اور نکل جائے۔ ماہر علی نے بڑی دیر کے بعد سر اُٹھایا اور فوراً صابون سے منہ دھو کر تولیہ سے صاف کیا۔ بعدہٗ آئینہ میں منہ دیکھ کر بولے۔ آپ لوگ گواہ رہیں۔ میں ان کو اس حرکت کا مزہ چکھاؤں گا۔

ایک دوست۔ ابھی جانے بھی دیجئے۔ مجھے تو دیوانہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا دوست۔ دیوانہ نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی سمجھداروں

کا کام ہے؟

ماہر علی۔ ہمیشہ سے بیوی کے غلام رہے۔ جس طرف چاہتی ہے ناک پکڑ کر
گھما دیتی ہے۔ آپ لوگوں سے کافی دکھڑا کیا روؤں؟ میری ماں کی بھائیوں کی اور
خود میرے بھائی کے ہاتھوں جو درگت ہوئی ہے وہ کسی دشمن کی بھی نہ ہو۔ کبھی بلا
معاوضہ نصیب ہوتا تھا۔ میری البتہ یہ ذرا خاطر کرتے تھے۔ سمجھتے رہے ہوں گے
کہ اس کے ساتھ ذرا وفا بہ کر دو۔ بس زندگی بھر کے لئے میرا غلام ہو جائے گا۔ ایسی عورت
کے ساتھ نباہ کیونکر ہوتا؟ یہ حضرات تو جیل میں تھے۔ وہاں اُس نے ہم لوگوں کو
فاقے کرانے شروع کئے۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ بڑی مُصیبت میں پڑا۔ وہ تو کہئے۔ دُور
اندیشی کرنے سے یہ آسامی مل گئی۔ ورنہ خدا ہی جانے کہ ہم لوگوں کی کیا حالت
ہوتی۔ ہم بنارس میں تمام دن بیٹھے رہتے تھے۔ اور مٹھائیاں منگا منگا کر کھائی
جاتی تھیں۔ میں ہمیشہ سے ان کا ادب کرتا رہا۔ یہ اسی کا صلہ ہے جو آپ نے عطا
فرمایا ہے۔ آپ لوگوں نے دیکھا کہ میں نے اتنی ذلت گوارا کی مگر سر تک نہیں اٹھایا۔
زبان تک نہیں کھولی۔ نہیں ایک دھکا دیتا تو نہ جانے کتنی قلابازیاں کھا جاتے۔ اب
بھی دعوے کر دوں تو حضرت بندھے بندھے پھریں مگر اس وقت دُنیا یہی کہے گی
کہ بڑے بھائی کو ذلیل کیا۔

ایک دوست۔ جانے بھی دو میاں گھروں میں ایسے جھگڑے ہوتے ہی
رہتے ہیں۔ بھائیوں کی بلا دُور کرو، دونوں کے لئے شرم نہیں ہے۔ لاؤ۔ تاش اٹھاؤ۔
اب تک تو ایک بازی ہو گئی ہوتی۔

ماہر علی۔ قسم کلام شریف کی۔ اماں جان نے اپنے پاس سے دو ہزار روپے
ان لوگوں کو کھلا دیئے۔ ورنہ پچیس روپیوں میں یہ ننھا سا کیا کھا کر سارے
خاندان کا خرچ سنبھالتے۔

ایک کانسٹیبل۔ بھئی۔ گھر گرستی میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ جانے دیجئے۔
جو ہوا سو ہوا۔ وہ بڑے ہیں۔ آپ چھوٹے ہیں۔ دُنیا انہیں کو تھوکے گی۔ آپ

کی بڑائی ہوگی۔

ایک دوست۔ میرا شیر کیسا لپکا ہوتا اور قلمدان سے سیاہی انڈیل کر مل ہی تو دی۔ مانتا ہوں۔

ماہر علی۔ حضرت۔ اس وقت دل نہ جلائیے۔ قسم خدا کی بڑا ملال ہے۔

طاہر علی یہاں سے چلے تو ان کی حالت میں وہ اضطراب نہ تھا۔ دل میں سہمے تھے کہ ناحق اپنی شرافت میں بٹہ لگایا۔ گھر آئے تو کلثوم نے پوچھا! غائب ہو گئے؟ راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں۔ بچے رو کر سو گئے۔ !! آپ پھر چلے گئے۔

طاہر علی۔ ذرا ماہر علی سے ملنے گیا تھا۔

کلثوم۔ اس کی ایسی کیا جلدی تھی؟ کل مل لیتے۔ تمہیں یوں پھٹے حالوں دیکھ کر شرمائے تو نہ ہوں گے؟

طاہر علی۔ میں نے انہیں ایسی سناتی کہ عمر بھر نہ بھولیں گے۔ زبان تک نہ کھلی۔ اسی غصہ میں میں نے اس کے چہرہ پر کالک بھی لگا دی۔

کلثوم اداس ہو گئی۔ بولی — تم نے بڑی نادانی کا کام کیا۔ یہ کالک تم نے اس کے منہ میں نہیں بلکہ اپنے منہ میں لگائی ہے۔ تمہاری زندگی بھر کے کئے دھرے پر سیاہی پھر گئی۔ تم نے اپنی ساری نیکیوں کو ملیامیٹ کر دیا۔ آخر یہ تمہیں سوجھی کیا؟ تم تو اتنے غصہ ور کبھی نہ تھے۔ اتنا صبر نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی ہی تھے۔ ان کی پرورش کی تو کون سی حاتم کی قبر پر لات ماری۔ چھی چھی۔ انسان کسی غیر کے ساتھ بھی نیکی کرتا ہے تو دریا میں ڈال دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ قرض وصول کرتا پھرے۔ تم نے جو کچھ کیا خدا کی راہ میں کیا۔ اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ قرض نہیں دیا تھا کہ معہ سود واپس لے لو۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہنے نہ رکھا۔ ابھی دنیا ان کو ہنستی تھی۔ اب تمہیں ہنسے گی۔ دنیا ہنسے یا نہ ہنسے۔ اس کی پرواہ نہیں۔ اب تک خدا اور رسول کی نظروں میں وہ خطاوار تھے۔ اب تم خطاوار ہو۔

طاہر علی نے نادم ہوکر کہا۔ ملاقات تو ہوگئی مگر میں تو بالکل ذلیل ہوگیا تھا۔
کلثوم بھری مجلس میں انہوں نے سر تک نہ اٹھایا پھر بھی تمہیں غیرت نہ آئی۔
میں تو کہوں گی تم سے کہیں زیادہ شریف وہی ہیں ورنہ تمہاری آبروریزی کرادینا
اُن کے لئے کیا مشکل تھا۔

طاہر علی۔ اب یہی خوف ہے کہ کہیں مجھ پر دعوے نہ کردے۔

کلثوم۔ اُن میں تم سے زیادہ انسانیت ہے!

کلثوم نے اتنا شرمندہ کیا کہ طاہر علی رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔ پھر
بہت منانے پر کھانے کو اُٹھے اور کھا پی کر سو گئے۔ تین روز تک وہ اُسی کوٹھری میں
پڑے رہے۔ کچھ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کہاں جائیں کیا کریں۔ کیسے گزر بسر کریں؟
چوتھے دن گھر سے نوکری کی تلاش میں نکلے مگر کہیں کوئی صورت نہ نکلی۔ یکایک انہیں
سوجھی کہ کیوں نہ جلد بندی کا کام کروں۔ جیل خانہ میں وہ اس کام کو سیکھ گئے تھے۔
ارادہ پختہ ہوگیا۔ کلثوم نے بھی پسند کیا۔ یہاں سے تھوڑا لے لے گا۔ کسی کے غلام تو نہ
رہو گے۔ سند کی ضرورت نوکری ہی کے لئے ہے۔ وہاں جیل سے آئے ہوؤں کا گزر
نہیں۔ پیشہ وروں کے لئے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ اُن کا کام ہی اُن کی سند
ہے۔ چوتھے روز طاہر علی نے وہ مکان چھوڑ دیا اور شہر کے دوسرے محلہ میں ایک
چھوٹا سا مکان لے کر جلد بندی کا کام کرنے لگے۔

اُن کی بنائی ہوئی جلدیں بہت خوبصورت اور مضبوط ہوتی ہیں۔ کام کی کمی نہیں
ہے۔ سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ انہوں نے اب دو تین جلد سازوں کو نوکر رکھ لیا
ہے اور شام تک دو تین روپے کی مزدوری کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی اتنے مرفہ حال نہ تھے۔

(۴۸)

بنارس کے میونسپل بورڈ میں مختلف سیاسی عقاید کے لوگ موجود تھے۔ بادشاہت
سے لے کر جمہوریت تک سبھی خیالات کے لوگ تھے۔ ابھی تک دولت و ثروت

کا اول بالا تھا۔ مہاجنوں اور رئیسوں کی کثرت تھی۔ جمہوریت پسند فرقہ کمزور تھا۔ اُسے سر اُٹھانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ راجہ مہیندر کمار کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی اُن کی مخالفت نہ کر سکتا تھا۔ مگر پانسے پور کے ستیاگرہ نے جمہوریت پسندوں میں ایک تنظیم اجتماعی قوت پیدا کر دی۔ اُس سانحہ کا سارا الزام راجہ صاحب پر عاید کیا جانے لگا۔ تحریک شروع ہوئی کہ ان پر بد اعتقادی کی تجویز پیش کی جائے۔ تحریک روز بروز زور پکڑنے لگی۔ جمہوریت کے حامیوں نے طے کر لیا کہ موجودہ انتظام کا خاتمہ کر دینا چاہیئے جس کی وجہ سے عوام کو اتنی مصیبت برداشت کرنی پڑی۔ راجہ صاحب کے لئے یہ ایک سخت امتحان کا موقع تھا۔ ایک طرف تو حکام اُن سے بدظن تھے۔ دوسری طرف یہ مخالف جماعت اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی مشکل میں پھنسے۔ انہوں نے جمہوریت پسندوں کی مدد سے حکام کی مخالفت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اُن کے سیاسی عقائد میں بھی کچھ تغیر واقع ہو گیا تھا۔ وہ عوام کو ساتھ لے کر میونسپلٹی کا کام کرنا چاہتے تھے۔ پر اب کیا ہو؟ اس تجویز کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ جمہوریت پسند طبقے کے رہنماؤں سے ملے۔ اُن کی بہت کچھ تشفی کی کہ آیندہ اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہوگا۔ اِدھر اپنی جماعت کو بھی مضبوط کرنے لگے۔ جمہوری خیالات والوں کو وہ ہمیشہ سے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے لیکن اب مجبوراً انہیں کی خوشامد کرنی پڑی۔ وہ جانتے تھے کہ بورڈ میں یہ تجویز رکھ دی گئی تو اُس کا منظور ہو جانا یقینی ہے۔ خود دوڑتے تھے۔ اپنے دوستوں کو بھی دوڑاتے تھے کہ کسی طرح یہ بلا سر سے دور ہو۔ مگر پانسے پور کے جلاوطنوں کا تمام شہر میں رونا ہی اُن کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیتا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے۔ ہمیں کیونکر یقین ہو کہ ایسی حالت میں آپ پھر ایسی خودسری سے کام نہ کریں گے۔ شوروداس ہمارے شہر کا ایک رتن (جواہر) تھا۔ وہ [illegible] اور خدمت انسانی جماعت کے دو رتن تھے۔ ان کا خون اُس کی گردن پر ہے۔

بالآخر وہ تجویز حسب ضابطہ بورڈ میں پیش ہی کر دی گئی۔ اُس روز تڑکے

صاحب نے بھی اسی وقت استعفیٰ دے دیا۔ جب وہ بورڈ کے کمرہ سے باہر نکلے تو
عوام نے جنہیں ان کی تقریر سننے کا موقعہ نہ ملا تھا ان پر اتنی پھبتیاں اڑائیں اتنی
تالیاں بجائیں کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے موٹر تک پہنچ سکے۔ پولیس نے کافی انتظام
نہ کیا ہوتا تو ضرور فساد ہو جاتا۔ راجہ صاحب نے ایک بار گھوم کر بورڈ کے کمرہ کو
آبدیدہ ہو کر دیکھا اور چل گئے۔ نیک نام ہونا ان کی زندگی کا خاص مقصد تھا۔
اور اسی کا یاس انگیز نتیجہ تھا۔ زندگی بھر کے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ نیک
نامی۔ ساری عزت۔ ساری شہرت عوام کے غصہ کے سیلاب میں بہہ گئی!
راجہ صاحب وہاں سے چلے گئے گھر گئے تو دیکھا کہ اندو اور صوفیا دونوں بیٹھی
ہوئی باتیں کر رہی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی اندو بولی — مس صوفیا سورداس کا مجسمہ
نصب کرنے کے لئے چندہ جمع کر رہی ہیں۔ آپ بھی تو اس کی جانبازی کے مداح
تھے۔ کتنا دیجئے گا؟

صوفیا۔ اندو رانی نے ایک ہزار روپے دئے ہیں اور اس کے دوگنے سے
کم دینا آپ کے لئے نازیبا ہوگا۔

مہیندر کمار۔ میں اس کا جواب سوچ کر دوں گا۔

صوفیا۔ میں پھر کب آؤں؟

مہیندر کمار نے لاپرواہی سے کہا۔ آپ کے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں
خود بھیج دوں گا۔

صوفیا ان کے چہرہ کی طرف دیکھا ... خوش ہو کر چلی گئی۔ تو راجہ
صاحب نے اندو سے کہا۔ تم مجھ سے بلا پوچھے ایسا کام کیوں کرتی ہو جس سے میری
سراسر ہتک ہوتی ہے؟ میں تمہیں کتنی بار سمجھا کر ہار گیا۔ آج اسی اندھے کی بدولت
مجھے منہ کی کھانی پڑی۔ بورڈ نے مجھ پر بے اعتمادی کا رزولیوشن پاس کر دیا اور اسی کے
مجسمہ کے لئے تم نے چندہ دیا اور مجھے بھی دینے کو کہہ رہی ہو۔

اندو۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بورڈ میں کیا ہو رہا ہے۔ آپ نے بھی تو کہا تھا کہ اس

رزولیوشن کے پاس ہونے کا امکان نہیں ہے۔

راجہ۔ کچھ نہیں۔ تم مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو۔

اندو۔ آپ اس روز سوراج کی تعریف کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ چندہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں کسی کے دل کی بات تھوڑا ہی جانتی ہوں۔ آخر وہ رزولیوشن پاس کیسے ہو گیا۔

راجہ۔ اب میں کیا جانوں کیسے پاس ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاس ہو گیا۔ ہمیشہ سبھی کام اپنی مرضی یا امید کے موافق تو ہوا نہیں کرتے۔ جن لوگوں پر میرا کامل اعتماد تھا انہیں نے دغا کی۔ وہ پھوٹ [illegible] آئے ہی نہیں۔ میں اتنا تنگ مزاج نہیں ہوں کہ جس کے سبب میری ذلت ہوئی اسی کی [illegible] میں حتی الامکان اس تحریک کو سرسبز نہ ہونے دوں گا [illegible] کو [illegible] میں [illegible] کو ایسا جبر کروں گا کہ مجسٹریٹ سبب نہ ہونے پائے [illegible] کو نفع پہنچانے کی طاقت ہے یا نہ ہو۔ پر نقصان پہنچانے کی طاقت ہے اور [illegible] روز بروز بڑھتی جانے کی۔ تم بھی اپنا چندہ واپس لے لو۔

اندو۔ (متحیر ہو کر) دئے ہوئے روپے واپس کر لوں؟

راجہ۔ ہاں اس میں کوئی حرج نہیں۔

اندو۔ آپ کو کوئی حرج نہ معلوم ہوتا ہو میری تو اس میں سراسر ذلت ہے۔

راجہ۔ جس طرح تمہیں میری ذلت کی پرواہ نہیں اسی طرح اگر میں بھی تمہاری ذلت کی پرواہ نہ کروں تو کوئی بے انصافی نہ ہو گی۔

اندو۔ میں آپ سے روپے تو نہیں مانگتی۔

بات پر بات نکلنے لگی۔ جھگڑا کر رد و کد پر نوبت پہنچی۔ پھر طنز کی باری آئی حتیٰ کہ ایک لمحہ میں بدزبانی ہونے لگی۔ اپنے اپنے خیال کے مطابق دونوں حق پر تھے۔ اس لئے کوئی نہ دبتا تھا۔

راجہ صاحب نے کہا نہ جانے وہ کون سا دن ہو گا کہ مجھے تم سے نجات ملے گی۔ موت کے سوا شاید اب کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

اندو۔ آپ کو اپنی عزت دنیا ہی مبارک رہے۔ میرا بھی ایشور مالک ہے۔ میں بھی زندگی
سے تنگ آگئی۔ کہاں تک لونڈی بنوں؟ اب حد ہو گئی۔

راجہ۔ تم میری لونڈی بنو گی! وہ دوسری قسم کی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے شوہر پر اپنی جان
نچھاور کر دیتی ہیں۔ تمہارا بس چلے تو مجھے زہر دے دو اور دے ہی رکھا ہو۔ اس سے بڑھ کر اور
کیا ہو گا؟

اندو۔ یہ زہر کیوں اگلتے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میرے گھر سے نکل جا۔
جانتی ہوں کہ آپ کو میرا رہنا شاق گزرتا ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے جانتی ہوں۔ اسی دن
جان گئی تھی جب میں نے ایک مہری کو اپنی ساڑی دے دی تھی اور آپ نے مہابھارت مچا دیا تھا۔
اسی دن سمجھ گئی تھی کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ جتنے دن یہاں رہی کبھی آپ نے یہ سمجھنے نہ دیا
کہ یہ میرا گھر ہے۔ پیسے پیسے کا حساب دے کر بھی گلا نہیں چھوٹا۔ شاید آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ
میرے ہی روپے کو اپنا کہہ کر من مانا خرچ کرتی ہے اور یہاں آپ کا ایک دھیلا چھونے کی قسم کھاتی
ہوں۔ آپ کے ساتھ بیاہ ہوا ہے آپ کے ہاتھوں کچھ اپنا ضمیر نہیں فروخت کر دیا۔

مہیندر نے ہونٹ چبا کر کہا۔ بھگوان سب دکھ دے پر نہرے کا ساتھ نہ دے۔ موت بھلے
ہی دے دے۔ تم جیسی عورت کا گلا گھونٹ دینا بھی ثواب میں داخل ہے۔ اس حکومت کی خیریت مناؤ
کہ چین کر رہی ہو۔ اپنی حکومت ہوتی تو قینچی سی چلنے والی زبان تالو سے کھینچ لیتا۔

اندو۔ اچھا اب چپ رہئے بہت ہو گیا۔ میں آپ کی گالیاں سننے نہیں آئی ہوں۔ یہ لیجئے اپنا
گھر۔ خوب پیر پھیلا کر سوئیے۔

راجہ۔ جاؤ۔ کسی طرح دفان بھی ہو۔ بلی بخشے چوہا اکیلا ہی بھلا۔

اندو نے دبی زبان سے کہا۔ یہاں کون تمہارے لئے دیوانہ ہو رہا ہے۔

راجہ نے غضبناک ہو کر کہا۔ گالیاں دے رہی ہو۔ زبان کھینچ لوں گا۔

اندو جانے کے لئے دروازے تک گئی تھی۔ یہ دھمکی سن کر لوٹ پڑی۔ اور شیرنی کی طرح پھر کر بولی۔
اس بھروسے پر نہ رہئے گا۔ بھائی مر گیا ہے تو کیا گھر کا باپ تو بیٹھا ہے۔ سر کے بال نہ بچیں گے۔ ایسے
ہی بھلے مانس ہوتے تو دنیا میں اتنا اپجس رسوائی کیسے کماتے؟

یہ کہہ کر اندو اپنے کمرہ میں گئی۔ اُن چیزوں کو سمیٹا جو اُسے مائکے میں ملی تھیں۔ وہ سب چیزیں الگ کر دیں جو یہاں کی تھیں۔ فکر نہ تھی، غم نہ تھا۔ ایک آگ تھی جو اُس کے نازک جسم میں زہر کی طرح پھیل رہی تھی۔ منہ سُرخ تھا، آنکھیں سُرخ تھیں۔ روئیں روئیں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ ذلت ایک آتشیں شے ہے۔

اپنی سب چیزیں سنبھال کر اندو نے اپنی خاص گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ جب تک گاڑی تیار ہوئی تب تک وہ برآمدہ میں ٹہلتی رہی۔ جیوں ہی پھاٹک پر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی، وہ آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ جس گھر کی وہ رانی تھی، جسے وہ اپنا سمجھتی تھی، جس میں کہیں ذرا سا کوڑا اُجاڑ دیکھ کر وہ نوکروں کے سر ہو جاتی تھی، اُسی گھر سے وہ اس طرح نکلی جیسے روح قالب سے۔ اُسی قالب سے جس کی وہ ہمیشہ حفاظت کرتی تھی اور جس کی ذرا ذرا سی تکلیف سے خود بے چین ہو جاتی تھی۔ کسی سے کچھ نہ کہا اور نہ کسی کی ہمت پڑی کہ اُس سے کچھ پوچھے۔ اُس کے چلے جانے کے بعد مہراجن نے جا کر مہیندر سے کہا، سرکار، رانی جی نہ جانے کہاں چلی گئیں۔

مہیندر نے اُس کی طرف گھور کر کہا۔ جانے دو۔

مہراجن۔ سرکار، صندوق اور صندوقچے لئے جاتی ہیں۔

مہیندر۔ کہہ دیا، جانے دو۔

مہراجن۔ سرکار روٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی دور نہ گئی ہوں گی۔ آپ منا لیں۔

مہیندر۔ میرا سر نہ کھا۔

اندو اپنا سب سامان لئے ہوئے سیوا بھون پہنچی تو جاہنوی نے کہا، تم لڑ کر آ رہی ہو۔ کیوں؟

اندو۔ کوئی اپنے گھر نہ رہنے دے تو کیا زبردستی ہے؟

جاہنوی۔ صوفیا نے آتے ہی آتے مجھ سے کہا تھا، آج خیریت نہیں ہے۔

اندو۔ میں لونڈی بن کر نہیں رہ سکتی۔

جاہنوی۔ تم نے ان سے بلا پوچھے چندہ کیوں لکھا؟

اندو۔ میں نے کسی کے ہاتھوں اپنا ضمیر نہیں بیچا۔

جانھوی۔ جو استری اپنے پُرش کی چنتا کرتی ہے اُسے لوک پرلوک کہیں شانتی نہیں مل سکتی۔

اندو۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ یہاں سے بھی چلی جاؤں؟ میرے زخم پر نمک نہ چھڑکیے۔

جانھوی پچھتاؤ گی اور کیا۔ سمجھاتے سمجھاتے ہار گئی پر تم نے اپنی ہٹ نہ چھوڑی۔

اندو یہاں سے اُٹھ کر صوفیا کے کمرہ میں چلی گئی۔ ماں کی باتیں اُسے زہر سی لگیں۔

یہ جھگڑا اب ازدواجی دائرہ سے نکل کر سیاسی دائرہ میں پہنچا۔ مہندر کمار اُدھر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے اور صوبہ کی گورنمنٹ کو بھی اُبھار رہے تھے۔ اِدھر اندو صوفیا کے ساتھ چندہ وصول کرنے میں مصروف تھی۔ مسٹر کلارک ابھی تک راجہ صاحب سے کینہ رکھتے تھے۔ اپنی ذلت بھولے نہ تھے۔ انہوں نے عوام کی اس تحریک میں دست اندازی کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ صاحب کی ایک نہ چلی۔ چندہ کثرت سے وصول ہونے لگا۔ ایک ماہ میں ایک لاکھ سے زیادہ آ گیا۔ کسی پر کسی طرح کا دباؤ نہ تھا۔ کسی سے کوئی سفارش نہ کرتا تھا۔ دونوں دیویوں کی کوششوں کا معجزہ تھا۔ نہیں اُن شہیدوں کی جانبازی کی کرامات تھی۔ جنہیں یاد کر کے لوگ ابھی رو دیا کرتے تھے۔ لوگ خود آ کر چندہ دیتے تھے۔ اور اپنی حیثیت سے زیادہ مسٹر جان سیوک نے بھی اپنی خوشی سے ایک ہزار روپے دیئے۔ اندو نے اپنا چندہ ایک ہزار تو دیا تھا۔ اب اپنے کچھ قیمتی زیورات بھی دے ڈالے جو بیس ہزار کو فروخت ہوئے۔ راجہ صاحب کے دل پر سانپ سا لوٹتا رہتا تھا۔ پہلے پوشیدہ پھر علانیہ طور سے مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ گورنر کے پاس خود گئے۔ سودا کو بھڑکایا۔ سب کچھ کیا مگر جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا

چھ مہینے گذر گئے۔ سورداس کا مجسمہ بن کر آ گیا۔ پونا کے ایک مشہور کاریگر نے اُسے ایک قومی خدمت سمجھ کر بنا دیا تھا۔ اُسے پانڈے پور میں نصب کرنے کی تجویز تھی۔ جان سیوک نے بخوشی اجازت دے دی۔ جہاں سورداس کا جھونپڑا تھا وہیں اُسے نصب کیا گیا۔ نیک ناموں کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے انسانوں کے پاس اور کون سا ذریعہ ہے؟ اشوک کی یاد بھی تو اُس کے سنگین ستونوں کی تحریروں سے تازہ ہے۔ والمیک

وہاں۔ ہومر اور فردوسی سب کو تو نہیں ملتے !

چاندے پور میں بڑی دھوم دھام سے جلسہ ہو رہا تھا۔ شہر کے لوگ اپنے کام چھوڑ کر اس میں شامل ہوئے تھے۔ رانی جانکی نے اس مجسمہ کو قائم کیا۔ اس کے بعد دیر تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ پھر قومی رہنماؤں کی پر اثر تقریریں ہوئیں اور پہلوانوں نے اپنے کرتب دکھائے۔ شام کو ایک دعوت دی گئی۔ چھوت اور اچھوت ایک قطار میں بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے۔ یہ سورداس کی سب سے بڑی فتح تھی۔ رات کو ایک ناٹک منڈلی (جماعت) نے سورداس نامی ناٹک کھیلا جس میں سورداس ہی کے حالات بیان کئے گئے تھے۔ پربھو سیوک نے انگلستان سے یہ ناٹک بنا کر اسی موقع کے لئے بھیجا تھا۔ بارہ بجتے بجتے جلسہ ختم ہوا۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ وہاں سناٹا چھا گیا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور اس کی اجلی روشنی میں سورداس کی مورت ایک ہاتھ میں لکڑی ٹیکتی ہوئی اور دوسرا ہاتھ کسی غیبی داتا کے سامنے پھیلائے کھڑی تھی۔ وہی کمزور جسم تھا۔ ہنسلیاں نکلی ہوئیں کمر جھکی ہوئی۔ چہرہ پر مسکینی اور سادگی چھائی ہوئی مجسم سورداس معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ متحرک تھا اور یہ ساکن۔ وہ گویا تھا اور یہ خاموش۔ اور بنانے والے نے اس میں ایک ایسی محبت کی روح بھر دی تھی جس کا اصل میں پتہ نہ تھا بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بیکنٹھ کا بھکاری دیوتاؤں سے سنسار کے کلیان کی بھیک مانگ رہا تھا !

آدھی رات گزر چکی تھی۔ ایک شخص سائیکل پر سوار ہو کر مجسمہ کے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی اوزار تھا۔ اس نے لمحہ بھر تو مورت کو سر سے پیر تک دیکھا۔ اور پھر اسی اوزار سے اس پر وار کیا۔ تڑاق کی آواز ہوئی اور وہ سنگین بت دھماکے کے ساتھ زمین پر آ گرا اور اسی شخص پر جس نے اسے توڑا تھا۔ وہ شاید دوسرا وار کرنے والا تھا کہ اتنے میں بت گر پڑا۔ وہ بھاگ نہ سکا۔ اسی کے نیچے دب گیا۔ صبح لوگوں نے دیکھا تو راجہ مہیندر کمار سنگھ تھے۔ سارے شہر میں خبر پھیل گئی کہ راجہ

صاحب نے سُور داس کی مُورت توڑ ڈالی اور خود اُسی کے نیچے دب گئے۔ جب تک جیا
سُور داس کے ساتھ دُشمنی رکھی اور اُس کے مرنے پر بھی دُشمنی نہ چھوڑی۔ ایسے حاسد
انسان بھی ہوتے ہیں۔ ایشور نے اُس کا پھل بھی فوراً دے دیا۔ جب تک جئے۔
سُور داس سے نیچا دیکھا اور مرے بھی تو اُسی مجسمے کے نیچے دب کر۔ دُشمن تو ہم قاتل۔
مکّار۔ دغا باز اور اس سے بھی زیادہ ثقیل الفاظ میں اُن کا ذکر کیا گیا
کاریگروں نے پھر مسالہ سے مورت کے پیر جوڑے اور اُسے کھڑا کیا لیکن اُس
ضرب کے نشانات ابھی تک پیروں پر بنے ہوئے ہیں۔ اور چہرہ بھی بگڑ گیا ہے۔

(۴۹)

ادھر سُور داس کی یادگار قائم کرنے کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔ اُدھر قُلیوں
کے مکانات کی سنگ بنیاد رکھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شہر کے معززین مدعو
کئے گئے تھے۔ صوبہ کے گورنر سے سنگِ بنیاد رکھنے کی استدعا کی گئی تھی۔ ایک
گارڈن پارٹی ہونے والی تھی۔ گورنر صاحب کو ایڈریس دیا جانے والا تھا۔ مسز سیوک
دل و جان سے تیاریاں کر رہی تھیں۔ بنگلہ کی صفائی اور آرائش ہو رہی تھی۔ جھالریں
وغیرہ بنائی جا رہی تھیں۔ انگریزی بینڈ بُلایا گیا تھا۔ مسٹر کلارک نے سرکاری
اہلکاروں کو مسز سیوک کی مدد کے لئے تعینات کر دیا تھا اور خود بھی چاروں طرف
دوڑتے پھرتے تھے۔
مسز سیوک کے دل میں اب ایک نئی اُمید پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ونے سنگھ
کی موت سے صوفیا اب مسٹر کلارک کی طرف متوجہ ہو۔ اس لئے وہ مسٹر کلارک
کی اور بھی خاطر و مدارت کر رہی تھیں۔ صوفیا کو خود جا کر ساتھ لانے کا قصد کر چکی
تھیں۔ جیسے بنے گا ویسے لاؤں گی۔ خوشی سے نہ آئے گی تو جبراً لاؤں گی۔ رووُں گی۔
پیروں پڑوں گی اور بغیر ساتھ لائے۔ اُس کا گلا نہ چھوڑوں گی۔
مسٹر جان سیوک کمپنی کی سالانہ رپورٹ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ سال

گذشتہ کا منافع ظاہر کرنے کے لئے اُنہوں نے اِسی موقع کو پسند کیا تھا۔ اگر واقعی منافع بہت کم ہوا تھا۔ مگر مجمع عام میں مسٹر سیوک وعزاز تعریف کہ کہ وہ اُمید سے بڑھ کر منافع دکھلانا چاہتے تھے کہ کمپنی کے حصص کا نرخ چڑھ جائے اور لوگ اُن پر ٹوٹ پڑیں۔ اِدھر کے نقصان کو وہ اِس حکمت سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ کلرکوں کو رات رات بھر کام کرنا پڑتا تھا اور خود مسٹر سیوک حساب کے بنانے میں اُس سے کہیں زیادہ محنت کر رہے تھے جتنا کہ جلسہ کی تیاری میں۔

لیکن مسٹر ایشور سیوک کو یہ تیاریاں جنہیں وہ فضول خرچی سمجھتے تھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ بار بار جھنجھلاتے تھے۔ بیچارے بوڑھے آدمی کو صبح سے شام تک بسر کھپاتے گزرتا تھا۔ کبھی بیٹے پر جھلاتے، کبھی بہو پر، کبھی منتظموں پر، بھی ملازموں پر۔ یہ پانچ من برف کی کیا ضرورت ہے؟ کیا لوگ اس میں نہائیں گے؟ من بھر کافی تھی۔ کام تو نصف من سے ہی چل سکتا تھا۔ اتنی شراب کی کیا ضرورت؟ کوئی پرنالہ بہانا ہے یا مہمانوں کو پلا کر اُن کی جان لینا ہے؟ اس سے کیا فائدہ کہ لوگ پی پی کر بدمست ہو جائیں اور آپس میں جوتی پیزار ہونے لگے؟ لگا دو گھر میں آگ یا مجھی کو زہر دے دو پھر نہ زندہ رہوں گا نہ جلن ہوگی۔ خداوند یسوع مجھے اپنے دامن میں لے۔ اس اندھیر کا کچھ ٹھکانا ہے۔ فوجی بینڈ کی کیا ضرورت؟ کیا گورنر کوئی بچہ ہے جو باجہ سن کر خوش ہوگا یا شہر کے رؤسا باجہ کے بھوکے ہیں۔ یہ آتشبازیاں کیا ہوں گی؟ غضب خدا کا! ایک سرے سے سب بھنگ پی گئے ہیں؟ گورنر کا خیر مقدم ہے یا بچوں کا کھیل؟ پٹاخے اور چھچھوندریں کس کو خوش کریں گی؟ مانا کہ پٹاخے اور چھچھوندریں نہ ہوں گی۔ انگریزی آتشبازی ہوگی مگر کیا گورنر نے آتشبازی نہیں دیکھی؟ فضول کام کرنے سے کیا مطلب؟ کسی غریب کا گھر جل جائے۔ کوئی اور حادثہ ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ ہندوستانی رئیسوں کے لئے یہ پھل میوے اور مربے مٹھائیاں منگانے کی کیا ضرورت؟ وہ ایسے مربھوکے نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ایک ایک سگریٹ کافی تھا۔ ہاں پان الائچی کا بندوبست اور کر دیا جاتا بس۔

وہ یہاں کوئی دعوت کھانے تو آئیں گے نہیں۔ کمپنی کی سالانہ رپورٹ سننے آئیں گے۔
اے احسان فراموش! ایسا نہ ہو کہ میں تیرا سر توڑ کر رکھ دوں۔ جو بیوہ پگلی (مسز
سیوک) کہتی ہے تو وہی کرتا ہے۔ تجھے بھی کچھ تمیز ہے کہ نہیں؟ جانتا ہے آج کل
چار روپے سیر انگور ملتے ہیں۔ اُن کی مطلق ضرورت نہیں۔ خبردار جو یہاں انگور آئے
خلاصہ یہ کہ کئی دنوں کی لگاتار بکواس سے اُن کی طبیعت کچھ خراب سی ہو رہی تھی۔ کوئی
ان کی شکایت نہ تھا۔ سب معاف کرتے تھے۔ جب وہ بکتے بکتے تھک جاتے تو منہ کر
باغ چلے جاتے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر آ پہنچتے اور پہلے کی طرح لوگوں پر بگڑنے لگتے۔
یہاں تک کہ جلسہ کے ایک ہفتہ قبل جب مسٹر جان سیوک نے یہ تجویز کیا کہ گھر کے سب
نوکروں اور کارخانہ کے چپڑاسیوں کو اگلے دن کی نئی وردیاں دی جائیں تو مسٹر ایشور
سیوک نے غصے کے مارے وہ انجیل جسے وہ ہاتھ میں لئے ہوئے ظاہرا عینک کی مدد
سے مگر دراصل اپنے حافظہ سے پڑھ رہے تھے اپنے سر پٹک لی اور بولے — یا خدا مجھے
اس جنجال سے نکال! سر دیوار کے قریب تھا۔ یہ دھکا لگا تو دیوار سے ٹکرا گیا۔ نوے
برس کی عمر۔ کمزور جسم (وہ تو کہو پرانی ہڈیاں تھیں جو کام دیتی تھیں) بیہوش ہو گئے
دماغ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا۔ آنکھیں نکل آئیں۔ ہونٹ کھل گئے اور
جب تک لوگ ڈاکٹروں کو بلائیں اُن کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ خدا
نے اُن کی آخری دعا قبول کر لی۔ انہیں اس جنجال سے نکال لیا۔ یقینی طور سے نہیں
کہا جا سکتا کہ اُن کی موت کا خاص سبب کیا تھا۔ چوٹ کا صدمہ یا فاقی تفکرات
کا صدمہ۔

صوفیا نے یہ خبر سُنی تو اُس کی کشیدگی جاتی رہی۔ اپنے گھر میں اب اگر کسی کو
اُس سے محبت تھی تو وہ ایشور سیوک ہی تھے۔ صوفیا کو بھی اُن سے عقیدت تھی۔ اُس
نے فوراً ماتمی لباس پہنا اور اپنے گھر گئی۔ مسز سیوک دوڑ کر اُس سے گلے ملیں اور
ماں بیٹی نے مل کر ایشور سیوک کی لاش پر خوب آنسو بہائے۔
رات کو جب ماتمی دعوت ختم ہوئی اور لوگ اپنے اپنے گھر گئے تو مسز سیوک

نے صوفیا سے کہا۔ بیٹی تم اپنا گھر رہتے ہوئے دوسری جگہ رہتی ہو۔ کیا یہ ہمارے
لئے شرم و افسوس کی بات نہیں ہے؟ یہاں اب تمہارے سوا اور کون وارث ہے؟
پربھو کا اب کیا ٹھکانہ کہ گھر آئے یا نہ آئے۔ اب تو جو کچھ ہو تمہیں ہو۔ ہم نے اگر سخت
بات کہی ہوگی تو تمہارے بھلے کے لئے۔ میں کچھ تمہاری دشمن تو ہوں نہیں۔ اب
اپنے گھر میں رہو۔ یوں آنے جانے کے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ رانی صاحبہ سے
مل آیا کرو، پر رہو یہیں۔ خدا نے اور تو سب ارمان پورے کر دیئے۔ تمہاری شادی
بھی ہو جاتی تو بے فکر ہو جاتی۔ پر دیکھو جب آتا دیکھی جاتی۔ اتنے دنوں کا ماتم کم
نہیں ہوتا۔ اب وقت گزارنا مناسب نہیں۔ میری خواہش ہے کہ اب کی تمہاری
شادی ہو جائے اور گرمیوں میں ہم سب دو تین ماہ کے لئے منصوری چلیں۔

صوفیا نے کہا۔ جیسی آپ کی مرضی کروں گی۔

ماں۔ اور کیا صوفی۔ زمانہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ ہماری زندگی کا کیا
بھروسہ۔ تمہارے بڑے پاپا یہ ارمان لئے ہی چلے گئے۔ تو میں تیاری کروں؟

صوفیا۔ کہہ تو رہی ہوں۔

ماں۔ تمہارے پاپا سن کر پھولے نہ سمائیں گے۔ کنور ونے سنگھ کی میں
برائی نہیں کرتی۔ بڑا جوانمرد تھا مگر بیٹی اپنے ہم مذہب شخص کی بات ہی کچھ اور
ہے۔

صوفیا۔ ہاں اور کیا۔

ماں۔ تو اب رانی جاہنوی کے یہاں نہ جاؤ گی نہ؟

صوفیا۔ جی نہیں۔ نہ جاؤں گی۔

ماں۔ آدمیوں سے کہہ دوں۔ تمہاری چیزیں اٹھا لائیں؟

صوفیا۔ کل رانی صاحبہ خود ہی بھیج دیں گی۔

مسز سیوک خوش خوش دعوت کا کمرہ صاف کرنے لگیں۔ مسٹر کلارک
ابھی وہیں تھے۔ انہیں بھی یہ مژدہ سنایا۔ سن کر پھڑک اٹھے۔ باچھیں کھل

کھل گئیں۔ وہ ڈرتے ہوئے صوفیا کے پاس گئے اور بولے " صوفیا۔ تم نے مجھے زندہ کر دیا۔ آہا۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ مگر تم ایک بار اپنے منہ سے میرے سامنے کہہ دو۔ تم اپنا وعدہ پورا کرو گی؟"

صوفیا۔ کروں گی۔

ابھی بہت سے لوگ موجود تھے پس مسٹر کلارک صوفیا کو پیار نہ کر سکے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے اور ہوائی قلعے بناتے اپنے گھر گئے۔

علی الصباح صوفیا کا اپنے کمرہ میں پتہ نہ تھا۔ تلاش شروع ہوئی۔ مالی نے کہا کہ میں نے انہیں جاتے تو نہیں دیکھا پر جب یہاں سب لوگ سو گئے تھے تو ایک بار پھاٹک کھلنے کی آواز آئی تھی۔ لوگوں نے سمجھا کہ کنور بھرت سنگھ کے یہاں گئی ہوگی۔ فوراً ایک آدمی بھیجا گیا۔ لیکن وہاں بھی پتہ نہ تھا۔ بڑی ہل چل مچی۔ کہاں گئی؟

جان سیوک۔ تم نے رات کو کچھ کہا سنا تو نہیں تھا؟

مسز سیوک۔ رات کو تو شادی کی بات چیت ہوتی رہی۔ مجھ سے تیاریاں کرنے کو بھی کہا۔ خوش خوش سوئی۔

جان سیوک۔ تمہاری سمجھ کا قصور تھا۔ اس نے تو اپنے دل کی بات ظاہر کر دی۔ تم کو جتا دیا کہ میں کل نہ ہوں گی۔ جانتی ہو۔ شادی سے اس کا مطلب کیا تھا؟ فدا ہو جانا! اب مرنے سے اس کی شادی ہوگی جو یہاں نہ ہو سکی وہ بہشت میں ہوگی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ تم نے رات کو شادی کا تذکرہ چھیڑ کر اُسے خوف زدہ کر دیا۔ جو بات کچھ دنوں میں ہوتی وہ آج ہی ہو گئی۔ اب جتنا رونا ہو رو لو۔ میں تو پہلے ہی رو چکا ہوں۔

اتنے میں رانی جاہنوی آئیں۔ آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ایک خط مسز سیوک کے ہاتھ میں رکھ دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

یہ صوفیا کا خط تھا۔ ابھی ڈاکیہ نے دیا تھا۔ لکھا تھا:۔

"مادرِ محترمہ۔ آپ کی صوفیا آج دنیا سے رخصت ہو رہی ہے۔ جب وِنے نہ رہے تو یہاں میں کس کے لئے رہوں؟ اتنے روز تک دل کو تسکین دینے کی کوشش کرتی رہی۔ سمجھتی تھی کہ کتب کے مطالعہ میں اس دُکھ بھری یاد کو غرق کر دوں گی اور اپنی زندگی کو خدمتی فرائض کی انجام دہی میں گزار دوں گی۔ مگر میرا پیارا وِنے مجھے بلا رہا ہے۔ میرے بغیر اُسے وہاں ایک لمحہ بھی چین نہیں ہے۔ اُس سے ملنے جاتی ہوں یہ جسم ہی میرے اور اُن کے درمیان میں حائل ہے۔ اسے میں یہیں چھوڑ دوں گی۔ اسے میں گنگا کو سونپے دیتی ہوں۔ میرا دل بشاش ہے۔ پیر اُٹھے جا رہے ہیں۔ خوشی رگ رگ میں سما رہی ہے۔ اب جلد ہی مجھے وِنے کے درشن ہوں گے۔ آپ میرے لئے غم نہ کیجئے گا۔ مجھے کھوجنے کی بے فائدہ کوشش بھی نہ کیجئے گا کیونکہ جب تک یہ خط آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا صوفیا کا سر وِنے کے قدموں پر ہوگا۔ مجھے ایک زبردست طاقت کھینچے لئے جا رہی ہے اور بیڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ ماما اور پاپا سے کہہ دیجئے گا۔ کہ صوفیا کا بیاہ ہو گیا۔ اب اُس کی فکر نہ کریں۔"

خط کے ختم ہوتے ہی مسز سیوک دیوانہ وار کرخت لہجہ میں بولیں۔ "تمہیں لیس کی کانٹہ ہو۔ میری زندگی کو برباد کرنے والی میری اُمیدوں کو پامال کرنے والی میری عزت بگاڑنے والی کالی ناگن تمہیں ہو۔ تمہیں نے اپنی شیریں کلامی سے اپنی چال بازی سے اپنی جادوگری سے میری سیدھی سادی صوفیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور آخر اسے تباہ کر دیا۔ یہ تمہیں لوگوں کو ترغیب و تحریک کا نتیجہ ہے کہ میرا لڑکا آج نہ جانے کہاں اور کس حالت میں ہے۔ اور میری لڑکی کا یہ حشر ہوا۔ تم نے میرے سارے منصوبے خاک میں ملا دئے۔"

وہ اسی حالتِ غیظ میں نہ جانے اور کیا کیا کہتیں کہ مسٹر جان سیوک اُن کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے کھینچ لے گئے۔ رانی جاہنوی نے ان ناملائم اور اہانت آمیز الفاظ کا کچھ جواب نہ دیا۔ مسز سیوک کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتی

رہیں اور پھر بلا کچھ کہے سُنے وہاں سے اُٹھ کر چلی گئیں۔

مسز سیوک کی تمام خواہشوں پر پالا پڑ گیا۔ اُس روز سے پھر اُنہیں کسی نے گرجا جاتے نہیں دیکھا۔ وہ پھر کبھی سایہ گون اور ہیٹ پہنے ہوئے نہیں دکھائی دیں۔ پھر یورو پین کلب میں نہیں گئیں۔ پھر انگریزی دعوتوں میں شریک نہیں ہوئیں۔ دوسرے دن علی الصباح پادری پیم اور مسٹر کلارک ماتم پُرسی کے لئے آئے۔ مگر مسز سیوک نے دونوں کو وہ پھٹکار سُنائی کہ اپنا سا منہ لے کر واپس گئے۔ خلاصہ یہ کہ اُسی روز سے اُن کی عقل میں فتور آ گیا۔ دماغ اتنی سخت چوٹیں نہ سہ سکا۔ وہ ابھی تک زندہ ہیں۔ مگر زندہ درگور۔ انسانوں کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ کبھی ہنستی ہیں کبھی روتی ہیں کبھی ناچتی ہیں۔ کبھی گاتی ہیں۔ کوئی سامنے جاتا ہے تو دانت نکالے کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔

رہے مسٹر جان سیوک۔ وہ بالوسانہ استقلال کے ساتھ صبح سے شام تک اپنے تاجرانہ مشاغل میں منہمک رہتے ہیں۔ انہیں اب دُنیا میں کوئی خواہش کوئی آرزو نہیں۔ دولت سے اُنہیں بیغرضانہ محبت ہے۔ کچھ وہی محبت جو اولیائے کرام کو خدا سے ہوتی ہے۔ دولت اُن کے لیے کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ خود مقصد ہے۔ نہ دن کو دن سمجھتے ہیں نہ رات کو رات۔ کاروبار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ نفع بھی روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے یا نہیں۔ اس میں شک ہے۔ ملک میں کوچہ کوچہ۔ دوکان دوکان۔ اس کارخانہ کے سگار اور سگریٹوں کی کثرت ہے۔ وہ اب پٹنہ میں ایک تمباکو کا کارخانہ کھولنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کیونکہ صوبہ بہار میں تمباکو بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دولت کی ہوس علم کی ہوس کی طرح آسودہ نہیں ہوتی۔

(۵۰)

کنور صاحب نے سنگھ کی بہادرانہ موت کے بعد رانی جاہنوی کا جوش ڈونا ہو

گیا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی سے کام کرنے لگیں۔ اُن کے روئیں روئیں سے غیر معمولی سرگرمی ظاہر ہونے لگی۔ عالم ضعیفی کی کاہلی شباب کی تیزی میں تبدیل ہوگئی۔ اُنہوں نے کمربستہ ہوکر سیوا سمتی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ رتو اس چھوڑ کر میدانِ عمل میں قدم رکھا اور اتنے جوش سے کام کرنے لگیں کہ سمتی کو جو فروغ کبھی نہ حاصل ہوا تھا وہ اب ہوا۔ روپیہ کبھی اتنا زیادہ نہ تھا اور نہ والنٹیرز کی تعداد ہی کبھی اس قدر کثیر تھی۔ اُن کا خدمتی دائرہ بھی کبھی اتنا وسیع نہ تھا۔ اُن کے پاس جتنی ذاتی دولت تھی۔ وہ سب سمتی کو وقف کردی حتّےٰ کہ اپنے لئے ایک زیور بھی نہ رکھا۔ سنیاسی کا بھیس لے کر دکھا دیا کہ موقع پڑنے پر عورتیں کتنا کام کر سکتی ہیں۔

ڈاکٹر گنگولی کی اُمیدواریاں بھی بالآخر اپنی برہنگی میں ظاہر ہوگئیں۔ اُنہیں معلوم ہوگیا کہ موجودہ حالت میں کوئی اُمید رکھنا اپنے ضمیر کو دھوکا دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ انہوں نے کونسل میں مسٹر کلارک کے خلاف بڑا واویلا مچایا۔ مگر وہ سب نالۂ صحرا ثابت ہوا۔ مہینوں کی بحث اور سوالوں کی بھرمار سب بے سود ہوئی۔ وہ گورنمنٹ کو مسٹر کلارک کی تنبیہ کے لئے مجبور نہ کرسکے۔ اس کے برعکس مسٹر کلارک کے عہدہ میں ترقی ہوگئی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اتنے برانگیختہ ہوئے کہ آپے میں نہ رہ سکے۔ وہیں بھری سبھا میں گورنر کو خوب سخت سست کہا یہاں تک کہ صدر جلسہ نے اُنہیں بیٹھ جانے کو کہا۔ اُس پر وہ اور بھی گرم ہوئے اور صدر صاحب کی بھی خبر لی۔ اس پر صدر نے انہیں کونسل ہاؤس سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اور پولیس سے مدد لینے کی دھمکی دی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا التہاب ابھی فرو نہ ہوا۔ وہ بگڑ کر بولے "آپ حیوانی طاقت سے مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ اسلئے کہ آپ میں جواز و انصاف کی قوت نہیں ہے۔ آج میرے دل سے وہ اعتقاد اٹھ گیا جو گزشتہ چالیس برسوں سے مجھے تھا کہ گورنمنٹ انصاف کی طاقت سے حکومت کرنا چاہتی ہے۔ آج

اس طاقت کی قلعی کھل گئی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹ گیا اور ہم گورنمنٹ کو اُس کی بے حجابانہ اور برہنہ شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ اب ہمیں صاف نظر آرہا ہے کہ صرف ہم کو بیل کر تیل نکالنے کے لئے ہماری ہستی مٹانے کے لئے ہماری تہذیب و انسانیت کا خون کرنے کے لئے ہم کو غیر محدود زمانہ تک چکی کا بیل بنائے رکھنے کے لئے ہم پر حکومت کی جارہی ہے! اب تک جو کوئی مجھ سے ایسی باتیں کرتا تھا تو میں اس سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ بیماریتی۔ ہیومنزم اور لبسمنٹ وغیرہ کی تعریف کر کے اُسے لاجواب کر دینے کی کوشش کرتا تھا مگر اب معلوم ہو گیا کہ مقصد سب کا ایک ہے۔ صرف حصول کے ذرائع میں فرق ہے۔"

وہ زیادہ نہ لکھنے پائے تھے پولیس کا ایک سارجنٹ اُنہیں وہاں سے باہر نکال لے گیا۔ اور ممبر بھی وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پہلے تو لوگوں کو اندیشہ تھا کہ سرکار ڈاکٹر گنگولی پر مقدمہ چلائے گی مگر شاید کارکنان متعلقہ کو اُن کی پیرانہ سالی پر رحم آگیا خصوصاً اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اُسی روز گھر آتے ہی اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔

وہ اُسی دن وہاں سے روانہ ہو گئے اور تیسرے روز کنور بھرت سنگھ سے آملے۔ کنور سنگھ نے کہا۔ تم تو اتنے غصہ ور نہ تھے۔ یہ تمہیں ہو کیا گیا؟

گنگولی۔ ہو کیا گیا۔ وہی ہو گیا جو آج سے چالیس برس قبل ہونا چاہئے تھا۔ اب ہم بھی آپ کا ساتھی ہو گیا۔ اب ہم دونوں سمتی کا کام خوب حوصلہ سے کرے گا۔

کنور۔ نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ مجھ میں وہ جوش نہیں رہا۔ وقت کے ساتھ سب چلا گیا۔ جانھوی البتہ آپ کی مدد کریں گی۔ اگر اب تک کچھ شک تھا تو آپ کے اس

طرح مجھ آنے سے وہ دور ہو گیا کہ سیوا اسمتی سے حاکم اعلیٰ پر ظلم ہی ہوں اور اگر میں اُس سے علیحدہ نہ ہوا تو مجھے اپنی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جب یہ یقین ہے کہ ہماری قسمت میں غلامی ہی لکھی ہوئی ہے۔ . . . .

گنگولی۔ یہ آپ کو کیسے یقین ہوا؟

کنور۔ حالات کو دیکھ کر اور کیا۔ جب یہ یقین ہے کہ ہم ہمیشہ غلام ہی رہیں گے تو میں اپنی جائداد کیوں تلف کروں؟ جائداد بچی رہے گی تو ہم اس معذوری کی حالت میں بھی اپنے غریب بھائیوں کے کچھ کام آسکیں گے۔ اگر وہ بھی نکل گئی تو ہمارے دونوں ہاتھ کٹ جائیں گے۔ ہم رونے والوں کے آنسو بھی نہ پونچھ سکیں گے۔

گنگولی۔ اہا۔ تو کنور صاحب نے سنگھ کی موت بھی آپ کے اس بیڑی کو نہیں توڑ سکا۔ ہم سمجھا تھا۔ اب آپ چھوٹ گیا پر دیکھتا ہے تو وہ بیڑی ویسا ہی آپ کے پیروں میں پڑا ہوا ہے۔ اب آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ ہم کیوں جائداد والوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ تو اپنی جائداد کا غلام ہے۔ وہ کبھی سچائی کا لڑائی نہیں لڑ سکتا۔ جو سپاہی سونے کا اینٹ گردن میں باندھ کر لڑنے چلے وہ کبھی نہیں لڑ سکتا۔ اُس کو تو اپنے اینٹ کا فکر لگا رہے گا۔ جب تک ہم لوگ موہ (حرص) کا تیاگ نہیں کرے گا ہمارا مطلب کبھی نہ پورا ہو گا۔ ابھی تک ہم کو کچھ سک تھا پر وہ بھی مٹ گیا کہ جائداد والا آدمی ہمارا مدد کرنے کے بدلے اُلٹا ہمیں نکسان پہنچائے گا۔ پہلے آپ ترّاس والا تھا اب آپ جائداد والا ہو گیا۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر گنگولی بددلی کے ساتھ وہاں سے اٹھے اور جانھوی کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہیں۔ انہوں نے دیکھتے ہی ہنس کر ان کی تعظیم کی۔ پھر کہا "اب تو آپ بھی میرے رفیق ہو گئے۔ میں جانتی تھی کہ ہم لوگ ایک نہ ایک روز آپ کو ضرور کھینچ لیں گے۔ جی

جنت تو داسی کا جذبہ ہے۔ اُن کے لئے وہاں جگہ نہیں ہے۔ وہاں انہیں کے لئے جگہ ہے جو یا تو خود غرض ہیں یا اپنے کو دھوکا دینے میں مشتاق۔ ابھی یہاں دو ایک روز آرام کیجئے گا نا؟ میں تو آج کی گاڑی سے پنجاب جا رہی ہوں۔"

گنگولی۔ آرام کرنے کا وقت تو اب قریب آگیا ہے۔ اُس کا کیا جلدی ہے؟ تب بہت آرام کرے گا۔ ابھی تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلے گا۔

جاہنوی۔ کیا کروں۔ بیچاری صوفیا نہ ہوئی ورنہ اُس سے بڑی مدد ملتی۔

گنگولی۔ ہم کو تو اُس کا حال وہیں ملا تھا۔ اس کی چندگی اب دُکھ میں کٹتا۔ وہ ختم ہو گیا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ پریم سے نراس ہو کر وہ کبھی سکھی نہیں رہ سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ ستی تھا اور ستی کا یہی دھرم ہے۔ رانی اندو تو آرام سے ہے نا؟

جاہنوی۔ وہ تو مہیندر کمار سے پہلے ہی روٹھ کر چلی آئی تھی۔ اب یہیں رہتی ہے۔ وہ بھی تو میرے ساتھ جا رہی ہے۔ اُس نے اپنی ریاست کے انتظام کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کرنا طے کیا ہے۔ جس کے پریسیڈنٹ آپ ہوں گے۔ اُسے ریاست سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔

اتنے میں اندو آگئی اور ڈاکٹر گنگولی کو دیکھ کر انہیں نمسکار کر کے بولی۔ "آپ خود آگئے۔ میرا تو ارادہ تھا کہ پنجاب جاتے ہوئے آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں۔"

ڈاکٹر گنگولی نے کچھ کھانا کھایا اور شام کے وقت تینوں آدمی یہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کے دلوں میں ایک ہی لگن تھی۔ ایک ہی آگ تھی۔ انہیں ایشور پر پورا بھروسہ تھا۔

کنور بھرت سنگھ اب پھر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پھر وہی سیر و شکار ہے۔ وہی رشتے و تعلقات۔ وہی امید و خوف ہے۔ وہی محدود و ناقص تخیل۔ ان کے مذہبی اعتقاد کی بنیاد اکھڑ گئی ہے۔ اس زندگی کے بعد آن کے لئے نامتناہی فنا اور غیر محدود نیستی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ دُنیا ناپائدار ہے۔ مجھے بھی ناپائدار ہے۔ جب تک زندگی ہے ہنس کھیل کر گزار دو۔ مرنے کے پیچھے کیا ہوگا سو کون جانتا ہے؟ دُنیا سدا اسی طرح رہی اور اسی طرح رہے گی۔ اُس کا انتظام نہ کسی سے ہو سکا ہے نہ ہو سکے گا۔ بڑے بڑے دانا۔ بڑے بڑے فلاسفر۔ بڑے بڑے رشی منی مر گئے اور کوئی یہ بھید نہ جان سکا۔ ہم محض مجبور ہیں اور ہمارا کام فقط جینا ہے۔ حب الوطنی انسانیت۔ خدمت۔ ایثار۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ اب اُن کے مایوس دل کو انہیں خیالات سے تسکین ملتی ہے۔